گوشۂ نورشاہ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

نگراں : بھارت سنگھ منہاس

مدیر : محمد سلیم سالکؔ

معاون مدیر : سلیم ساغرؔ

معاون : محمد اقبال لون

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپیوٹر کمپوزنگ/سرورق : امتیاز شرقی

سال اشاعت :جلد 61 نمبر:6-4

قیمت : 200 روپے

ISSN نمبر : 2277-9833

''شیرازہ'' میں جو تخلیقات / مقالات شائع ہوتے ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی کا کُلاً یا جُزواً اتفاق ضروری نہیں۔ (ادارہ)

● ...... خط و کتابت کا پتہ:

مدیر ''شیرازہ'' اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

سرینگر / جموں

ای میل: sherazaurdu@gmail.com

فہرست

............●●● ....

گفتگو بند نہ ہو!

جموں وکشمیر میں اردو افسانے کی تاریخ لگ بھگ ایک صدی کو محیط ہے۔ اس ایک صدی کے عرصے میں جموں وکشمیر نے بڑے بڑے افسانہ نگار پیدا کئے ہیں لیکن شومئی قسمت اردو دنیا نے ہمارے افسانہ نگاروں کو کبھی وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ مقام دینے کی بات تو دور کی ہے، جب بھی اردو دنیا میں کوئی افسانوی انتخاب ترتیب دیا جاتا ہے تو ہمارے افسانہ نگاروں کو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ جب کہا جاتا ہے جموں وکشمیر نے بڑے افسانہ نگار کبھی پیدا ہی نہیں کیے۔ اس طرح کی جملہ بازیاں ایک بے تکی تقریر کا حصہ تو ہوسکتی ہیں لیکن تحقیقی وتنقیدی معاملے میں یہ بے معنی جملے اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔ جب پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، ٹھاکر پونچھی، پشکر ناتھ، عمر مجید اور نورشاہ جیسے منجھے ہوئے افسانہ نگاروں کے افسانے زیر مطالعہ رہتے ہیں تو یقین نہیں آتا کہ یہ لوگ نظر انداز کئے جاسکتے ہیں۔ بہر حال اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے پیش رووں کی تخلیقات کا عمیق مطالعہ کریں اور ان کی ادبی خدمات کو اجاگر کرنے کے لئے کمر بستہ ہوجائیں۔ اسی مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے اکادمی کے ذمہ داروں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ شیرازہ میں شامل مواد ترتیب دیتے وقت اپنے پیش رووں کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا جائے اور ان کی تخلیقات کو منصۂ شہود پر لایا جاسکے۔

اس سلسلے میں پیش رفت کرتے ہوئے آج ہم جموں وکشمیر کے نہایت ہی معتبر و ممتاز افسانہ نگار جناب نورشاہ کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے شیرازہ کا ایک گوشہ نورشاہ کے نام وقف کرتے ہیں۔

نورشاہ صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کا تخلیقی سفر قریباً 65 برسوں تک پھیلا ہوا ہے جہاں

وہ اپنے تخلیقی سوتوں کی بازیافت کرتے ہوئے رومانیت سے فیض یاب ہوتے رہے وہیں انہوں نے حقیقت نگاری کا دامن بھی کبھی نہیں چھوڑا۔شاہ صاحب کی تخلیقات اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ انہوں نے زمانے کے سرد وگرم حالات کا بطور چشم دید گواہ مشاہدہ کرکے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو خوب صیقل کرتے ہوئے سینکڑوں افسانے لکھے، درجنوں ڈرامے تخلیق کیئے اور کئی ناول تحریر کیئے۔اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے معاصرین تخلیق کاروں کی ادبی خدمات کو موضوع بحث بنا کر کئی سالوں تک ادبی کالم نویسی کی آبیاری بھی کرتے رہے، ساتھ ہی جموں وکشمیر کی نئی نسل کی رہنمائی بھی کرتے رہے۔اس میں دورائیں نہیں کی نورشاہ کی ادبی خدمات کا جائزہ لینا ایک گوشے میں ممکن نہیں لیکن پھر بھی ہم نے ایک ادنیٰ کوشش کرتے ہوئے شاہ صاحب کے کئی اہم پہلوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے، امید ہے کہ قارئین پسند فرمائیں گے۔

اس شمارے میں گوشہ نورشاہ کے علاوہ دیگر سوغاتیں بھی شامل ہیں جن میں ڈاکٹر عرفان عالم کا سفر نامہ ''داستانِ گلستان''، اشرف عال کا ڈراما ''ڈھلتے سائے'' اور اردو افسانے کے حوالے سے ایک اہم مذاکرہ ''اردو افسانہ: منظر و پس منظر'' قابل ذکر ہیں۔یہ شمارہ ترتیب دینے میں شیرازہ سے وابستہ ادارتی عملہ کے اراکین سلیم ساغر، محمد اقبال لون اور امتیاز شرقی نے بڑی جانفشانی سے مواد کی چھان پھٹک کرکے ایک معیاری شمارہ کی ترتیب میں ایک اہم رول ادا کیا۔امید ہے قارئین شمارے کے بارے میں اپنے تاثرات سے ضرور نوازیں گے۔

محمد سلیم سالکؔ

● ...... ڈاکٹر محمد اقبال لون

نور شاہ: ماہ و سال کے آئینے میں

اصلی نام : نور محمد شاہ

قلمی نام : نور شاہ

پیدائش : ڈلگیٹ درگہ جن سرینگر کشمیر ،۹/جولائی ۱۹۳۶ء

تعلیم : بی۔اے

شادی:

گھر جنت : شہزادی شاہ

اولادیں : نکہت ، ندیم ، سمی

ملازمت (اہم سرکاری عہدہ جات)

۱۔ ڈپٹی کمشنر (سینٹرل) محکمۂ زراعت و دیہی ترقی (سول سیکرٹریٹ) جموں و کشمیر

۲۔ ڈائریکٹر محکمہ دیہی ترقی (صوبۂ کشمیر)

۲۔ ڈائریکٹر محکمہ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (جموں و کشمیر)

اُردو کے علمی و ادبی اداروں سے وابستگی:

۱۔ جموں و کشمیر رائٹرس ایسوسی ایشن

۲۔ ادارہ فن و ادب (زیر قیادت مرحوم سید قیصر قلندر)

۳۔ جواہر ڈرامیٹک کلب

۴۔ صدر اردو اکادمی جموں و کشمیر (رجسٹرڈ)

۵۔ مدیر سہ ماہی اردو اکادمی (اردو اکادمی جموں وکشمیر کی اشاعت)

۶۔ ممبر کارڈنیشن کمیٹی (اردو) کشمیر یونیورسٹی

۷۔ ممبر کارڈنیشن کمیٹی سٹیٹ بورڈ آف ایجوکیشن

۸۔ سرپرست۔ سہ ماہی شب تاب کشمیر

۹۔ ممبر کارڈنیشن کمیٹی۔ ادبی مرکز کمراز اور اردو اکادمی جموں وکشمیر

۱۰۔ ممبر اکزی کیٹو کمیٹی عالمی اردو ٹرسٹ دلی (کشمیر باب)

۱۱۔ رکن مجلس ادارت سہ ماہی نگینہ انٹرنیشنل سرینگر

۱۲۔ رکن جموں وکشمیر فکشن رائٹرز گلڈ

۱۳۔ رکن اِکزی کیٹو کمیٹی کشمیر کلچرل کانفرنس

ادارت:

۱۔ مدیر ماہنامہ دیہات سدھار

۲۔ کواڈینٹر سائنس نیوز

۳۔ کواڈینٹر پاپولر نیوز ‏ ‏ ‏ ‏ دوران گورنمنٹ سروس

۴۔ اکزی کٹیو ایڈیٹر ہفت روزہ آزادی۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش کے بعد۔ ایک

۵۔ مدیر اعزازی۔ ماہنامہ تریاق ممبئی (جموں وکشمیر نمبر)

انعام واعزازات:

۱۔ افسانوی مجموعے ویرانے کے پھول کے لئے وزیر اعلیٰ مرحوم غلام محمد صادق کا بیسٹ بک ایوارڈ

۲۔ ہر مکھ لٹریری ایوارڈ ۲۰۰۷ء

۳۔ جموں وکشمیر اردو اکادمی ایوارڈ ۲۰۰۸ء

۴۔ وفا فاؤنڈیشن ایوارڈ ۲۰۱۰ء

۵۔ ڈاکٹر برج پریمی لٹریری ایوارڈ ۲۰۱۰ء

۶۔ ڈاکٹر سی۔ ایل گپتا لٹریری ایوارڈ (ادبی کنج جموں) ۲۰۱۱ء

۷۔ کشمیر ثقافتی ایوارڈ حکومت جموں و کشمیر زیر اہتمام پاکستان ۱۱-۲۰۱۰ء

۸۔ اردو فاؤنڈیشن ممبئی ایوارڈ برائے افسانہ ۲۰۱۲ء

۹۔ ریڈیو کشمیر سوم ناتھ سادھو ایوراڈ برائے ڈرامہ ۲۰۱۳ء

۱۰۔ بخشی میموریل ایوارڈ برائے فروغ اردو زبان و ادب ۲۰۱۴ء

۱۱۔ سندِ افتخار برائے خدمات اردو ادب (ہوٹل شہنشاہ) ۲۰۱۴ء

۱۲۔ وحشی سید یادگار محبت ایوارڈ۔ ادارہ تحریک ادب بنارس ۲۰۱۴ء

۱۳۔ کشمیر سپورٹس رجسٹرڈ کشمیر۔ ایوارڈ برائے کالم نویسی ۲۰۱۴ء

۱۴۔ کرشن چندر ایوارڈ برائے افسانہ۔ جموں و کشمیر فکشن رائٹرز گلڈ ۲۰۱۵ء

۱۵۔ سارا و محمد عبداللہ ترنبو ایوارڈ برائے افسانہ نگاری ۲۰۱۵ء

ادبی شروعات:

۱۔ پہلی کہانی............گلاب کا پھول (ماہنامہ بیسویں صدی، دلی)

۲۔ پہلا ریڈیو ڈرامہ.........دل کی روشنی (ریڈیو کشمیر سرینگر)

تصانیف:

افسانوی مجموعے

۱۔ بے گھاٹ کی ناؤ (۱۹۶۰ء) ۲۔ ویرانے کے پھول

۳۔ ایک رات کی ملکہ (۱۹۶۴ء) ۴۔ من کا آنگن اُداس اُداس (۱۹۶۵ء)

۵۔ گیلے پتھروں کی مہک (۱۹۸۲ء) ۶۔ بے ثمر سچ (۲۰۰۵ء)

۷۔ آسمان پھول اور لہو (۲۰۰۹ء) ۸۔ ایک معمولی آدمی (۲۰۱۷ء)

۹۔ لفظ لفظ داستان (۲۰۲۰ء)

ناول/ ناولٹ:

۱۔ نیلی جھیل کالے سائے (۱۹۶۱ء) ۲۔ پائل کے زخم (۱۹۶۳ء

۳۔ لمحے اور زنجیریں (۱۹۶۵ء) ۴۔ آؤ سو جائیں (۱۹۷۱ء۔ناولٹ نمبر شاعر)

۵۔ آدمی رات کا سورج (۲۰۰۸ء)

دیگر تصانیف:

۱۔ انتخاب اردو ادب ریاست جموں و کشمیر (۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء) (۷۴۔۱۹۷۳ء)

۲۔ بند کمرے کی کھڑکی (ڈائری کے اوراق پر مشتمل یادیں) ۲۰۰۷ء

۳۔ نورشاہ کے تین ناولٹ (مرتب روف راحت) ۲۰۰۹ء

۴۔ کہاں گئے یہ لوگ (ادبی خاکے) ۲۰۰۹ء

۵۔ ریاست جموں و کشمیر کے اُردو افسانہ نگار (فن، شخصیت اور مکالمہ) ۲۰۱۱ء

۶۔ کشمیر نامہ (مرحوم عمر مجید کے اخباری تخلیقات کا انتخاب۔ مرتب نورشاہ۔ جاوید ماٹجی ۲۰۱۲ء

۷۔کشمیر کہانی (اانتخاب) (۲۰۱۴ء)

۸۔کیسا ہے یہ جنون (افسانے، افسانچے، ڈرامے، فیچر، سیلاب کہانیاں اور ترجمے) ۲۰۱۵ء

۹۔بشیر شاہ: یادوں کا سفر (مرتب) ۲۰۲۱

نورشاہ کی تخلیقات کا کشمیری ترجمہ:

۱۔ہن ہن دگ (نورشاہ کے ۳۴ افسانوں کا کشمیری ترجمہ) مترجم: رشید کانسپوری

۲۔ بے بژھ پزر: نورشاہ کے ۲۱ افسانوں کا کشمیری ترجمہ) مترجم: پیارے ہتاش

ریڈیو ڈرامے:

ستر سے زائد۔ ان میں سے اکثر ڈرامے ریڈیو کشمیری اور ریڈیو جموں سے نشر ہوئے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ بچوں کے لئے لکھے گئے ڈرامے ان سے الگ ہیں جو کشمیر ہوئے اور اکثر مختلف جرائد میں شائع میں ہوئے۔

گیتوں بھری کہانیاں:

۱۔ کمرشل براڈ کاسٹنگ سروس سرینگر کے لئے اب تک تیس سے زائد گیتوں بھری کہانیاں قلم بند کی ہیں جو نشر بھی ہوئیں۔

۲۔ کمرشل براڈ کاسٹنگ سروس سرینگر کے لئے کچھ یادیں کچھ باتیں کے عنوان سے فلمی اور غیر فلمی شخصیات کے تعلق سے ہفت روزہ پروگرام کے لئے قلمی معاونت۔

ٹی۔وی سیریل

۱۔ دردکا رشتہ (۱۳ کڑیاں) ۲۔ گل اور بلبل (۱۳ کڑیاں

۲۔ سکھ کا سپنا ۱۳ کڑیاں) ۴۔ نیلم (۱۳ کڑیاں)

۵۔ زندگی کا سفر (ٹیلی فلم)

۷۔ کشمیر میں اردو (دستاویزی فیچر۔۳۰ فٹ کے لئے)

۸۔ جموں وکشمیر شمسی توانائی (۴ قسطیں پرسار بھارتی کے لئے

۹۔ گل۔رات کا سورج نامی کہانی پر مبنی ٹیلی فلم

تحقیق وتنقید

۱۔افسانوی مجموعہ گیلے پتھروں کی مہک۔امتیاز علی (جموں یونیورسٹی زیر نگرانی پروفیسر ظہور الدین)

۲۔ نورشاہ اور اس کے افسانے۔سدلیش کمار (جموں یونیورسٹی زیر نگرانی پروفیسر شہاب عنایت ملک)

۳۔ نورشاہ کی ناول نگاری۔نزاکت حسین (جموں یونیورسٹی زیر نگرانی پروفیسر ریاض احمد

۴۔ آسمان پھول اور لہو۔تنقیدی جائزہ۔سمیر احمد (مولانا آزاد یونیورسٹی حیدر آبار زیر نگرانی ڈاکٹر مسرت جہاں)

۵۔ نورشاہ کی ادبی خدمات۔اشفاق احمد برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال

۶۔ نورشاہ کی افسانہ نگاری۔شیراز احمد (برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال)

۷۔ کشمیر میں اردو نورشاہ کے خصوصی مطالعے کے پس منظر میں۔فاروق احمد وانی (دیوی اہلیہ یونیورسٹی اندور۔زیر نگرانی پروفیسر مختار شمیم)

۸۔ جموں وکشمیر کے فکشن نگاروں میں نورشاہ کا مقام۔رتیش کمار (جموں یونیورسٹی زیر نگرانی پروفیسر سکھ چین سنگھ)

............●●●............

● ...... نور شاہ

میرا تخلیقی سفر

میں جہاں پیدا ہوا وہ میری سوچ میں افسانوں اور کہانیوں کی بستی ہے۔ یہ بستی کوہ سلیمان کے دامن اور ڈل جھیل کے کنارے آباد ہے اور سیاحتی اعتبار سے اپنی سندرتا، خوبصورتی اور دلکشی کے لئے سیاحتی نقشے پر ایک اہم اور بلند مقام بنا چکی ہے۔ شکاروں سے ہاوس بوٹوں تک، رنگ برنگ پھولوں کے باغات سے برف پوش پہاڑوں تک میری بستی کی اپنی منفرد سی شان ہے، یہاں حیرت اور تجسس کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہر موسم میں قائم ودائم رہتا ہے۔ اس بستی نے اَن گنت موسیقاروں، شاعروں، قلم کاروں، ادیبوں، صحافیوں، ڈاکٹروں، انجینئروں اور صنعت کاروں کو جنم دیا ہے۔ یہ شخصیات اپنی صلاحیتوں کے پس منظر میں ہماری تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی پس منظر میں بھی یہ بستی کسی طور نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

میں درگہ جن ڈلگیٹ کی بات کر رہا ہوں...... شہر سری نگر کی ایک بے حد رومانی بستی ...... میرے خوابوں کی بستی اور میں اِسی بستی کا مکین ہوں!!

اِس بستی کی ایک اندرونی سڑک کے آس پاس اب بھی ہمارا مکان کھڑا ہے...... ''شاہ منزل'' حالانکہ اب ہم اس گھر میں نہیں رہتے۔ ہمارا یہ گھر میرے والدین، میں اور میرے تین چھوٹے بھائیوں کے علاوہ میری دو چھوٹی بہنوں پر مشتمل تھا۔ ہمارے والد، جواب حیات نہیں، کا ایک چھوٹا سا بزنس تھا لیکن ابتدائی دِنوں سے ہی اُنہیں ہماری پڑھائی کی فکر لگی رہتی تھی۔ چونکہ ہمارا ابتدائی سکول بھی گھر سے زیادہ دور نہ تھا اس لئے ہمارے والد محترم اکثر سکول آتے اور اساتذہ سے ہماری پڑھائی کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔ ہماری والدہ بھی اب

حیات نہیں لیکن اس زمانے میں اُنہوں نے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ آسانی سے اُردو لکھ پڑھ سکتی تھیں۔ شاید اسی لئے اُردو کے اخبار روز ہمارے گھر میں پڑھنے کے لئے ملتے تھے۔ اُن دنوں میں اسلامیہ مڈل سکول درگہ جن کا طالب علم تھا۔ میں روز اخباروں کی سرخیاں اپنی کاپی پر اُتار کر اسکول میں ایک بڑے سائز کے بلیک بورڈ پر لکھتا تھا۔ اسی وجہ سے سکولی کتابوں کے علاوہ اردو پڑھنے لکھنے کے تعلق سے اخبارات بھی ایک ذریعہ بن گئے۔

میرے بھائی اگرچہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے لیکن بعد میں، رفتہ رفتہ، اُردو زبان سے اُن کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مرحوم محی الدین شاہ اور مرحوم بشیر شاہ بھی افسانوں اور افسانوی دنیا سے دور نہ رہ سکے۔ مرحوم بشیر شاہ اُردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد ریڈیو کشمیر میں بحثیت اُردو سکرپٹ رائٹر تعینات ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد ہی اپنی بہتر کارکردگی کی وجہ سے ترقی پاتے گئے۔ مرحوم محی الدین شاہ، جو مجھ سے چھوٹے اور مرحوم بشیر شاہ سے بڑے تھے، بنیادی طور پر ایک انجینئر تھے اور بعد میں سول سروس میں آگئے۔ اُن کا افسانوی مجموعہ ''پھول اور آویزے'' (آغا ظفر احمد کے ساتھ مل کر) ۱۹۶۳ء میں منظر عام پر آیا۔ ٹھیک اِسی طرح مرحوم بشیر شاہ کا افسانوی مجموعہ ''شب کے سمندر میں'' ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ اُن کی ادبی سرگرمیاں صرف افسانوں تک محدود نہ تھیں۔ اُن کی ادبی سرگرمیوں کا مفصل تذکرہ میں نے اُن کے تعلق سے مرتب کی گئی کتاب ''یادوں کا میکدہ'' کے پیش لفظ میں کیا ہے۔ چھوٹے بھائی ڈاکٹر حسین شاہ بھی قلم کار ہیں لیکن اُن کی تحریریں زراعت یا گالف سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہماری دو نوں بہنیں اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں!

اکثر اپنے ذہن کی کھڑکی کھول کر اپنے ماضی میں جھانکتا ہوں۔ میرا ماضی ان گنت یادوں سے بھرا پڑا ہے۔ مٹھاس، کڑواہٹ اور تلخیوں سے بھرپور یادیں، محبت کی دولت سے مالا مال یادیں، جلن، نفرت اور خود غرضی کے پس منظر میں بھوکی اور پیاسی یادیں، علمی اور ادبی سفر کی راہ میں بکھیرتی یادیں، بہت ساری سندر سندر سی گلابی مہک سے بھرپور یادیں اور کانٹوں کے بوجھ سے جھکی جھکی بے ثمر یادیں، بچپن اور لڑکپن کی یادیں، جوانی اور نوجوانی کی یادیں، تعلیمی زندگی سے وابستہ یادیں، ملازمت کی تلخ شیریں یادیں، حاکمانہ اور محکومانہ یادیں، لامکانی کے حدود میں کبھی خود کو پانے اور کبھی خود کو کھونے کی یادیں، کشمیر کے پر آشوب دور کی یادیں، علم و

ادب اور خاص طور سے افسانوی ادب سے وابستہ گزشتہ پچاس برسوں سے زائد عرصے کی ڈھکی چھپی، چھوٹی بڑی، کامیاب اور ناکامیاب یادیں۔ میری اِن یادوں کی داستان بہت طویل ہے، اس داستان کے ایک ایک لفظ، ایک ایک ورق پر میری نظریں ٹھہری سی گئی ہیں اور میں اپنے ذہن کے کنواس پر اپنی پہلی تحریر یا اپنے تخلیقی سفر کی پہلی تصویر دیکھ رہا ہوں۔

میری پہلی تحریر اُس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ یہ ایس پی ہائی اسکول کے دنوں کی بات ہے۔ اپنی اسکولی زندگی کی پہلی تحریر کو میں نے اسکولی کاپی پر قلم بند کیا۔ یہ ایک ڈراما تھا کاپی کے دس صفحات پر پھیلا ہوا۔ اِس ڈرامے میں صرف تین کردار تھے ۔ایک نوکر، ایک عورت اور ایک سُنار۔ آپ کو جان کر حیرانی ہوگی کہ میری پہلی تحریر اردو میں نہیں بلکہ کشمیری میں تھی۔ ہمارے گھر میں لکھنے پڑھنے کا ماحول تھا اور اس ماحول کو پَروان چڑھانے میں میری والدہ محترمہ کا ہاتھ تھا۔ اُنہوں نے میری پہلی تحریر دیکھتے ہی لون صاحب سے ملنے کا مشورہ دیا۔ جی ہاں میں مرحوم علی محمد لون کی بات کر رہا ہوں جن کے اور ہمارے گھر کے درمیان دس پندرہ فٹ گلی کا فاصلہ تھا۔ میں لون صاحب کے ہاں گیا اور اپنی کاپی اُن کو دے آیا۔ دوسرے تیسرے دن وہ اپنے ایک ہاتھ میں سگریٹ تھامے اور دوسرے ہاتھ میں میری کاپی پکڑے ہمارے یہاں آئے اور کہا کہ اب یہ ڈراما اردو میں لکھو۔ میں نے کاپی لینے کی کوشش کی تو انہوں نے دینے سے انکار کیا اور کہا...... ''مجھے ترجمہ نہیں چاہیئے یہ ڈراما اردو میں اپنی یادداشت کے سہارے لکھو لیکن جلد بازی سے نہیں'' میں نے تین کرداروں والی کہانی کو اردو میں ڈرامائی روپ دیا اور لون صاحب کو دے آیا۔ روز و شب گزر گئے۔ نہ لون صاحب نے کچھ کہا اور نہ ہی میں نے پوچھنے کی جرأت کی لیکن ایک دن صبح ہی ہمارے گھر آ گئے اور نمکین چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''دیکھو نور لکھنے کے لئے پڑھنا ضروری ہے اور پڑھنے کے لئے کتابوں کا ہونا ضروری ہے، میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا اور......!

اور کہا..........

''تم کشمیری میں نہیں اردو میں لکھنے کی کوشش کرو۔''

اور پھر میں نے اُردو زبان میں لکھنا شروع کیا اور آج تک میں اُردو میں ہی لکھتا آ رہا ہوں حالانکہ مجھے اِس بات کا بھرپور احساس ہے کہ کشمیری میری مادری زبان، میری شناخت ہے اور مجھے اپنی پہلی کشمیری تحریر پر فخر ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں نے کئی کشمیری افسانوں کو اردو کا روپ دیا ہے اور دے بھی رہا ہوں۔ اِن میں سے کئی کہانیوں کے ترجمے رسائل و جرائد کی زینت بھی بنے ہیں۔

تعلیمی مجاز پر آگے بڑھتا رہا اور اسی طرح لکھنے پڑھنے کے شوق و ذوق کو بڑھاوا ملتا رہا۔ مختلف ادیبوں کے افسانے، ناول اور دوسری تخلیقات پڑھنے میں میری دلچسپی بڑھتی رہی۔ ان ادیبوں میں ابن صفی بھی شامل تھے۔ اے۔ حمید کے رومانی افسانے پڑھتے وقت عجیب سی خوشی محسوس ہوتی۔ ابراہیم جلیس کی تحریریں بھی دلچسپی سے پڑھتا تھا اور آہستہ آہستہ میرے لکھنے پڑھنے کے شوق و ذوق میں اضافہ ہوتا گیا۔ البتہ ترجیحات بدلتی رہیں، ترجیحات کے ساتھ کتابیں بھی بدلتی رہیں، قلم کار بھی بدلتے رہے، پڑھنے لکھنے کے انداز بھی بدلتے رہے۔ تھوڑے سے مطالعے اور اچھے خاصے مشاہدے کی بنا پر جب محسوس کیا کہ میں کہانیاں خود بھی لکھ سکتا ہوں تو ایک کہانی اردو دنیا کے نامور مدیر آنجہانی، خوشتر گرامی کے نام ارسال کی۔ بہت دنوں کے بعد جواب پڑھ کر مایوسی ہوئی...... ''آپ کی کہانی ہمارے معیار پر پوری نہیں اُترتی......'' کہانی بھی واپس مل گئی۔ کچھ مدت بعد میں نے کہانی کا عنوان بدلا۔ شروعات اور اختتام پر ذرا سی تبدیلی کے بعد دوبارہ خوشتر صاحب کو ارسال کی لیکن ایک اور تبدیلی کے ساتھ۔ کہانی کار نورشاہ اپنا رنگ و روپ بدل کر شاہدہ شیرین بن گیا تھا اور اس طرح اپنا نام بدل کر اور خاتون افسانہ نگار کا روپ اپنا کر میری پہلی کہانی ''گلاب کا پھول'' کے عنوان سے اس زمانے کے معروف ترین جریدہ ماہنامہ ''بیسویں صدی'' (دسمبر ۱۹۵۹ء) میں شائع ہوئی۔ پہلی کہانی سے کشمیر کی شاہدہ شرین کا نام مہک اُٹھا، کہانی اچھی تھی یا کہانی کار کا نام...... یہ فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ پھر اسی نام سے بیسویں صدی میں ایک اور کہانی ''بن برسے بادل'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ماہنامہ ''شمع''، بھی اپنے عروج پر تھا۔ ''تلخی'' کے عنوان سے شاہدہ شرین کا مختصر افسانہ شائع ہوا۔

خطوط آنے شروع ہوئے اور کتابوں کی صورت میں تحائف بھی آنے لگے۔ اس تعلق سے شاہدہ شرین کو جو پہلا طویل خط ملا وہ آنجہانی ٹھاکر پونچھی کا تھا۔ اس کا ذکر انہوں نے میرے اوّلین افسانوی مجموعہ ''بے گھاٹ کی ناؤ'' کے پیش لفظ میں بھی کیا ہے (سال اشاعت ۱۹۶۲ء)۔ میری یادوں سے ایک اور بھولی بسری یاد میرے ذہن کے نہاں خانوں سے باہر آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں ریگل سنیما کے سامنے کھڑا تھا۔ دوسری جانب سے مرحوم پروفیسر شکیل الرحمان اور مرحوم پروفیسر حامدی کاشمیری آرہے تھے۔ میں نے ہاتھ ہلایا اور اُنہوں نے ہاتھ ہلا کر وہیں رُکنے کا اشارہ کیا۔ دونوں سڑک پار کر کے میری جانب تشریف لائے۔ ہاتھ ملانے کے بعد حامدی صاحب نے شکیل صاحب سے کہا..... ''آپ نے تو کہا تھا کہ شاہدہ شرین سے ملاؤں گا۔''

''ہاں ہاں کہا تھا اور میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ پہلے نور شاہ سے اس کی خیر خیریت پوچھتے ہیں۔''

''خیر خیریت کی بات بھی ہوگی۔'' حامدی صاحب نے پھر اپنی بات دہرائی۔

''ارے حامدی اتنی جلدی کیا ہے، تم تو شاہدہ شرین سے ہی بات کر رہے ہو۔'' حامدی صاحب میری طرف دیکھتے رہے اور پھر بھرپور قہقہہ لگا کر مجھے گلے لگا گیا۔ یہ زنانہ مردانہ ناموں کی جانکاری شکیل صاحب کو چند روز قبل ہی دلی میں بیسویں صدی کے دفتر میں ملی تھی۔

ان ہی دنوں ویدراہی ''یوجنا'' ہندی کے مدیر تھے۔ اُنہوں نے میری کہانی ''بن برسے بادل'' کا ہندی روپ میری تصویر کے ساتھ یوجنا میں شائع کیا اور پھر شاہدہ شرین نے نور شاہ کا روپ اپنا لیا۔ شاہدہ شرین کے نام آئے ہوئے اَن گنت خطوط کو میں ایک کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتا تھا لیکن مرحوم لون صاحب نے ایسا کرنے سے منع کیا۔ حال ہی میں اپنی ذاتی لائبریری میں مرحوم عابد مناوری کے شعری مجموعے تلاش کر رہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر ژواگو نامی ناول کا اُردو ترجمہ ملا۔ چھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ یوسف صدیقی نے کیا ہے، میں یہ بات اس لئے دہرا رہا ہوں کہ شاہدہ شرین کے لئے یہ کتاب حفیظ الکبیر صاحب نے اپنے دستخط

کے ساتھ بطور تحفہ جنوری ۱۹۶۲ء ممبئی سے بھجوائی تھی۔ کبیر صاحب نے اِس کے ایک ورق پر جو محبت اور پیار بھرے الفاظ لکھیں ہیں وہ مجھ تک ہی رہنے دیجئے۔ ویسے بھی اُن کے خطوط شاہدہ شرین کے نام آتے رہتے تھے۔ البتہ میں یہ نہیں جانتا کہ اگر کبھی اُنہوں نے شاہدہ کو نور بننے کے تعلق سے سنا ہوگا تو اُن پر کیا بیتی ہوگی۔

اب میں نورشاہ کے نام سے مختلف رسائل میں شائع ہونے لگا اور اس طرح تخلیقی سفر پر چلتے چلتے مجھے ایک پہچان سی ملنے لگی۔

مجھے اس بات کا فخر ہے اور شاید یہ میری خوش نصیبی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ملک اور بیرون ملک کے بہت سارے رسائل اور جرائد میں پچاس برسوں سے میری کہانیاں تواتر کے ساتھ شائع ہورہی ہیں اور مجموعی طور پر پسند بھی کی جاتی ہیں۔

اپنے تخلیقی سفر کے آغاز میں رومانی کہانیاں لکھیں۔ کہانیوں کے کردار و واقعات رومانی تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بچپن، لڑکپن اور جوانی ڈل جھیل کے رومانی کنارے اور کوہِ سلیمان کے رومانی دامن میں بیتا ہے۔ دور حد نظر تک برفیلی چوٹیوں، سبز نیلا پانی، رنگ برنگ کے پھولوں کی خوشبو اور دوسرے مناظر میرے ذہن میں بسیرا کئے ہوئے تھے۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میری اپنی سوچیں رومانی تھیں (اور شاید آج بھی)۔ آپ کو یہ بھی بتادوں کہ رومان کے پس منظر میں لکھے گئے میرے افسانے آج بھی بہت سارے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں، آج بھی جب کبھی بیرونِ ریاست سے آئے ہوئے قلم کار یہاں کی ادبی نشستوں میں شرکت کرتے ہیں تو ضرور میری رومانی کہانیوں کا ذکر چھیڑتے ہیں اور اپنی پسندیدگی کا اِظہار بھی کرتے ہیں۔ ایک بار بارہمولہ (کشمیر) کی ادبی نشست میں عصمت چغتائی سے کسی نے کشمیر کے کہانی کاروں کے تعلق سے کچھ جاننے کی کوشش کی تو اُنہوں نے جواب میں کہا تھا۔ ''میں نورشاہ کو پڑھتی ہوں۔'' ٹھیک اسی طرح جب کرشن چندر سے کشمیر کے تعلق سے کچھ جاننا چاہا تو اُنہوں نے کہا تھا۔ ''میں نے کشمیر کو پوری طرح سے دیکھا ہی کہاں ہے۔ میں نے کشمیر کو حامدی کاشمیری اور نورشاہ کی کہانیوں میں دیکھا ہے۔''

۱۹۶۲ء میں میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''بے گھاٹ کی ناؤ'' شائع ہوا۔اس کا پیش لفظ آنجہانی ٹھاکر پونچھی نے قلم بند کیا ہے۔

جب میں نے ادبی دنیا میں قدم رکھا تو ترقی پسند ادیبوں کا اثر بہت حد تک باقی تھا ۔ادھر ان دنوں اُردو ادب کے دروازے پر جدیدیت کی جادوگرنی بھی دستک دے رہی تھی۔ ترقی پسند ادب سے میں نے کوئی شئے شعوری یا غیر شعوری طور پر اگر اپنالی ہے تو وہ بے انصافی اور استحصال کے خلاف بات کرنے کا حوصلہ۔ جدید ادب کے تکنیکی اور ہیئتی تجربوں سے بھی میں نے کچھ نہ کچھ اثر قبول کیا ہے۔ مجھے شور سے پہلے بھی وحشت ہوتی تھی اور اب بھی ہو رہی ہے۔ میر اخیال ہے کہ دھیمی آواز میں لہجے کو زیادہ یقین کے ساتھ برتا جاتا ہے۔ یہ نرم نرم لہجہ تو میری کہانیوں کے کرداروں میں نظر آتا ہے۔ ویسے بھی مجھے سرگوشیوں میں بات کرنا اچھا لگتا ہے۔ میں ہمیشہ محسوس کرتا ہوں کہ میری کہانیوں اور ناولوں کے کردار میرے بہت قریب رہتے ہیں اور میں ان کرداروں سے گھل مل جاتا ہوں۔اسی لئے دھیمی آواز میں بات کرنے کا قائل ہوں۔

اسی دور میں پشکر ناتھ نے بھی بیسوی صدی سے ہی اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا۔وہ مجھ سے پہلے ہی بیسویں صدی میں شائع ہوتے تھے۔ اُن سے میری ملاقاتیں باقاعدگی کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ہماری دوستی کے نتیجے میں ہماری کوشش رہتی تھی کہ ہم دونوں کی کہانیاں مختلف رسائل میں ایک ساتھ شائع ہوں اور اکثر ہوا بھی ہے۔ کچھ معروف جریدوں میں کسی زمانے میں حامدی کاشمیری، پشکر ناتھ اور نور شاہ شائع ہوتے تھے۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ لکھنو سے مرحوم عابد سہیل ''کتاب'' نامی رسالہ شائع کرتے تھے۔ایک بار تو پشکر ناتھ کی کہانی میرے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس بات پر پشکر ناتھ نے کہا تھا۔ ''رہنے دو میرے پیارے کیا فرق پڑتا ہے۔''...... لیکن میں نے ایک خط لکھ کر اس کی وضاحت کی تھی۔ یہاں میں، یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس زمانے میں قلم کاروں کے آپسی رشتے قدرِ نزدیک اور قریبی ہوتے تھے۔آج کے مقابلے؟!

رسالہ ''کتاب'' کے تعلق سے میری یادوں کی کتاب سے ایک اور ورق میرے سامنے بکھیرنے لگا ہے۔ حالانکہ اس کا ذکر بعد میں آنا تھا لیکن میں معافی چاہتا ہوں اگر آپ کو

میرے تخلیقی سفر میں پہلے کی بات بعد میں اور بعد کی بات پہلے نظر آئے۔۔

۱۹۷۲ء میں ماہنامہ ''کتاب'' کا افسانہ نمبر شائع ہوا تھا، اس افسانہ نمبر کی اشاعت سے پہلے ''کتاب'' کے چند شماروں میں ایک سوالنامہ شائع کیا گیا تھا۔ یہ سوالنامہ چھ سوالوں پر مشتمل تھا۔ ان میں ایک سوال یوں تھا۔

''اگر آپ کو ایک ساتھ دس افسانوی مجموعے خریدنے ہوں تو آپ کن افسانہ نگاروں کے مجموعے خریدیں گے؟

اس سروے میں ۲۸۹ قارئین نے حصہ لیا تھا۔ اس سوال کا جواب افسانہ نگار کی مقبولیت کی جانب ایک واضح اشارہ تھا۔ سروے کے مطابق کرشن چندر کا نام سرِ فہرست تھا۔ باقی تفصیل یوں ہے۔ (۲۴۷)

سعادت حسن منٹو	۱۲۶	خواجہ احمد عباس	۹۱	احمد ندیم قاسمی	۱۰۱
پریم چند	۶۱	بلونت سنگھ	۵۸	علی عباسی حسینی	۶۵
رضیہ سجاد ظہیر	۴۱	واجدہ تبسم	۵۶	قاضی عبدالستار	۵۲
جوگندر پال	۵۷	جیلانی بانو	۹۲	رتن سنگھ	۵۷
کوثر چاندپوری	۷۹	اقبال متین	۵۹	شفیق الرحمان	۲۲
اے حمید	۲۸	عابد سہیل	۲۳	ممتاز مفتی	۱۱
الیاس احمد گدی	۱۹	غلام عباس	۲۹	انور عظیم	۳۵
سہیل عظیم آبادی	۲۳	سریندر پرکاش	۲۴	حاجرہ مسرور	۴۲
نورشاہ	۱۸	مظفر حنفی	۲۴	عوض سعید	۱۱
ستیش بترہ	۲۸	ابراہیم جلیس	۱۷	کشمیری لال ذاکر	۱۳
م۔ک۔ مہتاب	۱۴	بلراج مین را	۱۲	احمد یوسف	۷
مبشر ناہید	۶	مہندر ناتھ	۹	عظیم واسطی	۳

اس سروے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۷۲ء میں بھی پڑھنے والوں یا ۲۸۹ قارئین کے

ذہنوں میں میرا نام بھی محفوظ تھا۔ مجھ سے بہتر اور مجھ سے سینئر افسانہ نگاروں کے مقابلے میں مجھے زیادہ ووٹ ملے تھے۔ یہ میرے تخلیقی سفر کے لئے ایک حوصلہ افزا بات تھی۔

اِس ضمن میں ایک اور بات یاد آرہی ہے۔ ایک بار ایک ادبی نشست میں ایک معروف نقاد نے اپنی قد وقامت کا احساس دلاتے ہوئے مجھ سے پوچھا...... ''شاہ صاحب آپ کی کہانیاں بہت سارے جرائد میں نظر آتی ہیں، اِن میں سے کچھ جرائد معیاری ہیں اور کچھ غیر معیاری۔ آپ کو غیر معیاری جرائد کا انتخاب نہیں کرنا چاہیئے۔'' یہ ایک نیک مشورہ تھا یا ایک طنز...... میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

''جناب معیاری جرائد میں میری کہانیاں شائع ہونے سے میری کہانیوں کا معیار بڑھ جاتا ہے اور غیر معیاری جرائد میں میری کہانیوں سے ان جرائد کا معیار بڑھ جاتا ہے۔''

لکھنے پڑھنے کے تعلق سے کچھ ایسی یادیں میرے سامنے اُبھر رہی ہیں جن کا تعلق ماہنامہ ''دیہات سدھار'' سے ہے۔ میں جموں وکشمیر کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹری میں بطور فیلڈ آفیسر کام کر رہا تھا کہ مرحوم صادق صاحب نے مجھے ماہنامہ ''دیہات سدھار'' کا مدیر تعینات کرنے کے تعلق سے احکامات جاری کئے۔ اس پوسٹ پر مرحوم عشرت کشتواڑی کام کر رہے تھے انہوں نے چند ماہ قبل ہی از خود سرکاری ملازمت سے سبکدوش لی تھی اور سیاسی میدان میں اُترنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہ فروری ۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ میں اب ایک گزیٹیڈ پوسٹ پر تعینات ہو چکا تھا۔ یہ اطلاع مجھے پہلے میرے ایک قریبی دوست آنجہانی بنسی سپرو نے دی اور بعد میں اس کی تصدیق صادق صاحب کے سیکورٹی آفیسر حفیظ صاحب نے بھی کی۔ دفاتر جموں میں تھے، میں جموں چلا گیا۔ نور محمد صاحب ایگریکلچر پروڈکشن کمشنر تھے۔ ''دیہات سدھار'' کی اشاعت کے دوران میری کہانیاں لکھنے کی رفتار میں کسی حد تک کمی آئی اور میں نور محمد صاحب کی ہدایات کے مطابق زرعی پروگراموں کے تعلق سے مضامین لکھنے لگا۔ اس دوران بے شمار زرعی پمفلٹ شائع ہوئے۔ بعد میں پنجابی اور اردو زبان کے معروف کہانی کار خالد حسین اور معروف ڈوگری شاعر تارا اسماعیل پوری نائب مدیران تعینات ہوئے اور اُن کی آمد سے میرے افسانے لکھنے کی رفتار

نے ایک بار پھر تیزی پکڑی۔ اُن کی تعیناتی سے پہلے کی بات ہے۔ ایک روز دفتر جاتے ہی مجھے سیکرٹری جنرل ڈیپارٹمنٹ جناب صفایا صاحب کا بلاوا آیا۔ میں اُن کے کمرے میں گیا وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ کہے بغیر وہ مجھے چیف سیکرٹری آغا مظفر صاحب کے چیمبر میں لے گئے۔ چیف سیکرٹری صاحب نے صفایا صاحب اور مجھے وزیر اعظم جناب شیخ محمد عبداللہ صاحب کے شاندار کمرے میں لے گئے۔

بیٹھئے اور لکھیئے۔ شیخ صاحب نے مجھ سے کہا۔ ''میں جو Dictate کروں گا اس کی کتابت کروالیجئے اور پھر اس کی کاپیاں نکال کر مجھے کیبنٹ روم میں دیجئے۔''

یہ حلف نامہ وزیر اعظم کے نام تھا اور اس پر دستخط کرنے والے اُن کے وزراء تھے اور اس میں شیخ صاحب کی تیئں اپنی وفاداری کا بھرپور اظہار کرنا واحد مقصد تھا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی اور جب کاپیاں بنا کر کیبنٹ روم میں گیا اور ایک ایک کاپی میٹنگ میں حاضر وزیروں کے سامنے رکھی۔ حالانکہ قریب قریب سارے وزیر مجھے جانتے تھے۔ دوسرے دن سارے اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ شیخ صاحب کے تیئں ریاستی وزیروں نے اپنی وفاداری کا اِظہار ایک حلف نامہ کی صورت میں ذاتی طور پر شیخ صاحب کو پیش کیا۔ اس حلف نامہ کے تعلق سے مرحوم شمیم احمد شمیم نے ''آئینہ'' میں ایک بڑا مضمون لکھا اور اپنے مخصوص طرز تحریر سے اس کا پوسٹ مارٹم کیا۔ یہ کام مجھے مدیر ''دیہات سدھار'' کی وجہ سے ملا تھا۔ حلف نامہ کی زبان انگریزی نہیں بلکہ اُردو تھی ......شاید اسی وجہ سے۔''

اِس تعلق سے ایک اور واقعہ مجھے یاد آرہا ہے۔ جب شیخ صاحب اور بیگ صاحب کے سیاسی تعلقات بگڑنے لگے اور ایک روز بیگ صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ کمرے میں اکیلے تھے...... انہوں نے اردو میں ایک خط لکھوانا شروع کیا۔ خط مکمل ہونے کے بعد انہوں نے کہا...... ''میں آج ہی دلی جا رہا ہوں۔ یہ خط بغیر کسی ترمیم و اضافہ کے کل کے اخبار ''آفتاب'' میں شائع ہونا چاہیئے۔ البتہ خط لکھنے والے کا کوئی عام سا نام لکھ دینا اور کل کا ''آفتاب'' مجھے دلّی میں ملنا چاہیئے۔ اس خط کا موضوع ''سیاسی آوارگی تھا۔ خط دوسرے روز ہی اخبار آفتاب میں

شائع ہوا لیکن مدیر آفتاب خواجہ ثناء اللہ بٹ کے اِس جملے کے ساتھ...... ''یہ خط میرے دفتر میں کوئی لڑکا دے گیا لیکن لگ رہا ہے کہ اِس خط کے ذریعہ بیگ صاحب نے سیاسی آوارگی کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔'' میں نے واقعی یہ خط اپنے کسی رشتہ دار لڑکے کو دفتر آفتاب میں دینے کے لئے کہا تھا۔ چند روز بعد جب بیگ صاحب دلی سے لوٹ آئے تو سیاسی حالات کچھ زیادہ ہی بگڑ گئے تھے۔ اگر یہ خط انگریزی زبان میں لکھا گیا ہوتا تو شاید میری ضرورت نہ پڑتی۔

مجھے ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے۔ جموں وکشمیر میں پنچایتی انتخابات کی بات چل رہی تھی۔ اعلیٰ سطح پر یہ فیصلہ لیا گیا کہ پنچایتی کانفرنسوں میں وزراء صاحبان اپنی تقریر پڑھ کر سنائیں گے تاکہ زبان و بیان میں سرکاری پالیسی کے خلاف کوئی بات نہ کہی جائے۔ ایک بار شیخ صاحب، بیگ صاحب اور محمد اشرف خان کو ریاسی میں ایک بہت بڑی پنچایت کانفرنس میں شرکت کرنا تھی۔ مجھے اس کانفرنس کے تعلق سے سب کے لئے تقریریں لکھنا پڑیں۔ اس کانفرنس میں دوسرے سرکاری آفیسروں کے ساتھ میں بھی موجود تھا۔ اُن دنوں گلکار صاحب ڈائریکٹر انفارمیشن ہوا کرتے تھے۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد گلکار صاحب نے مجھ سے کہا۔

''مبارک ہو''

''کس لئے''

''تقریریں اچھی تھیں لیکن اِن میں افسانوی رنگ جھلک رہا تھا۔ اب تو مزید وضاحت کی ضرورت نہیں......''

اِن تقاریر میں شاید سیاست کم تھی اور افسانہ نگاری کچھ زیادہ ہی!!

میرے ذہن میں پوشیدہ سوچوں کی تہہ سے سول سیکرٹریٹ کے کمروں کی تصویریں اُبھر رہی ہیں اور یہ تصویریں مجھے کچھ یاد دلا رہی ہیں۔ اگرچہ یہ یادیں میرے سرکاری سفر سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ان کا اظہار اس لئے ضروری بنتا ہے کہ ان کے پس پردہ اردو کا تعلق ہے اور اردو میرے ادبی سفر کی ساتھی ہے۔ سیکرٹریٹ میں مجھ سے بہتر اردو لکھنے اور سمجھنے والے افراد

موجود تھے۔ قابل بھی تھے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اُن کی نظر بلاشبہ بڑی وسیع تھی۔ لیکن میری افسانوی تخلیقات نے مجھے سیکرٹریٹ کے اندر باہر ایک الگ سی پہچان دینے میں مدد کی تھی اور سیکرٹریٹ گیٹ سے لے کر وزیر اعلیٰ کے چیمبر تک سب مجھے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے تھے۔ افسانہ نگاری کی وجہ سے سیکرٹریٹ میں کچھ لوگ مجھے ہر فن مولا سمجھنے لگے تھے۔ اس ''ہر فن مولا'' کی وجہ سے مجھے کبھی کبھی خود ساختہ پریشانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اسی پس منظر میں مجھے ایک دِن رینوا ایکٹ کا ترجمہ کرنے کے لئے کہا گیا۔ میں نے وہ ایکٹ دو تین بار پڑھا اور میرے پسینے چھوٹ گئے۔ اس ایکٹ میں اتنی تکنیکی اصلاحات تھیں جو میری جانکاری سے بالاتر تھیں۔ شاید مجھے ڈکشنری میں بھی نہیں ملتے لیکن اُن کو اردو روپ دینا ضروری تھا۔ خوش قسمتی سے مرحوم نور محمد بٹ سیکرٹریٹ میں نظر آئے۔ میں نے اُنہیں اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ وہ میرے ساتھ میرے کمرے میں آئے اور شام گئے تک ترجمہ کرنے میں مدد کرتے رہے۔ جب وہ مطمئن ہوئے تو تشریف لئے گئے۔ نور صاحب ایک بہت ہی اچھے مترجم تھے۔

اور اب اس کے برعکس کی کہانی سناتا ہوں۔ مسٹر آر۔ سی۔ بھارگو زراعت کے کمشنر تھے اور پنڈت ترلوچن دت وزیر زراعت۔ بھارگو صاحب ایک سلجھے ہوئے بیوروکیٹ تھے۔ ڈسپلن کے بہت زیادہ پابند۔ اُن کی اجازت کے بغیر کوئی بھی اُن کے کمرے میں کرسی پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے بڑے بڑے آفیسروں کو ان کے کمرے میں جانے سے پہلے اپنے کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے اور اپنی ٹائی کی گرہ کو ٹھیک کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں اُن کے ماتحت کام کرنے والوں میں بس واحد آفیسر تھا جس کو بغیر پوچھے کرسی پر بیٹھنے کی اجازت تھی۔ اس کی ایک وجہ تھی۔ اردو تو وہ بول سکتے تھے اور شاید مجھ جیسے اردو بولنے والوں سے بہتر لیکن نہ وہ اردو لکھ سکتے تھے اور نہ ہی اُردو پڑھ سکتے تھے اور اردو میں انہیں بہت ساری درخواستیں اور چھٹیاں ملتی تھیں۔ اُردو کے تعلق سے اُن کی ساری ڈاک میرے پاس آتی تھی۔ اُن کا ترجمہ کرنا میری ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ ہر روز ترجمہ شدہ مواد کی ایک الگ فائل اُن کے ٹیبل پر موجود رہتی تھی۔ وہ انگریزی ترجمہ پڑھتے اور الگ الگ سے اپنے احکامات صادر فرماتے...... بھارگو صاحب کے

مقابلے میں محمود الرحمان صاحب اُردو زبان کی باریکیوں سے کافی حد تک واقف تھے۔ خدا گواہ ہے اردو زبان کے تعلق سے بھی میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

پھر میری سرکاری تعیناتیاں بدلتی رہیں، ترقیاں ملتی رہیں، کبھی سیکرٹریٹ کے اندر اور کبھی سیکرٹریٹ سے باہر...... کچھ دیر تک میری ادبی سرگرمیاں رُک بھی گئیں لیکن میرے اندر کا افسانہ نگار زندہ رہا اور اس طرح میرا تخلیقی سفر آگے بڑھتا گیا......!

اپنے تخلیقی سفر کے دوران بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری ادبی اور علمی تنظیموں سے وابستہ رہا ہوں اور یہ سفر آج بھی رواں دواں ہے۔

جموں وکشمیر رائٹرس کو اپریٹیو سوسائٹی کا قیام ۱۹۷۰ء میں عمل میں لایا گیا۔ اس کی افتتاحی رسم شہر کے بہت بڑے ہوٹل ''نیڈوز ہوٹل'' میں انجام دی گئی۔ اس سوسائٹی کے قیام کا مقصد نہ صرف یہ تھا کہ ریاست بھر کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، قلم کاروں، فنکاروں اور موسیقاروں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم فراہم کیا جائے بلکہ اُن کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا بھی ازالہ کرنے میں مدد کی جائے۔ ریاست کے تینوں خطوں کے کلچر کو فروغ دیا جائے۔ کتابوں کی اشاعت اور فروخت کے لئے مناسب اقدامات اُٹھائے جائیں۔ کتابوں اور تصویروں کی نمائشوں کا اہتمام کرنا سوسائٹی کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ اس کا ایک باقاعدہ آئین اور دفتر تھا۔ یہ دفتر بابا بلڈنگ بنڈ سری نگر میں قریب قریب ہر روز بعد دوپہر کھلتا اور شام دیر گئے تک کھلا رہتا۔ میں اس تنظیم کا ایک سرگرم رُکن تھا اور موسم گرما میں دفتری اوقات کے بعد روز یہاں حاضر ہوتا تھا۔ یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ دربار مو کے دوران مجھے ملک کے نامور قلم کاروں سے ملنے کے مواقع ملتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ادبی دوستوں کی فہرست طویل تر رہی ہے اور اس میں ہر زبان وادب کے نام اور چہرے نظر آئیں گے۔ میں بات کر رہا تھا جموں وکشمیر رائیٹرس کو اپریٹیو سوسائٹی کی ادبی اور علمی مجلسوں کی۔ اس سوسائٹی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ رامانند ساگر جب بھی کشمیر آتے تو ہم لوگوں سے ملنے بابا بلڈنگ ضرور تشریف لاتے۔ یہاں ٹھاکر پونچھی نے اپنا ناولٹ ''یہ من بڑا چنچل'' پڑھا۔ ایک ہی نشست میں

سنا کر سب کو چونکا دیا تھا۔ ایک محفل میں رضیہ سجاد ظہیر نے اپنا ایک طویل افسانہ ''اللہ دے بندے'' پڑھا تھا اور مجھ سے بھی ایک کہانی سنی تھی جو بعد میں مرحومہ نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''اردو افسانے'' میں شامل کی تھی۔ یہ کتاب ۱۹۷۴ء میں نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کی تھی۔ اس کتاب میں میری شمولیت سے میری عزت افزائی ہوئی کیوں کہ خواجہ احمد عباس، رتن سنگھ، سہیل عظیم آبادی، واجدہ تبسم، اقبال متین، جوگندر پال اور قرۃ العین حیدر کی کہانیوں کے درمیان میری کہانی بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس طرح میری ادبی حوصلہ افزائی مختلف مرحلوں پر ہوتی رہی۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ غلام رسول سنتوش نے بابا بلڈنگ کے ایک کمرے کو سٹیڈیو میں تبدیل کرلیا تھا اور اکثر اپنی انمول تصویروں کی تخلیق میں مصروف نظر آتے۔ پہلی کشمیری فلم ''مانز راتھ'' کی کہانی، مکالمے اور گیت اسی ادبی ماحول کی دین ہے۔

اُن محفلوں کی اہمیت بھی کبھی کم نہ تھی جو محکمہ انفارمیشن کے بڑے ہال میں منعقد ہوتی رہتی تھی۔ اِن کا اہتمام مرحوم شمیم احمد شمیم کرتے تھے۔ میں ان محفلوں میں باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ یہاں ایک اور بات عرض کروں کہ کشمیر میں مشاعروں کا انعقاد بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ مقامی اور غیر مقامی شعرا ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے جب مرحوم شمیم صاحب حیات تھے تو میں اُن کے قریب بیٹھتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ شعرا کے کلام کے ساتھ نزدیکی سے مرحوم کے مزاحیہ اور طنزیہ جملوں سے اپنے آپ کو محظوظ کرسکوں۔ اس زمانے میں مرحوم قیصر قلندر صاحب کے گھر میں ہر اتوار کو ادبی اور علمی محفلوں کا اہتمام ہوتا تھا۔ تب وہ کرن نگر سری نگر میں رہتے تھے۔ میں باقاعدگی کے ساتھ اِن محفلوں میں بھی شریک ہوتا تھا۔ اگر میں رگھوناتھ بازار جموں میں کتابوں کی اس دکان کا تذکرہ نہ کروں تو اس کے مالک آنجہانی راجندر ملہوترہ کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ راجندر میرے اچھے دوستوں میں تھے اور مجھے اُن کی دوکان بلکہ اُن کے گھر میں بھی رکھی کتابیں اپنی مرضی سے لینے، پڑھنے اور پھر اپنی جگہ پر رکھنے کی اجازت تھی۔ اِن کتابوں نے میرے ذوق وشوق کو نکھارا اور لکھنے کے تعلق سے میری ذہنی قوت کو کشادہ کیا۔ جموں میں ہی ٹورسٹ ریسپشن سینٹر کے قریب شاردا کارنر نامی کتابوں کی ایک اور دکان تھی۔ اس کے

مالک سہگل جی ہوا کرتے تھے۔ وہاں بھی پڑھنے کے لئے کتابیں دستیاب ہوتی تھیں۔ سہگل جی نے پبلشنگ کا کام بھی شروع کیا تھا۔ میرے ناول ''نیلی جھیل کالے سائے'' کے علاوہ انہوں نے مرحوم علی محمد لون کا ناول ''شاہد ہے تیری آرزو'' اور موہن یاور کی ترتیب دی گئی کتاب ''توی اور جہلم'' کو منظر عام پر لانے کی ذمہ داریاں بھی سنبھال لی تھیں۔ ٹھیک شاردا کارنر سے چند قدم آگے ایک اور صاحب (نام یاد نہیں آرہا ہے) سڑک کے ایک کنارے ایک بڑی سی چادر پر کتابیں سجائے کتابوں کو کرائے پر دے کر اپنا پیٹ پالتے تھے۔ وہاں بھی کتابیں دستیاب ہوتی تھیں۔

میرا تخلیقی سفر جاری ہے اور اس تخلیقی سفر کو آگے لے جانے کی بجائے میں ایک بار پھر اپنے ماضی کی جانب جھانک رہا ہوں۔ مجھے اس کا ذکر پہلے ہی کرنا چاہیئے تھا لیکن......لیکن کبھی کبھار سوچیں ساتھ نہیں دیتی ہیں...... یہ اُس زمانے کی بات ہے جب میں نے پہلی بار ریڈیو ڈراما لکھنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنی ہی ایک کہانی ''دل کی روشنی'' کو ڈرامائی روپ دیا اور مسودہ علی محمد لون صاحب کے حوالے کیا۔ چند دنوں بعد انہوں نے مجھے پران کشور جی سے ملنے کے لئے کہا۔ میں پران جی سے ملا۔ پران جی نے یہ ڈراما دو بار نہیں بلکہ تین بار نئے سرے سے لکھوایا اور تب ریڈیو سے میرا پہلا ڈراما نشر ہوا۔ یہ میرے تخلیقی سفر کی ابتدا ہی تھی اور اس کے بعد میں تواتر کے ساتھ ریڈیو ڈراما لکھتا آرہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب تک میں سو سے زائد ریڈیو ڈرامے لکھ چکا ہوں۔ یہ سارے ڈرامے نشر بھی ہو چکے ہیں۔ ڈرامہ لکھنے کے تعلق سے میرا سفر اب بھی جاری ہے۔ چند ریڈیو ڈرامے میری کتابوں میں بھی شامل ہیں۔ ریڈیو ڈراما لکھنے کے تعلق سے چند برس قبل مجھے ریڈیو کشمیر (اب آل انڈیا ریڈیو) سے سوم ناتھ سادھو کے نام سے ایوارڈ بھی ملا ہے۔ اُس زمانے میں بشیر عارف صاحب ریڈیو کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل تھے۔

چوں کہ میری ملازمت کے بہت سارے ماہ وسال سول سیکریٹریٹ سے وابستہ رہے ہیں اس لئے ہر سال چھ ماہ سری نگر اور چھ ماہ جموں میں گزارنے کا پابند تھا۔ جموں میں رہ کر میرے ذوق وشوق کو نئی نئی راہوں سے ہمکنار ہونے کے مواقع ملے اور میں وہاں کی ادبی محفلوں

میں بھی شریک ہوتا رہا اور فیض اٹھاتا رہا۔ جموں سے تعلق رکھنے والے میرے دوستوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ جموں کے قیام کے دوران اُن سے ملنا جلنا ہوتا تھا۔ محفلیں جمتی تھیں۔ کچھ ادیب اور علم دوست تو یہ دنیا چھوڑ کر چلے گئے جو حیات ہیں اُن سے آج بھی رابطہ ہے۔ کشمیری پنڈت کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے قلم کار جنہیں کشمیر سے باہر جانا پڑا آج بھی تخلیقی سفر میں میرے ہم سفر ہیں۔ اُن کی یادیں، اُن کی باتیں آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ یہ دوطرفہ ٹریفک ہے وہ بھی مجھے یاد کرتے ہیں، میرا ذکر کرتے ہیں اور کبھی کبھار ملنا بھی ہوتا ہے اگر چہ ملنا جلنا اور ملاقاتیں محدود ہو کر رہ گئی ہیں کیوں کہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد میرا جموں جانا بہت کم ہو گیا۔ میرے لئے بیتے دِنوں کی یادوں سے فرار حاصل کرنا ہرگز ممکن نہیں۔

اگر دیکھا جائے تو میرے تخلیقی سفر میں کوئی تسلسل نہیں۔ آج کی بات کل کے حوالے سے کرتا ہوں اور کل کی بات آج کے کھاتے میں ڈالتا ہوں۔ اسی آج کل کے دائرے میں آل انڈیا اردو کانفرنس کے مختلف مناظر آنکھوں کے سامنے آنے لگے ہیں۔ اس اہم اردو کانفرنس کا اہتمام ممبئی میں ہوا تھا اور ماہ وسال میرے ذہن سے اُتر چکے ہیں۔ میرے علاوہ اس کانفرنس میں شمیم احمد شمیم، غلام رسول سنتوش، موہن یاور اور عابد مناوری بھی سرکاری طور پر نامزد ہوئے تھے۔ اس کانفرنس کی صدارت اندرا گاندھی جی نے کی تھی اور کرشن چندر نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا تھا۔ کرشن چندر نے اپنے خطبہ اِستقبالیہ میں میرا اور میری کہانیوں کا ذکر کشمیر کی خوبصورتی کے پس منظر میں کیا تھا۔ یہ میرے لئے بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔

اردو تنظیموں کے قیام کے تعلق سے جموں وکشمیر اردو اکادمی کی ادبی سرگرمیاں اور کارکردگیوں کا ذکر بے حد ضروری ہے۔ اگر چہ اس تنظیم کا قیام ۲۰۰۶ء میں عمل میں لایا گیا تھا لیکن سنہ ۲۰۱۰ء میں سرکاری طور پر رجسٹر کی گئی۔ میں اکادمی کا دس سال تک صدر رہا۔ اس کا اپنا ایک اردو جریدہ ماہنامہ ''اردو اکادمی'' کے نام سے شائع بھی ہوتا رہا اور میں اس کا مدیر بھی تھا۔ اردو زبان وادب کی خدمت اس تنظیم کا واحد مقصد تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے اکادمی ان گنت ادبی محفلوں، مشاعروں، بحث ومباحثہ، مذاکرات، کتابوں اور تصویروں کی نمائشوں اور

مختلف ثقافتی پروگرام کی ترتیب وتہذیب میں ایک نمایاں رول ادا کر کے سرکاری اور غیر سرکاری سطحوں پر ایک نمایاں نام کمالیا تھا۔ میرے تخلیقی سفر میں اردو اکادمی کا قیام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

۲۰۱۴ء میں فکشن رائٹرس گلڈ کی بنیاد پڑی۔ سرکاری طور پر گلڈ رجسٹر ہو چکا ہے۔ فکشن کی آبیاری اس کا ایک اہم بلکہ واحد مقصد ہے۔ جموں وکشمیر کا قریب قریب ہر فکشن نگار اس تنظیم سے جڑا ہوا ہے۔ اس کا باقاعدہ ایک صدر دفتر ہے جہاں پر ہر سنیچر وار کو فکشن کے تعلق سے نشستوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ فکشن کے لحاظ سے یہاں زبان وبیاں کی کوئی بندش نہیں ہے۔ ہر زبان کے فکشن کو بڑھاوا دینا وقت کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے گلڈ ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ وحشی سعید اس کے سرپرست ہیں۔ گلڈ کے چار مشیر ہیں۔ جسٹس ریٹائرڈ بشیر احمد کرمانی، نور شاہ، خالد حسین اور اسفندیار خان۔ گلڈ کی نشستوں میں، میں بھی کبھی کبھار اپنی کہانیاں سناتا ہوں اور گلڈ کے ممبرن کے تاثرات سے مستفید ہوتا ہوں۔ یہاں فکشن کے تعلق سے گفتگو ہوتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہانی کاروں کو اس تنقیدی گفتگو سے اپنی کہانیاں بہتر طور سے سجانے اور سنوارنے میں مدد ملتی ہے۔

نگینہ انٹرنیشنل صرف ایک رسالے کا نام نہیں بلکہ کشمیر سے باہر بھی اردو دنیا میں ایک تحریک بن کر سامنے آچکا ہے۔ ۲۰۱۴ء میں اس کی اشاعت نو کا سلسلہ شروع ہوا تب سے میں اس کے ادارتی مجلس کا ایک رکن ہوں۔ دوسرے اراکین میں مظفر ایرج اور ڈاکٹر اشرف آثاری قابلِ ذکر ہیں جبکہ معروف افسانہ نگار وحشی سعید ''نگینہ'' کے مدیر ومالک ہیں۔

تخلیق کار کی زندگی میں انعامات واکرامات کے امکانات کو خارج نہیں کیا جاسکتا۔ میرے تخلیقی سفر کے دوران اب تک مجھے بہت سارے انعامات واکرامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ ان کی تعداد تیس سے زائد ہے۔ حال ہی میں ۲۰۱۹ء کا سٹیٹ ایوارڈ بھی ملا۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ جموں وکشمیر اور لداخ میں دسویں جماعت کے طلاب میرے نام سے واقف ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ کئی برسوں سے میری کہانی '' آسمان، پھول اور

لہو' دسویں جماعت کے اردو نصاب میں شامل ہے۔ یہ میرے تخلیقی سفر کی ایک اہم کڑی ہے۔

اور میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ گزشتہ تیس برسوں کے دوران قلم کاروں کی ایک نئی نسل اُبھر کر آ رہی ہے۔ یہ قلم کار اپنے اسلوب سے شعری اور نثری ادب کی آبیاری میں مصروف ہیں۔ اسی طرح لڑکے لڑکیوں کی ایک اچھی تعداد اردو زبان و ادب کے تعلق سے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں ایم۔فل اور پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔ اِن کی مدد کرنا، اُن کی رہنمائی کرنا اور اُن کے مطالعے کے لئے کتابیں اور مواد فراہم کرنا اب میرے ادبی سفر کا ایک حصہ ہے۔

میں اس وقت شاید جموں وکشمیر اور لداخ کا واحد افسانہ نگار ہوں جس کے نام اور کام پر آٹھ طلاب کو ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض کی گئی ہیں۔

۱) افسانوی مجموعہ۔ گیلے پتھروں کی مہک	امتیاز احمد	جموں یونیورسٹی
۲) نور شاہ اور اس کے افسانے	سدیش کمار	جموں یونیورسٹی
۳) نور شاہ کی ناول نگاری	نزاکت حسین	جموں یونیورسٹی
۴) آسمان پھول اور لہو۔ افسانوی تجزیہ	سمیر احمد	مولانا آزاد یونیورسٹی حیدر آباد
۵) نور شاہ کی ادبی خدمات	اشفاق احمد	نیشنل یونیورسٹی حیدر آباد
۶) نور شاہ کی افسانہ نگاری	شیراز احمد	برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال
۷) جموں وکشمیر میں اردو افسانہ "نور شاہ کے حوالے سے"	فاروق احمد وانی	برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال
۸) نور شاہ.....افسانہ نگاری اور ناول نگاری کے پس منظر	رتیش کمار	جموں یونیورسٹی

میرے قریبی دوست کہتے ہیں آج کل میری تحریر کردہ کہانیوں میں رومانیت کے مختلف روپ نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ رومانیت کی کوئی عمر نہیں ہوتی اور کبھی کبھار زندگی کی اندر کی کتاب کی نقاب کشائی کہانی کار کو ذہنی طور پر سکون بخشتی ہے اور وہ یہ سکون اپنے پڑھنے والوں کے ساتھ بانٹنا چاہتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ میری بات سے اتفاق رکھتے ہوں مگر اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کی رومان بھی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ آپ رومانیت کے پس منظر

میں میری کہانیوں کو کس انداز سے دیکھتے ہیں۔ یہ آپ کا کام ہے۔ قلم کار تو آپ کے پڑھنے اور پرکھنے کے لئے یا آپ کی سوئی ہوئی سوچوں میں ہلچل پیدا کرنے کے لئے مواد فراہم کرتا ہے......!!

تخلیقی سفر کے دوران میری کہانیاں اَن گنت وسائل اور جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں جن کی تعداد لگ بھگ 60 سے زائد ہے۔ جن میں بہت سارے رسائل بند ہو چکے ہیں۔

اخبارات میں بھی کبھی کبھار میرے افسانے/ افسانچے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن کشمیر عظمیٰ کا ذکر خصوصی طور سے کرنا چاہوں گا۔ افسانوں کے علاوہ میرا ایک ادبی کالم بھی کئی سال تواتر کے ساتھ میں شائع ہوتا رہا۔

میرا تخلیقی سفر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اپنے چاہنے والوں کی محبت اور شفقت سے ابھی جاری ہے۔ اگر صحت رہی اور قلم نے ساتھ دیا تو شاید کبھی آنے والے دِنوں میں اپنے تخلیقی سفر کی ایک اور کہانی میں سنا سکوں گا۔ یار زندہ محبت باقی!

............●●●............

● ...... علیم صبا نویدی

نورانی عطا۔ نور شاہ

(ایک سانیٹ جناب نور شاہ کے نام)

نقشہ بدل کے رکھ دیا ہے نور شاہ نے
اوراقِ گلستاں میں مہک نور شاہ کی
افسانوی ادب میں چمک نور شاہ کی
کتنا عجب سفر کیا ہے نور شاہ نے

اپنی الگ اک راہ بنائی ہے شاہ نے
الفاظ کو دیا نیا پیراہن کہیں
سوچوں کو دی ہے ایک نئی انجمن کہیں
کشمیر کی بہار دکھائی ہے شاہ نے

خامہ میں ان کے گوہرِ اظہار کا جمال
تحریر ان کی حاصلِ کشمیر کی بہار
اوراق ان کی سوچ پہ کرتے ہیں جاں نثار
احساس میں ہے ان کے نئے دور کا کمال

ہاں نور شاہ وقت کی نورانی دین ہیں
تاریخِ فکرو جذبہ کی رحمانی دین ہیں

...............●●● ....

● ...... ٹھاکر پونچھی

شاہدہ شیرین سے نور شاہ تک کا سفر

نور شاہ (شاہدہ شیرین) ایک پھول کی مانند افسانہ نگاری کے گلشن میں کِھلا اور کھلتے ہی اپنے تعطر اور لطافت سے دوسروں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ ایک میں دو وجود، دو روحیں، جو گلاب کے پھول میں سمٹ کر اُردو ادب میں نمایاں ہوئیں۔ شاہدہ شیریں نور شاہ کا قلمی نام ہے۔ اس نام کو اپنانے میں کون سی مصلحت ہے۔ یہ تو نور ہی بہتر جانتا ہوگا کہ اُسی کے نورانی تخیل کا پرتو ہے۔ ہوسکتا ہے نسوانی خدوخال اور چال ڈھال کا عکس جمیل آئینے میں دیکھا ہو اور اُس میں اپنے خیالوں کی محبوبہ کا سیمیں جسم منعکس پایا ہو۔ کچھ بھی ہو۔ لیکن نام کی مناسبت برحق ہے کہ ظاہر و باطن کی نفسیاتی باریکیوں کی حامل ہے۔ قریبی احباب کا کہنا ہے کہ اِس اپنائیت کا ایک گہرے المیہ سے تعلق ہے اور شاہدہ شیرین نام سے نور کے ماضی کی چند تلخ چند شیریں یادیں وابستہ ہیں جن کی بدولت اندھیری کھوکھلی فضاؤں میں ایک متحیر سوالیہ نشان بن کر رہ گیا۔ خلاؤں میں جھانکنے والی ایک ایسی نگاہ تجسس جو ماضی کے کھنڈروں میں ہر وقت ہر گھڑی کسی گم شدہ لمحے کی تلاش میں منہمک رہتی ہے۔

گُل پوش سرسبز و شاداب وادی نے اب تک اُردو ادب کی پُر خار راہ میں ہمیں رنگارنگ پھولوں سے نوازا ہے اور اُن پھولوں میں نور شاہ کی صورت میں ایک اور حسین نکہت ریز گل کا اضافہ ہوا ہے۔ نور زعفران زار وادی کی ایک دلنشین کُنج میں سرینگر کے متوسط طبقے میں پیدا ہوا۔ وہیں پرورش و پرداخت ہوئی۔ احساسات میں جو زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں۔ اندازِ بیان میں جو شگفتگی رچاؤ اور موسیقی ہے۔ وہ کچھ تو حیات پرور پہاڑی وادیوں کی

عظمت وجلال کی دین ہیں اور کچھ اپنے ماحول اور طبقے کی رہین منّت ۔ایسے ماحول میں جہاں بہت کچھ پایا۔ وہاں بہت کچھ کھویا بھی ۔ پانے کا تعلق شعور سے تھا۔کھونے کا تعلق دل سے۔ وقت کے ساتھ ماحول کی چھاپ گہری ہوتی گئی ،تو دل کا زخم ناسور بنتا گیا،حتیٰ کہ نور شاہ سے شاہدہ شیریں ہو گیا۔جب کوئی جذباتی اور رقیق القلب اپنی ذات ،اپنا غم ،اپنا احساس شعوری اور غیر شعوری طور پر عمر کے مخصوص ایام میں ،اپنی دیکھی یا ان دیکھی محبوبہ کے وجود میں مدغم کر دیتا ہے اور یوں اپنی جستجو کی تکمیل کر لیتا ہے،تو کبھی وہ میرا جی بن جاتا ہے یا شاہدہ شیرین بن جاتا ہے اور مجروح تمناؤں کی ساری تلخیاں اور محرومیاں اپنے دہکتے ہوئے سینے میں چھپا کر بچی کھچی خوشیاں غیروں میں لُٹا کر ایک اجنبی سی مسرت ایک انوکھی سی تسکین حاصل کرتا ہے۔

نور شاہ سے میرا تعارف ایک خط سے ہوا۔ جو میرے ایک افسانے سے متعلق تھا۔ کہیں توارد تھا یا موضوع مِلتا جُلتا تھا۔خط کی تحریر میں تناؤ اور تیکھا پن تھا۔تنقید اور توصیف کے ملے جلے جملے والے خطوط تو اپنے محبوب مداحوں سے ملتے ہی رہتے ہیں۔ ہر خط کا جواب دینا اپنا فرضِ اوّلین سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ میرے لئے یہ رشتہ مقدّس اور اہم ہے۔طرزِ تخاطب مختلف سہی لیکن ایسے خطوط کا جذبہ ایک ہوتا ہے۔کوئی بھائی بن کر لکھتا ہے۔تو کوئی بہن یا محبوبہ کا روپ دھارن کر کے۔ اندازِ تحریر اور طرزِ تخاطب کی نوک پلک سامنے رکھ کر حسب ضرورت مختصر یا مفصل جواب دیتا ہوں۔ چوں کہ اپنے کشمیر سے اپنی نوعیت کا پہلا خط تھا۔جس میں مہربان محبت کا اظہار تھا اور اخلاقی جرأت کا ثبوت مانگا گیا تھا اور وہ بھی زوردار الفاظ میں۔لہٰذا اخلاقی جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے تحریر کیا......آپ کے مطالعہ اور مشاہدہ کی قدر کرتا ہوں۔ایک بات یاد رکھیئے کہ شعر یا افسانے میں مفہوم یا پلاٹ کا ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔لیکن اُس کا مطلب خدارا یہ کبھی نہ لیجئے کہ شاعر یا افسانہ نگار نے چوری کی ہے کیونکہ چھوٹے بڑے مستند فنکار کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ قارئین کا حلقہ وسیع ہے اور پختہ شعور اور بالغ نظر بھی..........''

میرے جواب نے سلسلۂ خط و کتابت کی بنیاد ڈالی اور کشمیر کے ناطے خط و کتابت جاری رہی ۔نور نے میرے افسانوں اور ناولوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ مجھ سے بے حد متاثر

دکھائی دیتا تھا۔ یکے بعد دیگرے تین چار خطوط پڑھنے کے بعد ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ جہاں تحریر میں ستھرا پن ہے۔ نکھری سنوری ہوئی زبان ہے۔ ایک رچا ہوا انداز بیان ہے وہاں جواں فکری بھی ہے اور دور نظری بھی اور مشاہدہ زندگی و مطالعہ نفس گہرا ہے۔ نوعمر ہوتے ہوئے بھی نوعمر زندگی کے سنگین حادثات سے انتہائی پختہ ہو چکی ہے۔ خطوط کی تحریر میں جو چبھن تھی۔ تڑپ اور کُرید تھی۔ اُس میں ایک کہانی کار کی تشکیل پنہاں تھی جو کسی وقت بھی عالم وجود میں آ سکتا تھا۔ عالم وجود میں آنے سے پہلے ہی جسے کسی ایسے راہنما کی تلاش تھی، جو مناسب وقت پر اُس ڈگر پر چھوڑ دے۔ جہاں سے اپنے سہارے قدم بہ قدم چلتے بڑھتے اپنی اُس منزل کو پالے۔ جو مضطرب خیالوں میں ابھی سے منہمک رہی تھی۔ راہنما ملا یا نہیں لیکن حالات ہموار اور ساز گار ملے اور آج ذرا سا کہانی کار لگن و محنت اور جہد پیہم و عزمِ مستحکم کے سہارے بے گھاٹ کی ناؤ لئے اپنی منزل کی دہلیز پر کھڑا نازاں و شاداں نگاہوں سے اُن پُر خار پیچیدہ راہوں کو پہچان رہا ہے جنہوں نے اپنے کانٹوں سے اُس کے پاؤں چھلنی کئے۔ لیکن قدموں کو بلندیوں اور وسعتوں کی سمت بڑھنے کا راستہ اور حوصلہ بخشا۔ شاہدہ شیریں ہو یا نور شاہ یا کوئی اور آخر نام میں کیا رکھا ہے، موجودہ افراتفری اور بے راہ روی کے دور میں غیر معمولی ذہانت اور شعوری پختگی کے بل بوتے پر ہی اپنا راستہ ہموار کر سکتا ہے۔ نور شاہ نے ایک قلیل عرصہ میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے زور پر اپنے آپ کو منوایا اور آج نئے اُبھرنے والے افسانہ نگاروں میں اپنے مخصوص رنگ میں رنگے ہوئے ایک نمایاں مقام پر پہنچ چکا ہے اور اُس کا شمار نوجوان فنکاروں میں ہونے لگا ہے جن کے قلم میں جان اور شعور میں افسانہ نگاری کا صحت مند رجحان موجود ہے۔ جو نئے لکھنے والوں میں آتے ہیں لیکن جن کی فنی پختگی اُن کے نئے پن کو مشکوک بناتی ہے۔

بے گھاٹ کی ناؤ کے افسانوں کی تخلیق و ترتیب کی تہہ میں ایک کہانی ہے۔ نگاہ تجسس کی کہانی۔ جس کا محور آج کا انسان ہے۔ انسانی زندگی کے سوز و ساز کا زیر و بم ہے۔ مجبوریاں اور ناکامیوں کی خلش ہے اور رستے ہوئے ناسوروں کا ذکر بھی کہ اِسی محور کے گرد آج کی دُنیا آج کا ماحول اور آج کا سماج گھوم رہا ہے، چھوٹے بڑے غریب امیر کی تفریق پیدا کر رہا ہے اپنی بقا کے لئے زندگی انسانوں کو پیش رہا ہے۔ اِن افسانوں میں نور نے سماج کے غیر انسانی توازن پر آنسو

بہائے ہیں، جس میں غریب و نادار کا کوئی وزن نہیں، کوئی قیمت نہیں۔ اُس نے شعوری طور پر انسانی ادب کو اپنایا ہے جس میں اُس کے آنسوؤں کی مسکراہٹ اور خون کی سُرخی شامل ہے۔ اُن کے افسانوں کا غم واندوہ حقیقت سے اتنا قریب ہے کہ مصنف کے تجربات ہمیں اپنے تجربات معلوم ہوتے ہیں۔ نورؔ نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور فنکارانہ انداز سے اُس کی عکاسی کی ہے۔ جو کچھ لکھا ہے اِردگرد کے حالات کا خوردبین نگاہوں سے مطالعہ کر کے لکھا ہے اور انسانی دل کی تمام کیفیات کو اپنی کہانیوں میں سمویا ہے۔ اِسی لئے یہ کہانیاں جہاں انسانی زندگی کے نشیب وفراز کا آئینہ ہیں وہاں اِن میں زندگی کی ہولناکیوں اور مسرت آفرینیوں کی جھلک بھی نمایاں ہے۔

نور کے افسانوں میں شعور وفکر کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ زبان اور اسلوب فنکارانہ اور شاعرانہ ہے کہ دھیمے سُریلے سروں میں اپنی بات کہنے کا قائل ہے۔ تحریر میں جہاں شگفتگی اور بے تکلفی ہے، وہاں غضب کی روانی اور بے ساختگی بھی ہے۔ پہاڑی ندی جیسا تسلسل اور رچاؤ ہے ساتھ ہی گہرائی بھی ہے۔ نور کے یہ افسانے شدید احساس کے مرہونِ منت ہیں۔ ایک معمولی سا واقعہ بھی اُس کے ایک خوبصورت افسانے کی اساس بن جاتا ہے اور انسان کے کردار حقیقی زندگی کے کردار معلوم ہوتے ہیں۔

نور انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ ان کے افسانوں میں رومان کے پھول بھی ملیں گے اور مقصدیت کے کانٹے بھی کہ زندگی میں سوز وساز قدم بقدم اور دوش بدوش ہیں کہیں کہیں سماجی بے اعتدالی اور بے راہ روی پر دردمندی کے ساتھ طنز بھی کیا ہے۔ اُس کی نگاہیں ماحول کی پُر فریب سطح کو چیر کر تہہ میں حقیقت کو ڈھونڈتی ہیں اور کامیابی کے ساتھ مطلوبہ تاثر اُبھارتی ہیں۔

''بے گھاٹ کی ناؤ'' کے افسانوں پر علاحدہ علاحدہ اظہار خیال مقصود نہیں۔ کیونکہ تمام افسانے ایک ہی معطر پھول کی مختلف بکھری ہوئی پتیاں ہیں جن کا حقیقی رنگ اور تعطر مجموعی تاثر میں پنہاں ہیں۔ اُسی انداز سے اُنہیں سمیٹ کر نگاہوں کے سامنے اُجاگر کرنا ہے۔ کیونکہ

مختلف کردار مشترکہ حرکت سے ایک ماحول کو جنم دیتے ہیں اور اُس رنگا رنگ ماحول میں ہی انسانی سماج کی روپ ریکھا دیکھی جاسکتی ہے۔ بے گھاٹ کی ناوٗ، کا مجموعی تاثر ہی ہمیں ان افسانوں کی دھڑکنوں کے قریب لے جاسکتا ہے۔

چند نئے پرانے افسانہ نگاروں نے نئے کشمیر کی جو روپ ریکھا اپنی تخلیقات میں اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ اُس میں جاگیردارانہ ماضی کی پرچھائیاں تو ہوسکتی ہیں لیکن وہ آج کے نئے ماحول نئے عوامی دور کی صحیح تصویر نہیں۔ خوش آئند مستقبل کی جھلک نہیں۔ میری خواہش ہے کہ نور اپنی جنت کی مقدس اور پُر خلوص کہانیاں اپنے انداز میں لکھے اور اپنی زعفرانی دھرتی کی حقیقت افروز نقوش پیش کرے جو نہایت ہی پاکیزہ حسین اور صحت مند ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ نور شاہ اپنی دھرتی کے تابندہ ذروں کو نا اُمید نہیں کرے گا اور اردو ادب میں اُس کی آمد نئے ادیبوں کے لئے راہ ہموار کرے گی۔ حوصلہ افزا پیغام لائے گی "بے گھاٹ کی ناوٗ" نور کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے اور ہر لحاظ سے کامیاب اور مکمل ہے۔ اگر اُس نے اپنی دھرتی کا دامن نہ چھوڑا اور اپنی کہانیوں کا خمیر اپنی مٹی سے ہی اُٹھاتا رہا تو ایک دن اُس کا شمار اُن سرکردہ افسانہ نگاروں میں ہوگا جو حقیقی معنوں میں کشمیر کے نمائندہ اور منفرد ادیب کہلانے کے مستحق ہیں۔ اپنے موہن یاور، حامدی کاشمیری، ویدراہی اور پشکر ناتھ جیسے جموں و کشمیر کے اُردو افسانہ نگاروں کی صف میں نور شاہ کی شمولیت قابلِ فخر اور باعث ستائش ہے۔ افسانہ نگاروں کی صف میں اُس کا خیر مقدم ہونا چاہیئے۔

............●●●............

● ...... پروفیسر شکیل الرحمان

نور شاہ: فطری جبلت کا افسانہ نگار

نور شاہ ایک معروف تخلیقی فنکار ہیں، ان کے افسانے موضوع اور تکنیک کی ہم آہنگی کی وجہ سے قاری کے احساس اور جذبے کو فوراً چھو لیتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کی تین خصوصیات توجہ طلب ہیں ایک یہ کہ ان کی رومانیت ماحول اور فطرت کے باطن پر اتر جاتی ہے اور پھر کرداروں کے احساس اور جذبے تک پہنچ جاتی ہے۔ ماحول کے حسن و جمال اور کرداروں کے رویوں اور اُن کے عمل میں ایک ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے جو متاثر کرتی ہے۔

دوسری خصوصیات یہ کہ تخلیقی فنکار ''سیکس'' یا جنسی جذبے میں ایسا ہیجان پیدا کرتا ہے کہ روح اور جسم دونوں کی لذت ایک ساتھ ملنے لگتی ہے بلاشبہ بدن اور اس کے لہو میں جنسی ہیجان سے جو تپش پیدا ہو جاتی ہے وہ زندگی کے سچے جنون کی دین ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ افسانہ نگار اقدارِ زندگی کے پیش نظر اظہار خیال میں بڑا توازن رکھتا ہے اور یہی اُس تخلیقی فنکار کی کامیابی ہے۔ ''خوشبو کا سفر''، ''صلیب''، ''آخری دن کی تلاش'' وغیرہ عورت کی نفسیات کی گرہیں کھولتی ہیں تو افسانہ نگار کی عمدہ فنکاری کی پہچان ہوتی ہے۔

تیسری خصوصیت یہ کہ چند افسانے ایسے ہیں جو زندگی کی ٹریجڈی کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری کے کلیجے پر چوٹ پڑتی ہے۔ ''وہ ایک شخص تھا''، ''ہیلنگ ٹچ''، ''زمین کھولے گی زبان اپنی''، ''لکیریں''، ''ٹوٹتے لمحوں کا بیان'' زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بھری کہانیاں ہیں۔ افسانہ نگار نے حالات اور ماحول کے المیے کی گہرائیوں میں اُترنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان افسانوں کے کردار مثلاً آمنہ کا بڑا بھائی (ہیلنگ ٹچ) خان بابا (وہ جو ایک شخص تھا) چتر کار

(پرندے) وغیرہ علامتوں کی حیثیت رکھتے ہیں، جھانکئے تو یہ علامتیں بہت گہری نظر آئیں گی۔

نور شاہ کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے پہلے افسانہ نگار قاری کو لطیف اور لطیف تر رومانی ماحول اور فضا میں کھینچنے کی کوشش کرتا ہے پھر اُس کے بعد زندگی کے سچائیوں اور عورت اور مرد دونوں کی نفسیات کی پیچیدگیوں کو ذہن پر نقش کرتا ہے۔ حسن پسندی اور حسن پرستی میں تخلیقی فنکار کی گہری نظر کا علم ہوتا رہتا ہے مثلاً:

''مستی میں ڈوبی دو بڑی بڑی آنکھیں، کتابی چہرہ اور اُس چہرے پر نکھرا سرخ و سفید رنگ، نمکین چائے کے رنگ کی شلوار اور اُسی رنگ کی چست قمیض، جسم کا ایک ایک انگ، ایک ایک قوس عیاں دو موٹی موٹی گولائیوں کے درمیان پسینے کے ننھے ننھے قطروں سے ابھرنے والی دھیمی دھیمی خوشبو...... جی چاہتا ہے کہ ان قطروں کو گھول کر پی لیا جائے یا اُن کے عطر بنا کر جسم پر مل لیا جائے۔'' (بے معنی سفر)

حسن کے احساس میں جو تازگی ہے اُن کا لطف ہی دگر ہے۔ نور شاہ کا احساسِ جمال کشمیر کے رنگ و نور کی دین ہے، حسن کا مشاہدہ کرنا اور پھر حسن میں ڈوبتے جانا تخلیقی ذہن کا وہ کارنامہ ہے جو برسوں کی لذت عطا کر جاتا ہے۔ یہاں کشمیری نمکین چائے کا لطف وہی لے سکتے ہیں جو اِس چائے کے رنگ اور اس کی لذت سے کبھی آشنا رہے ہوں۔

نور شارہ کی عمدہ فنکاری کا ثبوت وہاں بھی ملتا ہے جہاں وہ جسم کے حسن کے ساتھ اس جسم کی تشنگی کا نقش احساس اور جذبے سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال ''رات کا سورج'' کے ابتدائی جملوں سے مل جاتی ہے۔

''کبھی کبھی میں اپنی بھرپور نظروں سے اپنے جسم کو دیکھتی ہوں اور لاتعلق انداز میں اپنے حسن کے بارے میں سوچتی ہوں۔ اپنی سُندرتا کے خد و خال سنوارتی ہوں میری یہ حرکت میرے شہوانی جذبات کی عکاسی نہیں کرتی بلکہ اس سے میرے جمالیاتی احساس کو تسکین ملتی ہے میری اس حرکت سے شاید نرگسیت جھلکتی ہو شاید تب ہی میں اپنے ہونٹ آئینے کی ٹھنڈی گداز سطح پر دیکھ کر اپنے ہی عکس کا بوسہ لیتی ہوں۔ اور کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میں عمر بھر پیار کے لئے ترستی رہی

ہوں اس جذبے کی تلاش میں جہاں جہاں گئی اندھیرا ہی پایا اور اب کیا میری زندگی کا صرف
اندھیاروں سے گزر ہوگا، ان اندھیاروں کا یخ ٹھنڈا دھواں کبھی کبھی مجھے ایک حسین سپنے کی یاد
دلاتا ہے۔ یہ سپنا پہلے میری آنکھوں میں جاگا تھا پھر میرے خشک لبوں پر کسی معطر شگوفے کی
طرح کھل اُٹھا...... (رات کا سورج)

یہ ابتدائیہ خود ایک مکمل کہانی ہے ایک ایسے کردار کی کہانی جو اپنی نفسیات میں اُلجھا ہوا ہے۔
نور شاہ کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ کہانی کی ابتداءً قاری کے ذہن کو فوراً
اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ رات کا سورج، اس کی عمدہ مثال ہے۔ ''صلیب'' کی ابتدا بھی اسی
طرح پرکشش ہے۔

میں تنہا ہوں......!

میرے آنگن میں چنار کا درخت سفید برف میں دبا ہوا بے حد اُداس کھڑا ہے۔ آکاش کی
جانب اپنی ننگی باہیں پھیلائے دیکھ رہا ہے۔ ہر شاخ ایک صلیب ہے اور ہر صلیب پر نڈھال عیسیٰ
کو خُدا کی تلاش ہے۔ (صلیب)

نور شاہ ایک صاحبِ اسلوب افسانہ نگار ہیں جو اقتباسات پیش کئے گئے ہیں اُن سے
اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا ایک منفرد اسلوب رکھتے ہیں۔ اسلوب کے حُسن کی
انفرادیت کے پیش نظر یہ مثال بھی دیکھئے۔

''چاند ایک بوڑھا سوداگر ہے جو ہر چاندنی رات کو اپنی کرنوں کی ایک سیڑھی دھرتی پر پھینکتا ہے
اور اس سیڑھی پر سے آہستہ آہستہ اُترتی ہوئی ایک بلی میرے کمرے میں چلی آتی ہے اور اپنی نیلی
آنکھوں سے مجھے گھورنے لگتی ہے اور جب تک کرنوں کی یہ سیڑھی اس دھرتی پر لٹکی رہتی ہے وہ کبھی
میرے کمرے میں بچھے قالین پر اور کبھی میرے بستر پر لوٹتی رہتی ہے اور جب یہ سیڑھی چاند
کی طرف اُٹھنے لگتی ہے بلی گھبرا کر میرے کمرے سے نکل جاتی ہے اور پھر صبح کی روشنی ساری بستی
کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے اور اس روشنی میں میں اپنے کمرے کی کھڑکیاں کھول کر بستی کو اپنی بھر
پور نظروں سے دیکھنے لگتا ہوں مگر میری نظریں صرف سامنے کی حویلی پر ہی جم کر رہ جاتی ہے اور

میں سوچتاہوں کہ کاش ایسا ہوجائے کہ ایک بارصرف ایک بار اس حویلی کی ساری عورتیں بلیاں بن کر میرے کمرے میں گھس آئیں میرے جسم کو نوچ کرڈالیں تاکہ میرے وجود پر لٹکا ہوا زہریلا سانپ جو آہستہ آہستہ رینگ رینگ کران سب عورتوں کو ڈس لینا چاہتا ہے بے موت مرجائے ......! (دروازے)

غور کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ اِس پُراسرار لہجے کے ساتھ ہم آہستہ آہستہ کہانی کے اندر داخل ہونے لگتے ہیں یہ منفرد اسلوب ہمیں کہانی کے باطن میں اُتار دیتا ہے تب احساس ہوتا ہے کہ فنکار کا اسلوب کتنا ظالم ہے۔ کشمیری ماحول کے پس منظر میں ایک بہت ہی تلخ سچائی کا ذکر نور شاہ نے جس فنکارانہ سطح پر کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میرا اشارہ ان کے افسانہ ''ہیلنگ ٹچ'' کی جانب ہے۔ ان جملوں کو پڑھنے سے ایک عجیب سا سناٹا ذہن کو گرفت میں لے لیتا ہے۔

''رات اندھیری ہے نہ چاند کی نرم وسبک روشنی ہے اور نہ ہی ستاروں کی چمک دمک، ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک سیاہ بادلوں کا دھندلکا چھایا ہوا ہے۔ خلقت سے بھری یہ بستی خالی خالی سی نظر آتی ہے اور میں اپنے بند کمرے میں بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ اس مختصر سی داستان کا اختتام کب، کہاں اور کیسے ہوگا۔ دور بہت دور گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں شاید کراس فائرنگ ہو رہی ہے ان آوازوں سے ان سناٹوں میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے اب تو یہ سناٹے نہ صرف میری بلکہ ہم سب کی زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔''

............●●●............

● ...... پروفیسر حامدی کاشمیری

نور شاہ: تخیل و تفکر کا حسین امتزاج

نور شاہ ریاست کے ایک معتبر اور معروف افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے کئی افسانوی مجموعے شائع کئے ہیں، میں برابر ان کے افسانوں کا قاری رہا ہوں۔ نور شاہ لگ بھگ میرے ساتھ ہی پشکر ناتھ سمیت ایک عرصے تک ''بیسویں صدی'' میں چھپتے رہے، جموں کے قیام کے دوران ان سے میری ملاقاتیں بھی رہی ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ایک طویل عرصے تک خانہ نشین ہو کے رہ گئے، مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ خرابی صحت کی وجہ سے یا خرابی حالات کی بناء پر ہو گئے۔ بہر حال کوئی بھی وجہ کیوں نہ ہو، وہ اس عرصے میں لکھنے سے دست بردار نہیں ہوئے تھے۔ اس کا ثبوت ان کی کتابیں ''بند کمرے کی کھڑکی''، ''کہاں گئے وہ لوگ''، ''آسمان پھول اور لہو''، ''بے ثمر سچ'' ہیں جو چھپ چکی ہیں۔ جب میں نے ان کی یہ کتابیں دیکھ لیں تو انکشاف ہوا کہ یہ وقفہ incubatory وقفہ رہا ہے۔

اس وقت ان کا افسانوی مجموعہ ''بے ثمر سچ'' میرے سامنے ہے۔ 'بے ثمر سچ' کے افسانوں کو پڑھ کر مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ نور شاہ کا تخلیقی ذہن انفرادی اظہار کا متقاضی ہے۔ ملکی سطح پر پریم چند کے بعد ترقی پسند افسانہ نگار کرشن چندر، راجندر سنگھ، بیدی، منٹو ہوں یا رومانی افسانہ نگار مثلاً سجاد حیدر یلدرم کے ساتھ ساتھ ریاستی سطح پر پریم ناتھ پردیسی اور ٹھا کر پونچھی بھی افسانے کی بے کم و کاست روایتی تکنیک سے کام لیتے رہے، وہ پلاٹ، کردار نگاری، فضا سازی، واقعہ در واقعہ اور نقطۂ عروج کے بنے بنائے فریم ورک میں مختلف سماجی،

سیاسی، نفسیاتی مسائل کو سموتے رہے۔ افسانے کی اس نوع کی روایتی ہیئت اور تکنیک تقسیم تک جاری رہی۔ تقسیم کے فوراً بعد سریندر پرکاش، غیاث احمد گدی، انور سجاد، بلراج ہنرا اور رشید امجد نے روایتی تکنیک سے انحراف کر کے علامتی اور تجریدی افسانے لکھے۔

جہاں تک ریاست میں افسانہ نگاری کا تعلق ہے یہ بھی روایتی آداب ولوازم کی پابند رہی۔ اس نوع کے افسانہ نگاروں میں پریم ناتھ در، علی محمد لون، تیج بہادر بھان، آنند لہر، موہن یاور اور سنتوش کے بعد، امیش کول، ویدراہی اور نور شاہ سامنے آئے۔ علی محمد لون کا افسانہ ''مونچھوں والی گڑیا''، تیج بھادر بھان کا ''جہلم کے سینے پر'' پشکر ناتھ کا ''گلوان''، نور شاہ کا ''بے گھاٹ کی ناؤ''، مخمور حسین بدخشی کا ''نیل کنول مسکائے'' بطورِ مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے بعد نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں ہردے کول بھارتی، شمس الدین شمیم، مالک رام آنند، وجے سوری، کلدیپ رعناء ساگر کشمیری، ریاض پنجابی، ظہور الدین، عمر مجید، وریندر پٹواری، آنندلہر، فاروق رینزو، انیس ہمدانی، زاہد مختار اور مشتاق مہدی قابل ذکر ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو کے افسانہ نگاروں کی خاصی بڑی تعداد میں ہر ایک افسانہ نگار کے لئے اپنی شناخت تسلیم کروانا آسان کام نہیں، افسانے کی قدر سنجی کے پسِ منظر میں گنتی کے چند نام ہی ہیں، جو افسانے کی ہیئت اور تکنیک کے حوالے سے جدت پسندی سے کام لیتے رہے ہیں۔

یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ ریاست میں نور شاہ اہم افسانہ نگار ہیں جو تجربہ پسندی اور جدت کاری کو بروئے کار لاتے ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں کہ وہ اپنے افسانوں کو روایت کی زنجیروں میں جکڑ بند ہونے نہیں دیتے بلکہ افسانے کے پہلے ہی جملے سے بیان کنندہ زندہ اور متحرک ہو جاتا ہے اور چند ہی جملوں کے بعد اپنے لکھنے والے کی تحکیم اور منشا کو مسترد کر کے خود اپنا راستہ بناتا ہے اور جو افسانہ خلق ہوتا ہے وہ زبان کی شگفتگی، جملوں کی خود تراشیدگی، شعریت آمیزی، طنز اور تضاد سے جمالیاتی تجربے میں ڈھل جاتا ہے۔ اس تجربے میں متکلم یا راوی افسانے کی رگ وپے میں لہو کی طرح رواں ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھتا ہے۔ قاری کے لئے اس نوع کے افسانے کی تفہیم و تحسین کو کارگر بنانے کے لئے خود قرأت کے آداب

میں تبدیلی لانا مُلتزِم ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر نور شاہ کے افسانے روایتی تکنیک و ہیئت سے انحراف کرتے ہیں، تو ان کو فن کے کس خانے میں رکھا جائے گا، اس سوال کا جواب دینے سے قبل یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ افسانے یا شعر کے جو لوازم و آداب رائج ہیں وہ وقت کے تغیر کے ساتھ نئی تبدیلیوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی میں مغربی فکشن میں جو افسانوی تکنیک چارلس ڈکنز نے برتی، وہ بیسویں صدی میں جیمز جوئس نے مسترد کی اور یولے نے جیسا ناول لکھا جس میں مرکزی کردار بلوم ایک دن کے واقعات کی تجسیم کرتا ہے۔

نور شاہ نے ''بے ثمر سچ'' کے افسانوں میں افسانہ نگاری کی منقلب اور جدت پسند تکنیک سے کام لیا ہے۔ یہ افسانے روایتی کردار سازی سے ہٹ کر کسی ایک کردار کی ذہنی، جنسی، جذباتی یا نفسیاتی کیفیت کو وقوع پذیر ہونے دیتے ہیں اور وہ اس کیفیت کو مرکز توجہ بناتے ہیں، کردار کسی واقعے سے متصادم ہوتا ہے اور پورا افسانہ ایک شعاع کی طرح ابھرتا ہے اور قاری کے ذہن کو روشن کرتا ہے یہ گویا بجلی کے کوندنے کا عمل ہے ؎

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

ایک کامیاب افسانہ نگار کسی وضاحت، تکلم اور خیال آرائی سے کام نہیں لیتا یہ کام وہ قاری کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ نور شاہ کے افسانے بھی کسی آغاز، اختتام، اینٹی کلائمکس، خیال آرائی یا وضاحت کے محتاج نہیں ہوتے، یہ افسانوی تکنیک میں ایک خوش آئند تبدیلی ہے۔ ادھر جابر حسین اپنے افسانوی مجموعے ''ریت پر خیمہ'' میں کسی واقعے کو مرکزی اہمیت دیتے ہیں اور اس پر نقد و تبصرہ کو انشائیہ کی صورت عطا کرتے ہیں۔ یہ انشائیہ نما افسانہ، افسانوی ادب کی ایک نئی جہت کو اجاگر کرتا ہے۔

میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ نور شاہ کے تازہ افسانوں میں بھی جنس کا موضوع حاوی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ادب میں جنس کبھی شجر ممنوعہ نہیں رہا ہے۔ ہمارے باوا آدم اور حوا جنت میں رہ کر بھی اس سے دور نہ رہ سکے اور دنیا میں بھیجے گئے، اور یہاں بھی جنس کی بنیادی

جبلّت سے روگردانی نہ کرسکے۔ فرائڈ کے نظریۂ جنس سے بین الاقوامی سطح پر کتنے ہی فنکار متاثر ہوئے ہیں اور اسے جمالیاتی آب ورنگ میں پیش کرچکے ہیں۔ نور شاہ کے بعض افسانے ایسے ضرور ہیں جہاں جنس رومانیت اور حسن پرستی میں بدل چکا ہے۔ چونکہ میرا مطالعہ نور شاہ کے افسانوں میں موضوعات جن میں جنسی موضوع بھی شامل ہے، کی تلاش وتعین نہیں ہے۔

''بے ثمر سچ'' میں شامل افسانہ 'لکیریں' کو لیجئے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے ہمارا موقف یہ نہیں ہے کہ اس میں کیا پیش ہوا ہے بلکہ یہ کہ کس طرح پیش ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افسانے میں مواد، تفہیم یا معنی ومطلب کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، ان کی اگر کوئی جگہ ہے تو وہ افسانے کے باہر ہے۔ چنانچہ نور شاہ کے افسانے میں غیر ضروری description اور طولانی تفصیلات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

''لکیریں'' کا پہلا ہی جملہ قاری کو افسانے کی فرضیت کی دنیا میں باریاب کراتا ہے:

''اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پرسکون ماحول ایک ڈراونے اور بدصورت روپ میں بدل گیا''۔

اس جملے میں لفظ ''اور'' متکلم کے بیان کردہ واقعے سے قبل کسی نامعلوم واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے، ''اور'' کے بعد ''دیکھتے ہی دیکھتے پرسکون ماحول بے حد ڈروانے اور بدصورت روپ میں بدل گیا''۔ اس شروع کے جملے کے بعد امن وسکون کے ماحول میں کسی شئے کے پھٹنے کی آواز سنائی دیتی ہے اور پھر گولیاں چلنے کی آواز، اور پھر کثیف بادل اٹھ کر بکھر جاتے ہیں۔ ''بچو اور بچاؤ'' کی آوازیں آتی ہیں اور پھر دھویں میں ایک ''معصوم چیخ'' سنائی دیتی ہے، اور پھر سناٹا اور گولیاں چلنے کی آوازیں بند ہوگئیں، گردوپیش کے لوگوں کے ساتھ متکلم بھی جائے وقوع پر پہنچا، وہاں پہنچ کر متکلم تفکیری لہجے میں کہتا ہے:

''احساسات وخیالات موت اور زندگی کی پیچیدگیوں میں کھو گئے''

اور پھر

''میری نگاہوں کے سامنے وقت کا تیز لاوا بہا اور بے سبب جم گیا''۔

اسکے بعد متکلم مقتول بچے کے بارے میں کہتا ہے:

''ایک چہرہ میرے سامنے تھا، دودھیا رنگ سے بھرے بھرے بے رنگ سادھے ہونٹ، چھوٹی ناک اور اس چہرے میں پوشیدہ معصومیت، پاکیزگی اور تقدس، وہ بچہ جس نے نہ دنیا دیکھی تھی اور نہ ہی دنیاداری، کراس فائرنگ میں اپنی جان کھو چکا تھا، اس کی کتابوں سے بھرا بستہ چھلنی ہو چکا تھا، اور کتابیں سڑک پر بکھری ہوئی تھیں''۔

لوگوں نے کہا کہ اسے ہسپتال لے چلو، ہسپتال کا نام سنتے ہی میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا، لیکن اس کے دائیں ہاتھ کی لکیریں اس کی بے وقت موت پر بے تحاشا ہنس رہی تھیں.....''

اور افسانے کے اختتامی جملے.......

''ہاں وہ مر گیا لیکن اسے کس نے مارا، کس قصور میں مارا، کیا مارنے والا کوئی نقاب پوش تھا یا کوئی وردی پوش یا اپنی مٹھی بھر سیاسی دنیا کو سجانے والا کوئی کھدر پوش..... کوئی تو تھا!

زمین جب اپنی زبان کھولتی ہے تو اتہاس کی کڑیاں مل جاتی ہیں، پھر آہستہ آہستہ اتہاس کی یہ کڑیاں کتابوں میں دفن ہو جاتی ہیں، ہم سب کی لمبی لکیروں کی طرح..... لکیریں!''

اس مختصر افسانے میں یوں تو ایک واقعہ رونما ہوتا ہے، یعنی پر سکون اور پر امن ماحول میں اچانک کراس فائرنگ میں ایک بچے کی موت واقعہ ہوتی ہے، مگر بات سے بات نکلتی ہے متکلم دوسرے لوگوں کے ساتھ سڑک پر لڑکے کی لاش دیکھتا ہے، خون میں لت پت، اس کی نظر اس کے دائیں ہاتھ کی عمر کی لکیروں پر پڑتی ہے۔ اس کو لگا کہ وہ ''لکیریں اس کی بے وقت موت پر بے تحاشہ ہنس رہی تھیں''۔ اس طنزیہ جملے کے بعد اختتام میں جو مفکرانہ ردِ عمل سامنے آتا ہے، اس سے متکلم کے تدبر و تفکر کا اندازہ ہوتا ہے۔

''زمین جب اپنی زبان کھولتی ہے تو اتہاس کی کڑیاں مل جاتی ہیں، پھر آہستہ آہستہ اتہاس کی یہ کڑیاں کتابوں میں دفن ہو جاتی ہیں، ہم سب کی لمبی لکیروں کی طرح.... لکیریں!''

افسانہ میں جس ماحول میں گولیوں سے ایک لڑکے کی جان لی جاتی ہے اسے نہ صرف سیاسی غارتگری اور خون ریزی کی عکاسی ہوتی ہے بلکہ ایک عالمگیر انسانی المیہ کی نمود بھی ہوتی

ہے۔

الغرض یہ افسانہ بظاہر ایک ہی واقعے پر مبنی دکھائی دیتا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے، افسانے کے مرکزی واقعے سے چند در چند محجوب و نیم محجوب وقوعوں کی طرح بھی توجہ جاتی ہے۔

۱) معصوم بچے کی بے وقت موت اور اس کی کتابوں کے بستے کے چھلنی ہونے اور ''کتابوں کا سڑک پر بکھرنے'' کا متاثر کن وقوعہ اپنی انفرادی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس پر مستزاد ''اس کے ہاتھ کی لمبی لکیر کا بے تحاشا ہنسنا'' طنزیہ صورت کو اجاگر کرتا ہے۔

۲) افسانے کی سیاسی جہت ''نقاب پوش، وردی پوش اور کھدر پوش'' سے اخذ ہوتی ہے۔

۳) افسانہ حقیقت نگاری کو بہت پیچھے چھوڑ چکا ہے اور فرضی صورت حال کو پیش کرتا ہے یہاں تک کہ افسانے میں کراس فائرنگ سے معصوم بچے کی موت کسی خارجی واقعے کے طور پر دکھائی نہیں دیتی، یہ لسانی برتاؤ سے داخلی واقعہ میں بدل جاتی ہے۔

۴) افسانہ پڑھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کسی سوچے سمجھے مواد یا موضوع کو پیش کرتا ہے اس کا مرکزی واقعہ افسانوی ہے اور اس سے جڑی ہوئی ہر چیز اور مظہر افسانوی ہے۔

۵) افسانہ صرف ایک کردار یعنی متکلم کے عمل اور ردِ عمل پر مرتکز ہے، وہ دردمند، حساس، مفکر اور خود آگاہ ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

افسانے کا بظاہر خاتمہ ''لکیریں'' پر ہوتا ہے.... اس سے پورا منظر نامہ لکیروں میں بدل جاتا ہے، یہ ایک سریلی منظر ہے۔ افسانوی دنیا میں خاتمے پر لکیریں ہی لکیریں رہ جاتی ہیں اور زندگی اشارتاً لایعنیت میں بدل جاتی ہے۔

............●●●............

محمد یوسف ٹینگ......

نور شاہ: ایک دلنشین کولاج کا خالق

نور شاہ اُردو کے چابکدست، پختہ مشق اور صفِ اول کے افسانہ نگار ہیں، میں اُن کو نصف صدی سے زیادہ عرصے سے جانتا ہوں۔ اُن کی بول چال اور سبھاؤ میں بڑی سہل پسندی ہے یعنی وہ فوراً گھل مل جاتے ہیں اور دوست بنا لیتے ہیں اُن کے افسانوں کے موضوع بھی زندگی آمیز اور زندگی آموز ہوتے ہیں اور اُن کا بیانیہ بہت رواں دواں، مشکل الفاظ کے بوجھل پتھروں سے آزاد اور جاذب نظر ہوتا ہے۔ اسی لئے اُن کے دوست بہت ہیں اور اُن کو پسند کرنے والے بے شمار، میں بھی اُن کا ایک خاموش مداح لیکن چست قاری رہا ہوں۔ زیرِ نظر کتاب افسانوں کی نہیں ہے اُن کے افسانوں کے کرداریوں تو زندگی کے بہت قریب ہوتے ہیں لیکن زیرِ نظر کتاب باقاعدہ گوشت پوست اور اپنے خاص نام اور کام رکھنے والے انسانوں کے خاکوں پر مشتمل ہے، کتاب کو پڑھتے ہوئے مجھے لگا کہ میں ایسے زندہ، تابندہ اور درخشندہ ہم عصروں کے جلوس کا ایک اہم قدم بن گیا ہوں جو یا تو نور شاہ کی طرح میرے بھی دوست تھے نہیں تو جاننے والے رہ چکے ہیں یا جن کے اچھے کاموں اور جن کی کارکردگی کو میں بھی اُن ہی کی طرح دیکھتا رہا ہوں اور اس پر سر دھنتا رہا ہوں۔ نور شاہ نے اچھے سچے لوگوں کے اس مختصر کولاج کو بڑے سلیقے سے سجایا ہے اور یہ ہر حال میں اپنی دلکشی اور شریں نگاری کا قائل کرتے ہیں۔ میں نے اُن کی گنتی کرنا چاہی تو لگا کہ ایک چہرے کے پیچھے اور بہت سے چہرے اُبھرتے جاتے ہیں۔ کچھ ہمارے ساتھ مصافحہ کرتے ہیں، کچھ ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے اور

ہمارے راز فاش کرتے ہیں، کچھ ہماری بانہوں میں بانہیں ڈال کر ہمیں بچپن اور جوانی کی جولانیوں میں لے جاتے ہیں پروفیسر محی الدین حاجنی اور مرزا کمال الدین شیدا، دینا ناتھ نادم اور پروفیسر پرتھوی ناتھ پشپ ہمارے اندر آج بھی تعظیم و تکریم کے جذبات اُبھارتے ہیں۔ کیسر سنگھ مدھوکر، بنسی نردوش، عابد مناوری نظروں کے سامنے آتے ہیں، اُن کے ساتھ دلچسپ گپ شپ، کھیل تماشوں اور شوخیوں و شرارتوں کی یادیں سلگنے لگتی ہیں۔ نور شاہ کے ان خاکوں میں تفصیلات کا وفور نہیں ہے کہ اُن سے ہماری توجہ ہٹتی بٹتی رہے۔ یہ چند سطروں میں مذکورہ شخص کا آدم قد مرقع کھڑا کر دیتے ہیں، ان کی سہل پسندی اور دلنوازی پر یہ گمان نہیں ہونا چاہیے کہ اُنہیں محنت اور مشق کی کوئی کمی ہے، ان کا کینواس ضرور چھوٹا ہے مگر یہ بسوہلی کے مینا تور (Miniature) کی طرح دلچسپ، تسکین بخش اور جُرعے میں پیاس بجھانے والی ہیں۔ ان میں پیچ داری بھلے ہی نہ ہو مگر ضرب قلم کا ایسا زور ہے کہ چند نقوش (Strokes) ہی جیتن داس کے پنسل خاکوں کی طرح شخصیت کا جادو جگاتے ہیں ان خاکوں کا بڑا اُگن یہ ہے کہ اپنے اختصار اور پھر اپنی کشش کی وجہ سے انہیں قاری چند نظروں میں ہی پڑھ جاتا ہے، میری اطلاعات کے مطابق ان خاکوں کو شائع کرنے والے اخبار کے بہت سے شائستہ مذاق قاری اخبار میں پہلے نور شاہ کے کالم کو پڑھ کر اپنے ذہن شاداب کرتے ہیں اور پھر فرصت سے دوسرے کالموں کو دیکھتے ہیں۔

نور شاہ کی ان تحریروں میں شخصیات کی زندگی اور اُن کے کارناموں کے بارے میں مفید حوالے ملتے ہیں اور اُن پر خاص محنت کی گئی ہے، خود میری معلومات میں بھی ان سے اضافہ ہوا اور بعض دفعہ اتنا کہ مجھے اپنے حوالوں کی ڈائری میں کچھ باتوں کو ٹانک دینا پڑا۔ شخصیات کے امتیاز کو اُبھارنے کے لئے دوسرے اہم قلم کاروں کی مختصر ہی سہی مگر بہت برجستہ آرائیں درج کی گئی ہیں اور کبھی کبھی تو کچھ ایسی سطریں پڑھنے کو ملتی ہیں جنہیں Quoteable Quotes ہی کہا جاسکتا ہے اُن کی چاشنی کا اندازہ کرنے کے لئے صرف دو ایک نمونے........!

☆ وہ انقلابی سپاہی کی بندوق اور موسیقار کے ستار تھے۔

☆ اردو زبان کا ایک نام صابردت ہے۔

☆ ستیا رتھی دنیا بھر کے لوگوں کے لئے لوک گیتوں کو جمع کر کے خود ہی ایک لوک گیت بن گیا ہے

☆ انارکلی بار بار پیدا ہو سکتی ہے لیکن مدھو بالا نہیں۔

کتاب میں ہر درجے اور ہر سطح کی شخصیات سے ہماری ملاقات ہوتی ہے کچھ ایسے کہ وہ ہماری ذہنی تفریح کے جادوئی پٹارے کا حصہ ہیں جیسے ملکہ ترنم نور جہاں، فلم شعلے کا گبر سنگھ یعنی امجد خان، گلوکار محمد رفیع اور موسیقار اعظم نوشاد علی وغیرہ۔ کتاب کی ہر سطر ایک گلی بنتی ہے، جانے پہچانے چیزوں کی آوازیں ہماری توجہ کو مبذول کرتی ہیں اور اس کا ہر صفحہ ایک بازار، جس میں ہمارے دیکھے سُنے ہوئے بڑے لوگوں کے چہرے بشرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ نورشاہ کا کمال یہ ہے کہ اُس نے ان سب کو ہمارے حافظے کے بھولے بسرے طاقچوں سے نکالا ہے، اُنہیں نئی پوشاکیں پہنائی ہیں اور طرح طرح کی خوشبوؤں میں شرابور کرنے کے بعد اُنہیں ہمارے سامنے لایا ہے، اتنی خوش اندازی سے ہم اُن کو پہچاننے اور اُن کے اچھے کام یاد کرنے میں کوئی مشکل محسوس نہیں کرتے، یہ خاکے مقامی مگر موقر روزنامے ''کشمیر عظمیٰ'' میں ایک عرصے سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں نورشاہ کبھی کبھی ان خاکوں کی توسط سے ایک پورے تہذیبی منظر کو کھولتے ہیں مثلاً لتا منگیشکر کے حوالے سے ہندوستانی فلموں کے سرساگر کی اور دینا ناتھ نادم کی معرفت سے کشمیر کے ادبی اور تہذیبی منظر نامے کی۔

اس کتاب کی یہ خوبی مجھے اچھی لگی کہ یہ آج کے چھوٹے موبائل فون سیٹ کی طرح یوں تو چھوٹی سی لگتی ہے مگر اس سوئچ بورڈ کے نیچے بہت سی مسرتوں اور معلومات کے سُر چھپے ہوئے ہیں۔ کتاب کو ہاتھ میں لے کر پڑھنے ہی کی نہیں پی جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ ہمارے اُردو کے سکڑتے ہوئے حلقہ قارئین کو بڑھانے کے دم خم بھی رکھتی ہے۔ اس سے بھی اچھی بات یہ ہے کہ گزشتہ پچاس سال اور اس سے زیادہ لمبے عرصے میں ہمارے یہاں ابھرنے اور جدا ہونے والے اچھے لوگوں کو اُن کی آن بان کے ساتھ پھر ہمارے سامنے لایا گیا ہے اور وہ ہمارے کمزور حافظوں میں پھر ستاروں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔

ان خاکوں کی خوبی کی بات تو ہو چکی لیکن ان کے متعلق اگر کسی قاری کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اس میں سارے کے سارے کردار تاباں اور درخشاں، سچے اور اچھے ہی نظر آتے ہیں حالانکہ ہم مٹی کے ماتے اکثر صورتوں میں اچھے اور برے دونوں طرح کے اطوار اور کردار رکھتے ہیں اور انسان کے قالب میں چھپا ہوا نور اسی کے پہلو میں چھپے ہوئے نار سے الگ نہیں کیا جاسکتا تو اس کے معقولیت کو ٹالا نہیں جاسکتا مگر میں سمجھتا ہوں کہ گزرے ہوئے دوستوں کی بھلائی کو اُبھارنا اخلاق اور آداب کا ایک اہم حصہ ہے اور پھر یہ نورشاہ کی تہذیب نفس کے علاوہ خوب گوئی کے تقاضوں کی بھی بازگشت ہے اکثر مقامات پر قاری کی زبان پر ہمارے مشاعروں کا وہ خوبصورت نعرہ آجاتا ہے......مکرر ارشاد......باقی رہا ان شخصیات کی کچھ کمزوریاں ہماری زبان تو اس معاملے میں قینچی کی طرح چلتی رہتی ہے اور سارا حساب برابر کرتی ہے......!!!

............●●● ....

● ...... پشکر ناتھ

نور شاہ: سماج کا آئینہ

نور شاہ کی بات کشمیر میں اُردو افسانے اور اس کی نشو ونما کی بات سے الگ نہیں......نور شاہ کی بات آئے گی تو پس منظر میں کشمیر میں اُردو افسانے کی بات ضرور ہوگی۔
کشمیر میں اُردو افسانے کی ابتداء جب بھی ہوئی ہو مگر اس بات سے انکار نہیں کہ اُردو افسانے میں پریم ناتھ پردیسی پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پردیسی کے بعد کشمیر کے افسانہ نگاروں نے اُردو افسانے کی اوڑھنی میں کون کون سے ستارے ٹانکے ہیں۔ جاننا اور ان کی صحیح قدروں کو متعین کرنا نقادوں کا کام تھا، مگر بد قسمتی سے اُردو زبان کے تمام نقاد اس بات پر خاموش ہیں۔ ممکن ہے اس میں بھی کوئی مصلحت ہو۔ یہ مصلحت اُردو ادب میں ایک نمایاں حیثیت اختیار کرتی جارہی ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا ہے۔ ہاں ایک طرح کی ادبی بددیانتی عمل میں ضرور آرہی ہے۔ اس بددیانتی کو مدِّ نظر رکھ کر یہ مضمون لکھا جارہا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو ادب میں کشمیری ادیبوں کا اتنا حصہ ضرور ہے کہ اُن کی طرف نقاد حضرات توجہ دیں۔ کشمیری ادیبوں کے تئیں جو بے اعتنائی برتی گئی اُس کا احساس باہر اتنی شدّت سے نہیں جتنا کشمیر میں موجود ہے اور نتیجہ کے طور پر یہاں کا ادیب اپنے آپ کو Ignore کیا ہوا محسوس کر رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود تخلیقی عمل جاری ہے اور کارواں میں نئے نئے ساتھی شامل ہو رہے ہیں۔ وقت آئے گا جب اُردو کے نقاد اس کارواں کی موجودگی کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ مگر وقت کا انتظار کس نے کیا ہے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ کشمیر کے ادیب بغیر کسی طرف دھیان دئے اپنا کام کئے

جارہے ہیں اور اپنا تخلیقی عمل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی کے بعد ادیبوں کا ایک کارواں وجود میں آگیا ہے جو پوری تندہی اور لگن کے ساتھ اپنے پیش رووٴں کی روایت کو نہ صرف زندہ رکھنے کے لئے کوشاں ہے بلکہ اس روایت کو آگے بڑھا رہا ہے۔ ان میں سوم ناتھ زُتشی، پریم ناتھ در، رامانند ساگر، ٹھاکر پونچھی، حامدی کشمیری، علی محمد لون، تیج بہادر بھان، مخمور بدخشی، موہن یاور، ویدراہی، برج کیتال، بنسی نردوش، صوفی غلام محمد، غلام رسول سنتوش، رام کمار ابرول، امیش کول، ہردے کول بھارتی اور دوسرے بہت سے ادیبوں کا ذکر خاص طور سے کیا جاسکتا ہے۔ مگر حیرت کا مقام ہے جہاں یہ سب ادیب اُردو افسانے کو حتی المقدور سنوارنے میں کلیدی رول ادا کر رہے ہیں، وہاں اس سارے تخلیقی عمل کا جائزہ لینے والا خاموش ہے۔ اس خاموشی کو یہاں کا ادیب بہت حد تک محسوس کرتا ہے اور نتیجہ کے طور پر جو بھی پہلا اُردو پڑھا لکھا آدمی کشمیر آتا ہے وہ جھٹ ایک مضمون لکھتا ہے جس میں یہاں کے افسانہ نگاروں کا ایک سرسری جائزہ ہوتا ہے، چند مشورے ہوتے ہیں بس! ظاہر ہے یہ پہلا اُردو پڑھا لکھا آدمی اپنے مضمون کی بُنیاد سُنی سُنائی باتوں پر اور کسی قہوہ خانے میں دو ایک ادیبوں کے ساتھ کی گئی گفتگو پر رکھتا ہے اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہوتا ہے۔

بہر حال! یہ میری بحث کا موضوع نہیں ہے، اس لئے میں اس بات کو اسی حد تک رہنے دیتا ہوں، یہ کہنے کے بعد کہ اب یہاں کے ادیبوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے کام کا جائزہ لیں اور اس طرح نقادوں کے اس تغافل یا مصلحت کو چلینج کریں۔

اسی سلسلے کی پہلی کڑی یہ مضمون ہے جو میں اپنے ایک ہمعصر ادیب کی شخصیت اور فن پر تحریر کر رہا ہوں۔ اسی استدعا کے ساتھ کہ اس مضمون کو اسی جذبے کے پس منظر میں رکھا جائے اور اس میں وہ نقادانہ قسم کی صلاحیت اور تشبیہیں ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی جائے جن کی ضربیں اور چوٹیں سہتے سہتے بائرن اور شیلے جواں مرگ ہوئے تھے!

نور شاہ نے سب سے پہلے شاہدہ شرین کے فرضی نام سے لکھنا شروع کیا۔ اُن کا پہلا افسانہ ''گلاب کا پھول'' کے عنوان سے ایک ادبی جریدے ''بیسویں صدی'' میں شائع ہوا۔

بہر حال نور شاہ کی ادبی زندگی کا آغاز ’’گلاب کا پھول‘‘ سے ہوا، اور تب سے آج تک اس افسانہ نگار نے درجنوں افسانے لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اچھا افسانہ چاہے نور شاہ کا لکھا ہوا ہو یا شاہدہ شرین کا، ہر حالت میں اچھا ہی کہلایا جائے گا!

میری دانست میں نور شاہ کے لکھے ہوئے افسانوں کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ابھی نور شاہ کو افسانہ نگاری کے میدان میں آئے ہوئے اتنا وقت نہیں ہوا ہے جسے ادوار میں تقسیم کیا جا سکے۔ پہلا دور وہ ہے جب نور شاہ نے ’’گلاب کا پھول‘‘ ’’بن برسے بادل‘‘ اور ’’زعفران کی لالی‘‘ کے معیار کے افسانے لکھے ہیں۔ نور شاہ کی اُس دور کی سب سے کمزور کہانی ’’زعفران کی لالی‘‘ ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نور شاہ کی اُس دور کی باقی تمام کہانیاں اچھی ہیں۔ اچھے اور بُرے افسانوں کی پہچان کرنے کے لئے ہیں اُردو کے Contemporary افسانوں کے پسِ منظر میں بات چلانی ہوگی اور اُن تمام کلیوں اور قاعدوں کو مدنظر رکھنا ہوگا جن کی کسوٹی پر پورا اُترنے کے بعد ہی کوئی افسانہ اچھا یا برا کہلایا جا سکتا ہے۔ مگر یہ مضمون ایک پیشہ ور نقاد سے نہیں لکھا یا جا رہا ہے جیسا کہ اُوپر ذکر آیا ہے۔

اس دَور میں نور شاہ کے افسانوں کے دو مجموعے ’’بے گھاٹ کی ناؤ‘‘ اور ’’ویرانے کے پھول‘‘ اور ایک ناول ’’نیلی جھیل کالے سائے‘‘ شائع ہوئے ہیں۔ ان دونوں افسانوی مجموعوں میں ہمیں نور شاہ کی دونوں طرح کی کہانیاں ملتی ہیں کامیاب بھی اور وہ بھی جو زیادہ کامیاب نہیں ہیں۔ ان میں بن برسے بادل، نلنی، گلاب کا پھول، اندھے خواب، بوٹ کی آخری رات، اجنبی سمندر اور لڑکی، ویرانے کے پھول، ادھوری کہانی وغیرہ افسانے قابل ذکر ہیں۔

ان افسانوں کے پسِ منظر میں نور شاہ ایک ایسے ادیب کی حیثیت سے اُبھرتا ہے جس کا ذہن رومانی ہے اور جو رومان کے تانے بانے سے ایک ایسی فضا خلق کرتا ہے جس میں اس کے کردار نیم الف لیلوی لگتے ہیں۔ مگر ایک بات جو واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ اُس کی طرز تحریر ہے جو الیبلی ہونے کے ساتھ ساتھ کئی پھٹی ہے اور وہ جذبہ ہے جو ہر بُرائی سے پہلو بچاتا ہوا دنیا کی خوبصورتی کی تلاش میں بھٹکتا رہتا ہے۔

میری نظر میں نورشاہ ایک ایسی روح ہے جو ازل سے خوبصورتی کی تلاش میں سرگرداں ہے مگر اس تلاش میں نورشاہ نے فن کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ ان افسانوں میں نورشاہ نے زیادہ تر توجہ ماحول اور اُس کی تربیت پر، کرداروں کے باہمی ربط اور اندازِ بیان پر دی ہے اور اس توجہ میں تکنیک اور ٹریٹمنٹ میں کوئی نیا تجربہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ مجموعی طور پر نورشاہ کے دور کی لکھی ہوئی کہانیاں اگر ایک طرف اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ایک قابلِ توجہ افسانہ نگار معرض وجود میں آیا ہے تو دوسری طرف ان میں کوئی ایسی خصوصیت نظر نہیں آتی کہ جس کی بنا پر انہیں غیر معمولی کہا جا سکے۔

نورشاہ کے افسانوں کا دوسرا دور ''لمحے اور زنجیریں'' سے شروع ہوتا ہے جب میں نے یہ کہانی پڑھی تو میں چونک اُٹھا۔ اس میں چونکا دینے والی بات ہی تھی۔ میں پہلے دو ایک سال سے اظہار کی اُلجھنوں میں گرفتار ہوں اور احباب کے ساتھ مسئلہ کئی مرتبہ زیرِ بحث آیا ہے۔ اُردو افسانہ اب اس موڑ پر آ گیا ہے جہاں اظہار کی نئی راہیں تلاش کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ انسانی فطرت کے نت نئے موڑ، انسانی دماغ کی پیچیدگیاں اور لاشعور کے Dimensions کو صفحہ قرطاس پر لانے کے لئے ایک ادیب کی کم مائیگی شاید اس بات کی محرک ہو۔ بہرحال یہ بات ہم لوگ کئی مرتبہ زیرِ بحث لا چکے ہیں اور اُردو افسانے میں چند تجربے کئے بھی گئے ہیں جن میں پروفیسر خلیل احمد کا 'جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے'' قابلِ ذکر ہے۔ حال ہی میں ''آگ کا دریا'' اسی طرح کے اظہار کی ایک واضح مثال ہے۔ اس لئے جب میں نے نورشاہ کا یہ افسانہ پڑھا تو میں چونک اُٹھا۔ اس کے بعد نورشاہ کے چند اور افسانے ''ایک رات کی ملکہ''، ''مونالیزا''، ''تاریک راتوں کے فرشتے'' میری نظر سے گزرے اور میں اُن کے فن کا قائل ہو گیا۔ یہ افسانے نورشاہ کی نئی کتاب ''ایک رات کی ملکہ'' میں شامل ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے کشمیر کے بہت ہی کم ادیبوں نے اظہار کے اس مسئلے کو سمجھ کر ایسے کامیاب تجربے کئے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ نورشاہ کتنا ذہین اور محنتی افسانہ نگار ہے۔ انسان کے دماغ کی وہ بلندیاں اور وہ پستیاں جہاں فرشتے بھی پاؤں دھرنے سے ڈر محسوس کرنے لگیں، ان

افسانوں میں اس کامیابی سے پیش کی گئی ہیں کہ ہم اب نور شاہ کو محض ایک اُبھرتا ہوا افسانہ نگار نہیں کہہ سکتے ___ ان میں نور شاہ نے ایک خاص ڈھنگ کو اور ایک خاص ٹریٹمنٹ کو اپنایا ہے جو اسے ایک منفرد مقام بخشنے کے لئے کافی ہے۔

نور شاہ کی افسانوی زندگی کا آغاز صرف چند سال پہلے ہوا ہے مگر جس لگن اور جس محنت سے اُنہوں نے کام کیا ہے اور جو نتیجے اس لگن اور محنت سے برآمد ہوئے ہیں اُس نے نور شاہ کو اپنے بیشتر ہم عصروں سے آگے بڑھا دیا ہے۔

نور شاہ ایک معصوم چہرے اور پر نور شخصیت کا مالک ہے۔ اس کے بظاہر پُرسکون اور پُرامن سراپا کو دیکھ کر بہت سے آدمی دھوکا کھا سکتے ہیں۔ کیونکہ نور شاہ نے اپنے اندر کی اضطرابی کیفیت اور اپنے تجسس اور اپنی تڑپ کو بھی اپنے چہرے پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ یہ آدمی جب بات کرتا ہے تو لگتا ہے جیسے بات نہیں کر رہا ہے کوئی سحر پھونک رہا ہے۔ نور شاہ کو بہت کم غصے کی حالت میں دیکھا گیا ہے۔ بہت کم یہ کسی ادبی، سیاسی، سماجی یا مذہبی مسئلہ پر بحث کرتے دیکھا گیا ہے۔ اس کے سراپا پر ہر وقت ایک ایسی کیفیت طاری رہتی ہے جیسے یہ شخص دائمی خواب دیکھتا رہتا ہو۔ اس خواب کی تعبیر کیا ہے یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ یہاں کوئی اندازہ کام نہیں کر سکتا۔ نور شاہ کی اس بظاہر پرسکون زندگی میں کیسے کیسے موڑ آئے۔ ان کے بارے میں بھی کوئی آدمی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں نور شاہ کی نظر بہت دور تک جاتی ہے اس کی وجہ اُس کے ارد گرد کا ماحول ہے۔ نور شاہ اس ماحول میں رہتا ہے جہاں صرف پستیاں اور بلندیاں ہیں اور بیچ کا ایک بھیانک خلاء ہے۔ یہاں وہ ہانجی طبقہ ہے جو سردیوں کے برفیلے اور ٹھٹھرنے والے دن اپنی اپنی کشتی کے سروں پر مغموم انداز میں بیٹھے ہوئے اس اُمید پر گُزارتے ہیں کہ بہار کے آنے کے ساتھ ہی وہ سیاح آنے شروع ہو جائیں گے جن کے دلوں میں جنت کی تمنا ہوتی ہے اور پھر ان کو بھی روزگار ملنے کا موقع ملے گا۔ یہاں وہ دولت مند طبقہ بھی رہتا ہے جو بیرومیٹر کے پارے سے بے نیاز اپنے دن اُن گلابی ڈرائنگ روموں میں گزارتا ہے جہاں گناہ اور ثواب کی تمام حدیں معدوم ہو جاتی ہیں اور نور شاہ ہمیں ان گلابی ڈرانگ روموں کے

اندر لے جاتا ہے۔ اُن سرحدوں سے روشناس کراتا ہے کہ جن کے اِدھر اُدھر کوئی دنیا نہیں۔ کوئی دنیا میں غم کا ساتھی نہیں۔ صرف جان کی مہک ہے اور رمبا سمبا کے ناچ ہیں۔ نور شاہ کو ان دونوں طبقوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور وہ اپنے افسانوں میں بار بار چلاتے ہیں کہ یہ مسخ شدہ چہرے، یہ گلابی ڈرائنگ روم، یہ چمکتی کاریں دراصل وہ نہیں جو یہ بظاہر لگتی ہیں، ایک رات کی ملکہ، ایک رات کی بات، کمرہ نمبر ۱۳، اور آشیاں میں یہ بات نہایت چابکدستی سے سامنے لائی گئی ہے۔

مگر ان گھناؤنی تصویروں میں رنگ بھرتے بھرتے نور شاہ کا ذہن قنوطی نہیں ہوا ہے۔ اُس نے خطیبانہ لہجہ بھی نہیں اختیار کیا ہے اور نہ اس کے اندازِ بیان میں طنز کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ وہ بہت نرم، شیتل اور خاموش لہجے میں بات کرتا ہے اور ہنسی خوشی اُن تمام مرحلوں سے گزر کر کہانی کے اختتام تک آتا ہے، جہاں ایک دل دہلا دینے والی چیخ کی گونج دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ گر یہ ایک افسانہ نگار کی کامیابی نہیں ہے تو میرے پاس کامیابی کی کوئی اور تشریح نہیں ہے۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود نور شاہ خوبصورتی کا قائل ہے۔ اُس نے اپنے اندر کی خوبصورتی کے احساس کو بچائے رکھا ہے اور یہ اتنا شدید احساس ہے کہ کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ نور شاہ Optimist ہے اور ہر بدصورتی میں خوبصورتی ہی دیکھ سکتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے نور شاہ کے افسانے بغور پڑھے ہیں، وہ مجھ سے اتفاق کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کریں گے کہ نور شاہ ایک خوبصورت دنیا کا خواہاں ہے، ایک سچی اور ایماندار دنیا کا حامی ہے۔ اور اس لئے ہر اُس بدصورت بُت کو توڑتا ہے جو بظاہر خوبصورت تو ہے مگر اپنے اندر بے پناہ غلاظت چھپائے ہوئے ہے۔

نور شاہ کے افسانوں کی عمر کم ہے مگر اس کی کم عرصے ہی میں نور شاہ نے اپنی محنت، لگن اور تندہی سے اپنے لئے ایک جگہ بنا لی ہے۔ یہ صرف کشمیر کے اُردو افسانہ نگاروں میں ہی نہیں بلکہ ملک کے جدید تر افسانہ نگاروں میں بھی اور یہ وہ مقام ہے جہاں نور شاہ کے ہمعصر ادیب اسے محبت، مسرت اور رشک کے ملے جلے جذبے سے دیکھتے ہیں۔ ●●●

(نوٹ: یہ مضمون پشکر ناتھ نے ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی میں نور شاہ کے حوالے سے تحریر کیا تھا۔)

●......پروفیسر قدوس جاوید

نور شاہ: معاصر دور کا قد آور افسانہ نگار

بیانیات (Narratology) کے تقاضوں کے مطابق، افسانے کا افسانہ ہونا ضروری ہے۔نوعیت کے اعتبار سے افسانے کا متن رومانی ہے یا حقیقت پسندانہ، سادہ وسہل ہے یا علامتی واساطیری اس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے، لیکن اس کلیے کا اطلاق اسی افسانہ نگار کے افسانوں پر ہوسکتا ہے جو افسانہ لکھتا نہیں، اپنے پورے وجود کے ساتھ افسانہ ''جیتا'' ہے، کیوں کہ افسانہ/ ناول محض لسانی وادبی اظہار نہیں، فکشن نگار کے وجود کے اندر اور باہر کی زندگی اور زمانہ کے مضمرات وامکانات کو اپنے تمام تر تخلیقی اور دانشورانہ امکانات کے ساتھ جینے کا فنی و جمالیاتی وسیلہ ہوتا ہے۔اسی لئے آج کی تاریخ میں، دیگر اصناف کے مقابلے میں سب سے زیادہ ''سماج مرکز'' افسانہ اور ناول ہی ہیں، ہاں، چونکہ افسانہ/ ناول کی بھی اپنی شعریات ہوتی ہے۔لہٰذا ہر معتبر افسانہ نگار کے یہاں (جیسا کہ نور شاہ ہیں) جینے کے کسی بھی عمل اور انداز کے بیان میں اس شعریات کے احترام کے ساتھ اس کی تخلیقیت (Creativity) کے انفراد وامتیاز کا چھڑکاو بھی لازمی طور پر سامنے آتا ہے۔

نور شاہ نے کم وبیش نصف صدی سے زائد عرصے کو محیط اپنے ادبی سفر کے دوران کتنے افسانے لکھے یہ غالباً نور شاہ کو بھی یاد نہیں ہوگا لیکن تقسیم ملک کے آس پاس سے لے کر آج 2023 تک نور شاہ کی جو تحریریں تواتر کے ساتھ سامنے آرہی ہیں ان سب کو ذہن میں رکھیں تو معلوم ہوگا کہ ابتدا میں نور شاہ نے ''بیسویں صدی'' جیسے رسالوں کے لئے جو افسانے لکھے، ان میں سے بیشتر کو ''مشقِ سخن'' کے خانے میں رکھا جاسکتا ہے۔گرچہ اس ابتدائی دور کے بھی بعض

افسانے یادگار ہیں، لیکن خاص طور پر ماہنامہ کتاب لکھنؤ، شبِ خون (الہ آباد) کے علاوہ نقوش، ادبِ لطیف (پاکستان) وغیرہ رسالوں میں نور شاہ کے جو افسانے شائع ہوئے وہ بطور خاص کشمیر کی روحِ عصر کے مؤثر ترجمان ہیں اور ان کے طفیل ہی خود نور شاہ کا شمار ایک عرصہ سے اُردو کے معتبر افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔

نور شاہ کے ابتدائی افسانوں میں تخلیقِ فن کی عام روش، جمالِ فطرت سے قربت، شعورِ جسم (Body Conciousness) کی لطافت اور عام قارئین کی پسندیدگی کے سبب نور شاہ کی تخلیقیت پر حسن پرستی اور رومانیت کا غلبہ نظر آتا ہے اور بعض ناقدین کی نظروں میں رومانیت نور شاہ کے فن کی بنیادی شناخت ہے۔ نور شاہ نے اپنے افسانوی مجموعہ ''بے ثمر سچ'' میں ''اپنی بات'' کے عنوان سے اپنے تخلیقی محرکات اور میلانات پر روشنی ڈالتے ہوئے خود بھی لکھا ہے!

''میرے افسانوں کے اکثر کردار رومانوی ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے ہی پھوٹتے ہیں...... زندگی حسن وعشق سے عبارت ہے اور نسل آدم کی بقا ان ہی سے قائم ہے۔''

نور شاہ نے اشاراتی انداز میں یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے جوانی کے ایام سرینگر کے ڈل جھیل کے آس پاس اس حصے میں گزارے ہیں جہاں پہاڑ، پانی اور سبزہ بیک وقت نظر آتا ہے، وادی کے اسی حصے میں میرے احساسِ جمال کی پرورش ہوئی۔

دراصل یہ ایک نفسیاتی سچ ہے۔ مشہور ساختیاتی مفکر رولاں بارتھ (Barth Rolland) کا قول ہے کہ ''کوئی بھی جینوین فنکار خواہ جتنی بھی کوشش کیوں نہ کرے اپنے معاشرہ اپنی ثقافت کی جانب سے آنکھیں بند کر کے عمدہ فن پارے کی تخلیق نہیں کرسکتا۔ ژولیا کرسٹیو (Julia Kristeva) نے بھی اپنی تحریر (The Desire of Language) میں کسی بھی متن، لفظ یا نظام (System) کی تشکیل کے ضمن میں انسانی ذہن کے تخلیقی رویوں سے بحث کرتے ہوئے لاشعور کی کارکردگی سے متعلق فرائیڈ کے بیان کردہ دو مرحلوں (Displacement) اور (Condensation) میں اپنی جانب سے ایک تیسرے مرحلے Passage ہے کی نشاندہی کی ہے اور کہا ہے کہ لاشعور کا یہ مقام Passage کسی بھی فنکار کے فن کے رنگ، رجحان، مزاج

اور میلان کو سمت عطا کرتا ہے اور اسی کے سبب کسی کی تخلیق، رومانی یا حقیقت پسندانہ، انقلابی، مذہبی، اصلاحی یا ثقافتی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ Passage ٹھوس اور جامد نہیں، سیال اور تغیر پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ نور شاہ ایک عرصہ تک فطرت پسندی، حسن پرستی اور معاملاتِ عشق کے حوالے سے جسم و جان کے رومانی اسرار میں الجھے رہے اور عام قارئین کی پذیرائی، شہرت اور مقبولیت کے سبب ایک عرصہ تک انہوں نے رومانیت کا حصار توڑنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی بلکہ بعض افسانوں میں نور شاہ کا رومانی مزاج شعور کے حوالے سے ''غیر ضروری طور پر'' جنسیت کی حدوں کو چھوتا نظر آتا ہے، مثلاً

''......دونوں نیم عریاں جسم فرش کی سطح پر اور بھی پھسل جاتے ہیں۔ حسن بہکنے لگا ہے، دھڑکنیں سلگنے لگی۔ سانسوں سے آگ برسنے لگی ہے......میرا جسم برف کا ڈھیر ہے......میرے جسم کی ساری گرمی پر یا کے جسم میں منجمد ہو چکی ہے۔''

لیکن جنسیت کی ایسی چند ایک مثالوں کے باوجود منٹو کی طرح نور شاہ کو بھی جنس نگار نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی نور شاہ اپنے عمومی سیاق و سباق میں جنسیت کو فروغ دینے سے دلچسپی رکھتے ہیں حالانکہ اولادِ آدم کی سرشت میں جنس ایک لازمہ ہے لیکن تہذیب و توازن شرط ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے نور شاہ کے اس طرح کے افسانوں کے حوالے سے کہا ہے۔

''بلاشبہ بدن اور اس کے لہو میں جنسی ہیجان سے جو تپش پیدا ہو جاتی ہے وہ زندگی کے سچے جنوں کی دین ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر بڑا افسانہ نگار اقدار زندگی کے پیش نظر اظہار خیال میں توازن رکھتا ہے اور یہی اس تخلیقی فن کار (نور شاہ) کی کامیابی ہے۔''

لیکن یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہر جینوین شاعر یا ادیب کسی مخصوص موضوع، اسلوب اور میلان کا مستقل پابند نہیں ہوتا، ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ ہر عہد کے اپنے تقاضے Episteme ہوتے ہیں جن سے چاہتے ہوئے بھی شاعر یا ادیب منہ نہیں موڑ سکتا۔ دراصل آزادی/تقسیم ملک کے آس پاس سے ہی ادب بالخصوص فکشن میں جذبہ و احساس اور تخیل و تصور پر محسوس یا نا محسوس طور پر ارضیت کے حوالے سے فکر و دانش، تجربہ و مشاہدہ اور تجزیہ و تحلیل کا غلبہ شروع ہو گیا تھا۔

کشمیر کی سماجیات، سیاست، معاشیات اور ثقافت میں جو غیر متوقع اتار چڑھاؤ پیدا ہوئے اس کے سبب ساٹھ سال کے عرصے کو محیط کشمیر کا یہ پورا زمانہ گویا رنج والم، جبر وزیادتی کا گواہ بن گیا۔ ایک وقت تھا جب دوسروں کی طرح نور شاہ کے لئے بھی کشمیر بہشت تھا، جہاں ہر چہار طرف زندگی امن و آشتی اور حسن و عشق سے عبارت تھی۔ بیسویں صدی کے اخیر تک نور شاہ کے اکثر و بیشتر افسانوں میں جس احساس جمال کے مرقعے یہاں وہاں نظر آتے ہیں وہ ان کے رومانی اور جمالیاتی مزاج (Aesthetic Passage) کا پرتو ہیں:

''کشمیر کی ہر چیز قابل تعریف ہے۔ ہری بھری شاداب وادی، سندر دھرتی ...... پہاڑ جن کی گود میں ہرے بھرے جنگل ہیں جو آگے آگے پھیل کر ایسی شکھر مالاؤں میں بدل جاتے ہیں جہاں بارہ مہینے برف کا راج رہتا ہے۔ یہاں کے بہتے ہوئے پانی کا رنگ نیلا ہے، سبز ہے۔ یہاں پھولوں سے جڑی ہوئی مرگیں ہیں۔ رنگ برنگے پھولوں سے سجے سنورے تختے ہیں جن کی خوشبو میں سیاحوں اور یاتریوں کی سانسیں رچی بسی ہیں۔ یہ گلمرگ، یوس مرگ، پہلگام ہے یہ شالیمار ہے اور یہ نشاط ہے نور جہاں کے خوابوں کا باغ...... یہ کل کل کرتی ندیاں، ...... بید کے پیڑوں کی قطاریں، چنار کے پتوں کا لال رنگ......سفیدے کے لمبے لمبے پیڑ......''

(افسانہ۔ اندھیرے اُجالے)

''سامنے کی کھڑکی کھول دو تو جھیل کے پانیوں سے ہنستے کھلتے کنول کے پھول......ہاؤس بوٹوں کی لمبی قطاریں، ڈوبتے اُبھرتے سورج کا منظر نگاہوں میں اُتھل پتھل مچا دیتا ہے خاموش راتوں کی چاندنی میں پری محل کے کھنڈرات سے ان دیکھی پریوں کے گیت سنائی دیتے ہیں۔''

(افسانہ۔ بے جڑ پودے)

لیکن جیسا کہ جون توسا (Jahn Tusa) نے اپنی تحریر Art Matters میں کہا ہے:

''سچے ادیب کا فن منجمد اور یک رنگ نہیں ہوتا۔ وقت، زندگی اور زمانہ کے تغیرات کے ساتھ اس کے فن میں بھی روانی، تازگی اور تہہ داری پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اپنے گرد و پیش کی آوازوں کو گرفت میں لینا، گزرے ہوئے تجربوں کو یاد رکھنا اور ہجوم کی بے چہرگی، بے سمتی اور کٹرپن (Dogmatism) کو

تحلیل کرتے ہوئے اپنی فنکارانہ انفرادیت کو برقرار رکھنا ادیب کی عظمت کی دلیل بھی ہے اور مجبوری بھی۔ یکسانیت ادب میں ہو یا زندگی میں، بہر حال اُکتاہٹ پیدا کرتی ہے۔''

چنانچہ جب کشمیر کے مقدر میں ویرانیوں کی در اندازی ہوئی، جہلم اور ولر کے پانی کا رنگ سرخ ہوا اور فضاؤں میں سیبوں اور ناشپاتیوں کی خوشبوؤں کی جگہ بارود کی بو نے گھیر لی تو زندگی کی طرح ادب کے تخلیقی اور فکری سروکاروں اور اظہاری رویوں میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں جس کے سبب رومانیت اور تصوریت کے دلدادہ نور شاہ کا فن بھی قتل وخوں، آبروریزی اور عدمِ تحفظ کے زائیدہ کشمیر کے نئے ڈسکورس کے حوالے سے بیانیہ (Narration) کے ایک نئے سانچے میں ڈھل گیا اسے حقیقت پسندانہ سماجی وثقافتی بیانیہ (Realistic Socia.cultural Narration) کہہ سکتے ہیں، ان میں فنی و جمالیاتی عناصر موجود ہیں جو افسانہ کو افسانہ بناتے ہیں البتہ انہیں اگر ''ٹریجڈی کی جمالیات'' کا نام دیا جائے تب بھی نور شاہ کی ایسی افسانویت پر حرف نہیں آئے گا۔ ''خواب بھی بکتے ہیں''، ''کرب ریزے''، ''سوداگر''، ''کوئی رونے والا نہیں''، ''دِل ویراں میں کیا غم'' وغیرہ افسانے اس کی مثالیں ہیں۔

دراصل کوئی بھی معتبر، مشاق اور جینوین فنکار اپنی تخلیقیت اور اپنی بصیرتوں کا اظہار خالصتاً اپنی منشا سے نہیں ''وقت'' کے دباو اور مطالبات کی بنا پر بھی کرتا ہے۔ رولاں بارتھ کا یہ قول (Writing writes not author) زبان کے مروجہ لسانی نظام اور اظہاری رویوں کے تناظر میں درست ہوسکتا ہے کہ لیکن ایلس مزو کو، جس طرح جنوبی اونٹاریو کے لوگوں کے دکھ درد، غربت وافلاس پر مبنی کہانیوں کے مجموعے (I meaning to tell have been something) پر ۲۰۱۳ء کا نوبل انعام دیا گیا اور اس کے جو اسباب بتائے گئے ہیں ان کی بنا پر اگر یہ کہا جائے کہ Time writes not authors تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ نور شاہ نے ایک Rational افسانہ نگار کے طور پر وقت کے رواج، مزاج اور مطالبہ کے مطابق شعور وسرورِ بدن اور رومانیت پر مبنی افسانے ضرور لکھے، ایسے افسانوں میں حسن وعشق کی سحر کاری ہے۔ الفاظ وتراکیب، تشبیہات و استعارات کے انتخاب اور برتاؤ کا ماہرانہ سلیقہ ہے۔ موضوع، واقعہ اور کردار کے حوالے سے

متنوع اور موزوں ترین فقرے تراشنے کی غیر معمولی خاصیت ہے۔ بیان میں منٹو کی جیسی وہ Irony ہے جس میں شگفتہ معنوی تہہ داری بھی ہے اور جارحانہ نشتر زنی بھی۔ نور شاہ کسی مخصوص سیاسی نظریہ، سماجی تصور کی حمایت یا مخالفت نہیں کرتے۔ادب کے کسی گروہ سے بھی وابستہ نہیں۔ (اور غالباً اسی لئے ابھی تک انہیں کسی بڑے انعام سے نوازا نہیں گیا ہے) نور شاہ کے فنی و جمالیاتی لسانی وفکری امتیازات اتنے روشن اور امکانات سے پر ہیں کہ معاصر اُردو افسانہ نگاروں میں غالباً چند ایک کو ہی نور شاہ کے مدِ مقابل رکھا جاسکتا ہے۔

............●●● ....

۱

●...... پروفیسر مجید مضمر

نور شاہ...... دلچسپ شخصیت کا مالک

شاعر یا ادیب کو اپنی تخلیق بڑی عزیز ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی یہ تمنا کسی تعجب کا باعث نہیں کہ ہر کوئی اس کے بلکہ اسی کے بارے میں لکھے۔ تعجب تو جب ہوتا جب وہ خود دوسروں کے خصوصاً اپنے معاصرین کے بارے میں لکھے اور اُن کی سراہنا بھی کرے۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب تخلیق کاروں کے تئیں ادبی مورخین و ناقدین قارئین کا رویّہ اس قدر خاموشی کا ہو کہ یہ تخلیق کار کو خود ہی تنقید و تحقیق کا بھی بار اُٹھانے کی غیرت دلائے۔ کشمیر میں اُردو شعر و ادب کے ساتھ کچھ ایسی ہی واردات گزری ہے۔ اگر عبدالقادر سروری دکن سے یہاں آ کر ''کشمیر میں اُردو'' تصنیف نہ کرتے تو یہاں کے نہ جانے کتنے شاعر اور ادیب قعرِ گمنامی میں پڑے ہوتے اور ان کا کوئی نام لیوا نہ ہوتا۔ سروری مرحوم کی تصنیف کے تحقیقی استناد اور تنقیدی اعتبار سے متعلق بحث کی گنجائش ہو سکتی ہے اور ہے لیکن اسے اب تک کشمیر کے اُردو شاعروں اور ادیبوں کے پہلے اور آخری مبسوط تذکرے کی حیثیت حاصل ہے۔ سروری کا یہ مخلصانہ تحقیقی کام ہمارے لئے ترغیب و تشویش کا باعث بننا چاہیے تھا لیکن اس کے لئے ان ہی کے جیسے جذبے خلوص اور جنون کی حد تک لگن کی ضرورت تھی۔ آج کی تاریخ میں اگر یہ جذبہ اور لگن کسی کے پاس ہے تو وہ نور شاہؔ ہیں اور اس کا ثبوت ہے ان کی کتاب ''جموں و کشمیر کے اردو افسانہ نگار''۔

نور شاہؔ ہماری ریاست کے نامور اور معتبر افسانہ نگار ہیں۔ صنفِ افسانہ کے ساتھ پردیسی، در، ٹھاکر پونچھی اور پشکر ناتھ جیسے ادیبوں کی وابستگی کے باعث ریاست میں اُردو

افسانے کی جو روایت پروان چڑھی، نور شاہؔ اس کے سب سے بڑے امین ہیں، کم از کم اس معنی میں کہ انہوں نے افسانے کے ساتھ اپنی وفاداری کو بشرط استواری نبھایا۔ افسانے کے میدان میں وہ شاہدہ شرین کے فرضی نام سے اترے تھے اور ہمارے طالب علمی کے زمانے میں اس واقعے کے تعلق سے کئی رنگین قصے مشہور تھے لیکن نور شاہؔ کے کام کو ہم ان کے اصلی نام سے ہی جانتے اور مانتے ہیں۔ رومان سے حقیقت تک کے سفر میں نور شاہؔ کا تخلیقی برتاؤ ریاست میں اُردو افسانے کو ہیئتی اور موضوعاتی سطح پر کئی نوع کے تجربات سے آشنا کرتا رہا اور اُردو افسانے کے مجموعی/ عالمی سرمائے میں یہاں کے خارجی اور داخلی منظر کے حوالے سے اسے ایک انفراد عطا کرتا رہا۔ بے گھاٹ کی ناؤ سے لے کر آسمان پھول اور لہو تک ان کے چھ افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ''بند کمرے کی کھڑکی'' کے نام سے ادبی ڈائری اور ''کہاں گئے وہ لوگ'' کے ناموں سے خاکوں کے مجموعے کے علاوہ ان کے چار ناول بھی منظر عام پر آچکے ہیں اور اطمینان کی بات یہ ہے کہ ان کا تخلیقی سفر پہلے کی طرح جاری ہے۔ ریاست میں اُردو زبان کو اپنا آئینی اور جائز حق دلانے کے سلسلے میں جو کوششیں پچھلے چند برسوں سے جاری ہیں نور شاہؔ ان میں پیش پیش ہیں۔ سرکاری وعدوں کے باوجود جب اُردو کے لئے الگ سے اکادمی کے قیام کی صورت نہ نکلی تو نور شاہؔ نے چند ادیبوں اور ادب دوستوں کو ساتھ لے کر خود ہی غیر سرکاری سطح پر اُردو اکیڈیمی کا قیام عمل میں لایا جو ریاست میں اُردو زبان کے حق میں ایک نئی تحریک کا حکم رکھتی ہے۔

ادھر ایک عرصہ سے ایک مقامی اُردو اخبار میں ''جموں وکشمیر کے اُردو افسانہ نگار'' عنوان کے تحت نور شاہؔ کا مستقل کالم شائع ہوتا رہا جسے وہ کتابی صورت میں منظر عام پر لا رہے ہیں۔ اس میں ریاست کے اُردو افسانہ نگاروں کا مختصر مگر جامع تعارف بھی ہے اور ان کے فن پر تبصرہ بھی۔ اس کا سبب غالباً وہی غیرت ہے جو ادبی مورخین اور ناقدین کی خاموشی کے نتیجے میں تخلیق کار کو خود ہی مورخ اور ناقد بننے پر مجبور کرتی ہے اور جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ریاست کی اُردو شاعری سے متعلق چند اچھی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں لیکن اُردو افسانے کے سفر یا افسانہ نگار کے تعلق سے اب تک کوئی کام ایسا نہیں ہوا ہے جو ریاست کے اُردو

افسانے کی تاریخ یا تذکرے کا حکم رکھتا ہو۔اس اعتبار سے نورشاہ کی یہ کتاب ایک قابل قدر کوشش ہے۔اس کی ایک دستاویزی اہمیت بھی ہے کہ یہ شروع سے اب تک کے افسانہ نگاروں کی تصویروں کی ایک نمائش ہے۔ ہر تصویر منفرد ہے...... اپنے الگ رنگ اور اپنے جدا پس منظر کے ساتھ۔تصویروں کا یہ البم ریاست کے اُردو افسانے کے پیچ وخم کو بھی ظاہر کرتا ہے اور افسانہ نگاروں کے احوال وکوائف سے بھی واقف کراتا ہے۔میرے خیال میں کل کے ادبی مورّخ کے لئے یہ دستاویز ایک اہم سرچشمہ ثابت ہوگی۔

............●●● ....

● ...... وحشی سعید

نور شاہ اور میں

جب میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا تو ان دنوں نور شاہ کا تعارف ''بیسویں صدی'' کے توسط سے ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ماہنامہ ''بیسویں صدی'' میں اردو کے بڑے بڑے ادیب نظر آتے تھے، شاید ہی کوئی اس بات سے منکر ہوسکتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی ترویج میں 'بیسویں صدی'' کا کوئی خاص رول نہیں رہا ہے۔ اُسی زمانے میں بیسویں صدی میں نور شاہ کا طوطی بولتا تھا۔ ہم جیسے اردو کے نئے لکھنے والوں کے لئے نور شاہ کی مقبولیت باعثِ رشک تھی اور نئے لکھنے والوں کے لئے وہ کسی ہیرو سے کم نہ تھے۔ حالانکہ اُس زمانے میں بہت سارے ادبا، شعراء اور افسانہ نگار اپنے آپ کو ترقی پسند تحریک کے ساتھ منسلک ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے لیکن میری سمجھ یہ کہتی ہے کہ ادب کو حصوں میں بانٹا نہیں جاسکتا۔

ابھی میں ایس پی کالج میں ہی زیر تعلیم تھا کہ رسالہ ''نگینہ'' کو سرکاری رجسٹریشن ملا۔ اُن دنوں نور شاہ کے برادر اصغر بشیر شاہ میرے بہت قریب آگئے تھے اور رسالہ ''نگینہ'' میں بشیر شاہ کے مضامین چھپنے لگے۔ بشیر شاہ ہر بار یہی شرط دہراتے کہ اُن کے مضمون کو پوری اہمیت کے ساتھ چھاپا جائے تاکہ وہ اگلی بار نور شاہ کی ایک غیر مطبوعہ کہانی 'نگینہ' کے لئے لائیں گے۔ اس بات کا ''نگینہ'' کے ایک پرانے شمارے میں ذکر بھی ہے۔ اُس دور میں بھی نور شاہ نگینہ میں چھپتے رہے۔

ایک وقت ایسا بھی گزرا جب ترقی پسند ادب بہت زیادہ بور کرنے لگا اُس لمحے اردو ادب میں رومان پرور افسانے ایک نئے آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آنے لگے۔ اردو ادب کے لئے یہ تبدیلی نہ صرف خوشگوار تھی بلکہ افسانے اور بالخصوص رومان پسند افسانے قارئین بہت پسند

کرتے تھے۔ایسے پسِ منظر میں نور شاہ ایک بڑا نام بن کر اُبھرے۔یہ وہ دور تھا جب ابن صفی کی جاسوسی ناولیں اردو میں عروج پر تھیں حالانکہ ہمارے بہت سارے ادباء کو یہ شکایت رہی کہ جاسوسی ناولیں ادب کا حصہ نہیں ہیں لیکن میرے نزدیک کوئی بھی کہانی ہو، کسی بھی قسم کی کہانی ہو، اگر کہانی کار اپنے فن میں کمال رکھتا ہو، اپنے انداز بیان اور پیش کش پر ید طولیٰ رکھتا ہو تو وہ یہ جاسوسی ناول ہوں یا کچھ اور ہو ادب کا حصہ بھی بن سکتی ہے۔نور شاہ رومانیت سے لبریز اپنے افسانوں میں نہ صرف باکمال کہانی کار بن کر اُبھرے بلکہ وہ ان میں رومانیت کی ایسی جادوگری ہیں کہ ہم اُس سحر سے آج تک باہر نہیں آسکے۔اس طرح نور شاہ اردو ادب کی افسانوی دنیا میں ایک شخصیت بن کر نئی نسل کی تربیت کرنے میں مصروف عمل ہو گئے، جس کا اعتراف مقامی سطح کے بھی افسانہ نگار کرتے ہیں۔اُن کے فن کا یہ کمال ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والے کو اپنی کہانی کی گرفت میں باندھے رکھتے ہیں۔

میں اپنے وطن کشمیر سے بہت عرصے تک دور رہا۔زر معاش کے لئے بدیشوں کی خاک چھانتا رہا۔جب وطن واپس آیا تو ایک روز اپنے ہوٹل کی ایک تقریب میں نور شاہ کو اپنے سامنے پایا۔انہوں نے اپنی کتاب ''کشمیر کے اردو افسانہ نگار'' مجھے پیش کی۔اس کتاب میں نور شاہ نے جس محبت سے کشمیر کے مایہ ناز افسانہ نگاروں کے ساتھ میرا بھی ذکر کیا ہے وہ میرے دل کو چھو گیا اور میرے لئے ایک نئی ادبی اُمنگ کا مژدہ ثابت ہوا۔یہاں سے ہماری دوستی کی شروعات ہوئی۔اور نور شاہ کی کوشش سے ہی رسالہ ''نگینہ'' پھر سے نئی آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اس میں نور شاہ کا بھی ایک اہم رول ہے۔نور شاہ کی افسانہ نگاری کا میں ہمیشہ ایک مداح اور پرستار رہا ہوں لیکن میرے لئے اُن کی دوستی زیادہ اہم اور انمول ہے۔

........●●●........

● ...... راجہ نذر بونیاری

نورشاہ: افسانوی افق کا تابناک ستارہ

بیسویں صدی کے وسطی دور میں اُردو کے نثری ادب میں افسانے کو غیر متوقع قبولیت حاصل ہوئی۔ اگر منشی پریم چند اس زمانے میں بقید حیات ہوتے تو انہیں بھی یقین نہ آتا۔ پریم چند نے افسانہ نگاری کو حقیقت نگاری بنا دیا تھا اور یہ اعزاز اس فن کو کسی اور زبان میں حاصل نہ تھا۔ گزشتہ ۷۰ سالوں میں افسانہ اپنے آرٹ، تکنیک اور تھیم کے اعتبار سے کئی مراحل سے گزرا ہے۔ اس درمیان افسانہ موضوع اور مواد کے اعتبار سے پریم چند سے بہت آگے بڑھ گیا۔ ساٹھ کی دہائی میں اینٹی (Anti) لفظ کا چلن عام ہوا ہے۔ اسٹوری کی جگہ اینٹی اسٹوری نے لے لی ہے اور اینٹی ناول بھی لکھا جانے لگا۔ بعض ناقدین ادب نے یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ کہانی سے ہیرو کا جنازہ نکل چکا ہے اور یہ زمانہ اب صرف اینٹی ہیرو کا ہے۔ لیکن آج بھی ایک اچھی کہانی کی پہچان نہ تہذیبی فضاء میں ہے نہ کردار کے بیان میں نہ سمبالک (علامتی Symbolic) طرز میں بلکہ اچھی کہانی وہ ہے جو اپنے لکھنے والے کے اندر ابھری ہو اور اس میں اس کا دور اُس کے ارد گرد کی پوری زندگی بولتی ہو۔

کہانی اور کہانی کار کے درمیان ایک کھرا رشتہ ہوتا ہے اور یہی رشتہ ہمیں برصغیر میں اُردو کے ایک معروف افسانہ نگار نورشاہ کی تخلیقات میں ملتا ہے۔

نورشاہ نے میرے تخمینے کے مطابق کم سے کم پانچ سو کہانیاں اور ۵۰ سے ۶۰ ڈرامے تحریر کئے۔ نورشاہ اور اُردو افسانے میں بھی محض تیس سال کا فرق ہے۔ یعنی جب اردو افسانہ عالم

شباب میں قدم رکھ رہا تھا نور شاہ جوان ہو چکا تھا۔ پتہ نہیں کیوں انہوں نے شاہدہ شریں کے فرضی نام سے لکھنا شروع کیا۔ شاید خود کسی رومانی کہانی کا کردار بننا چاہتے تھے اور اپنی اس کوشش میں وہ بغیر محنت کے کامیاب ہو گئے۔

انہوں نے جہاں تک میری یادداشت کا سوال ہے ''دلنی'' کے تحت ایک رومانی کہانی لکھی جو فلمی وادبی ماہنامہ ''شمع'' نئی دہلی کے جنوری ۱۹۵۸ء کے شمارے میں شاہدہ شریں کے نام سے شائع ہوئی اور یہ شمارہ آج تک میرے پاس موجود ہے اور اس وقت میرے سامنے موجود ہے۔ یہ ایک مختصر افسانہ تھا جو دو ہی صفحات میں مکمل تھا۔ بعد میں یہ افسانہ انہوں نے اپنے افسانوی مجموعے میں شامل کر لیا۔

نور شاہ پچاس کی دہائی سے من چلے اور من جلے قارئین کے دلوں کی دھڑکن بن گئے تھے اور بہت سے دل پھینک قسم کے قارئین نے انہیں ان کی کہانیوں کو صرف اس لئے پسند کیا اور دل کھول کر داد دی کیونکہ وہ اس وقت نور شاہ نہیں بلکہ شاہدہ شریں تھے اور انہوں نے ''شاہدہ شریں'' کے نام خطوط میں اپنے دل تحفے کے طور بھیجے۔ نور شاہ کو ان خطوط سے مزید لکھنے کی تحریک ملی کیونکہ انہیں اسے پلاٹ اور کردار بے تحاشہ مل رہے تھے جنہیں انہوں نے خود اپنے قلم سے تراشا تھا اور جو اُن کی اپنی ''ایجاد'' تھے۔

نور شاہ بنیادی طور پر ایک شاعرانہ ذہن رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب بھی شاعرانہ ہے جس سے ان کی کہانیوں میں قوس قزح کے رنگ سمٹ گئے ہیں۔ نور شاہ کہانی گھڑنے اور اس میں جمالیاتی عنصر شامل کرنے کے گُر سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی مجبوریوں اور ناکامیوں کی کہانی لکھتے ہیں جس سے ان کے افسانوں میں حزن وملال کی ہلکی ہلکی کسک پیدا ہوگئی ہے۔ انسانی نفسیات کا مطالعہ ان کے متنوع موضوعات کا ایک حصہ ہے۔ ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے منظر عام پر آ گئے ہیں۔

جون ۱۹۶۸ء کے بیسویں صدی دہلی میں ان کی ایک کہانی ''دوسری ملاقات'' نے

مجھے ان کے قریب لایا۔ اُس زمانے میں میری چند کہانیاں ''بیسویں صدی'' میں چھپی تھیں۔ ان کی ایک اور کہانی ''الجھے لمحوں کے چہرے'' مطبوعہ نگینہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں سرینگر سے انہیں ملنے جموں پہنچا۔ نور شاہؔ پیر مٹھا محلے میں کسٹوڈین کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ میں جیوتیشور پتھک، مالک رام آنند اور ایک فوجی افسر راہی بے وفاؔ کے ہمراہ اُن کے گھر گیا۔ اُن دنوں جموں میں زبردست ادبی ماحول موجود تھا۔ سرینگر میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری، برج پریمی اور کچھ غیر ریاستی ادباء شعراء جو بسلسلہ ملازمت سرینگر میں مقیم تھے، سرگرم تھے۔ ان میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، کمال احمد صدیقی، شبیب رضوی، طارق غازی، اسرار احمد آزاد، مونس رضا شامل ہیں۔ یہ حضرات اکثر ادبی محفلوں میں شریک ہوتے تھے جہاں ان سے ملاقات رہتی تھی لیکن نور شاہ کو میں نے کبھی کسی ادبی جلسے میں یا پھر ریڈیو اور ٹی وی کی کسی نشست میں نہ دیکھا۔ صرف ان سے ہماری ملاقات صفحاتِ قرطاس کی وساطت سے رہتی تھی۔ کشمیر کی سرزمین پر ہونے والی ادبی کانفرنسوں میں بھی نور شاہؔ کہیں نظر نہیں آتے تھے، نہ ان کا ذکر خیر ہوتا تھا۔ لیکن مجھے پہلی مرتبہ کرشن چندر سے سونہ وار گیسٹ ہاؤس میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو انہوں نے بلا جھجک کہا کہ وہ خود کبھی کشمیر نہیں آئے لیکن انہوں نے کشمیر کو نور شاہؔ، حامدی اور ٹھاکر پونچھی کی کہانیوں میں دیکھا ہے۔ عصمت چغتائی نے مظہر امام صاحب کی موجودگی میں بارہمولہ کی ایک ادبی مجلس میں کہا کہ وہ نور شاہؔ کی کہانیاں پڑھتی ہیں۔ جب پہلی مرتبہ ممبئی گیا تو جن لوگوں سے میری ملاقات ہوئی ان میں ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، حسن کمال، نقش لائلپوری، محبوب راہیؔ اور مہندر ناتھ شامل ہیں، سب ادباء نے نور شاہ کا ذکر کیا۔ نور شاہؔ صرف ایک کہانی کار ہی نہیں ہیں بلکہ وہ ایک طویل کہانی کا عنوان ہے جو گزشتہ ۵۰ سال سے کشمیر کے ادبی اُفق پر لکھا ہے اور تا دم تحریر ادبی دنیا کو منور کر رہا ہے۔

..........●●●..........

● ...... دیپک بُدکی

نور شاہ کا تخلیقی سفر

نور شاہ ایک ایسے تخلیق کار ہیں جو اپنے دل میں پون صدی کے تغیرات، انقلابات، قوم کا المیہ، اپنوں سے بچھڑنے کا غم اور انسان کا درد و کرب لئے ہمیں آج بھی اپنے رومانی افسانوں، ناسٹلجیائی یادداشتوں، دلفریب خاکوں اور پارینہ روزناموں سے محظوظ کررہے ہیں۔ تقریباً ساٹھ سال پہلے انہوں نے سجاد حیدر یلدرم سکول کی پیروی میں اپنا ادبی سفر شروع کیا تھا جس کی آبیاری گزشتہ صدی میں ماہنامہ ''بیسویں صدی'' نئی دہلی کرتا رہا۔ نور شاہ کی اکثر بیشتر کہانیاں اسی رسالے میں چھپتی رہیں اور قارئین کی دلچسپی کا مرکز بنتی رہیں۔ عشق و محبت کی ماورائی کہانیاں، افلاطونی کردار اور جمالیاتی موضوعات......! نور شاہ نے خود بھی رومان پرور طبیعت پائی ہے جو حسن و جمال کی انتہا دیکھنے کی متلاشی ہے۔ ان کے بارے میں پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں لکھتے ہیں:

> ''نور شاہ وادی کے افسانہ نگاروں میں غالباً سب سے زیادہ لکھنے والے افسانہ نگار ہیں۔ ......کہانی لکھنے میں انہیں نہ صرف ذوق ہے، بلکہ سلیقہ اور اچھا سلیقہ ہے۔ ایک اچھے افسانہ نگار کی طرح وہ ہر موضوع سے ایک مؤثر افسانہ اور ہر موقف سے دلچسپ مرقع پیدا کرسکتے ہیں جہاں ان کے موضوع میں دم نہیں، اسے بھی اپنے پیش کشی کے انداز اور فنی چابک دستی سے وہ جیتا جاگتا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سینکڑوں کردار انہوں نے پیدا کئے ہیں، تاہم ان میں یکسانیت بہت کم ہے، وہ حقائق کے افسانے لکھتے ہیں، لیکن رومانی حقائق کے......نور شاہ کرداروں کی

بیرونی رنگ کاری کے علاوہ اکثر ان کے بطون کی گہرائیوں میں بھی جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں......افسانوں میں ڈرامائی موقف پیدا کرنے کی وہ شعوری کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔"

(عبدالقادر سروں، 'کشمیر میں اردو'، جے اینڈ کے اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر، کشمیر، تیسرا حصہ، ۱۹۸۴ء، ۲۵۔۲۲۴)

سازگار ادبی ماحول کے سبب ڈل گیٹ سرینگر سے کئی ادیب سامنے آتے رہے ہیں۔ نورشاہ اور ان کے خاندان میں سبھی بھائی اردو ادب کی طرف مائل تھے۔ اس علاقے کی خصوصیت یہ ہے کہ پس منظر میں شنکر آچاریہ کی پر شکوہ پہاڑی ہے اور پیش منظر میں جھلمل کرتی ہوئی ڈل جھیل ہے جو سارے ماحول کو پر کیف بناتے ہیں۔ پھر گرمیوں میں خوشبوئیں بکھیرتے ہوئے سیاحوں کے خوشنما قافلے سونے پر سہاگا کا کام کرتے ہیں۔ اسی ماحول سے ترغیب پا کر نورشاہ نے افسانے کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا اور عمر بھر اسی کے ہو کر رہ گئے۔ اس بارے میں خود ہی فرماتے ہیں:

"دراصل وادی کے جس حصے میں میں نے اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا اور جوانی کے ایام جیے ہیں، وہ ڈل جھیل کے آس پاس کے کچھ حصے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پہاڑ، پانی اور سبزہ بیک وقت نظر آتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ وادی کے اسی حصے میں میرے احساس جمال کی پرورش ہوئی ہے اور وہ حسن جو میری آنکھوں نے سمیٹ لیا ہے لاشعوری طور پر میری کہانیوں میں منعکس ہے۔

(نورشاہ، افسانوی مجموعہ 'بے ثمر سچ' امیکس بکس، حضرت بل، سرینگر کشمیر ۲۰۰۵ء، ص ۸)

نورشاہ کو بچپن ہی سے افسانہ نگاری کا شوق رہا لیکن ان کی ادبی زندگی کی باضابطہ شروعات ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔ چونکہ ابتدا میں چند ایڈیٹروں نے ان کے افسانے لوٹا دیے اس لئے انھوں نے اپنی کہانیاں چھپوانے کا ایک انوکھا طریقہ ڈھونڈ نکالا اور وہ تھا اپنے نام کے بدلے 'شاہدہ شیریں' کے فرضی نام سے افسانے بھیجنا۔ ایڈیٹر حضرات اس خوبصورت نام پر لٹو ہوگئے اور کہانیاں دھڑا دھڑ چھپنے لگیں۔ بے شمار خطوط بھی آتے رہے جن میں تقرب حاصل کرنے کی خواہشوں کا مکرر اظہار ہوتا۔ آخرکار شاہدہ شیریں' تقلیب ماہیت پر مجبور ہوئی اور وہ

'نور شاہ' بن کر سامنے آ گئی۔ بقول نور شاہ ان کا یہ دور کافی من چلا رہا۔ کئی معروف ادبا کے خطوط ملے جن سے ان کی دوہری شخصیتیں سامنے آ گئیں۔ ایک دفعہ گفتگو کے دوران میں نے ان سے التماس کی تھی کہ ان خطوط کو شائع کروالیں مگر ان کی شرافت، حلیمی اور وفاداری انہیں ایسا کرنے سے باز رکھتی ہے۔ ۱۹۵۹ء میں 'ہمارا ادب' کے انتخاب کے لئے ان کی ایک کہانی 'گلاب کا پھول' چن لی گئی جس میں پروفیسر حامدی کاشمیری نے آخر کار نقاب الٹ دیا:

> '' 'بے گھاٹ کی ناؤ' کا خالق نور شاہ نقلی نسوانی لبادے اتار کر، اب اصلی صورت میں ہمارے سامنے آ رہا ہے اور ہماری آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہا ہے۔''

(بحوالہ 'نور شاہ' جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، جان محمد آزاد، جے اینڈ کے اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر کشمیر، ص ۱۸۸)

نور شاہ کی پہلی کہانی ماہنامہ، بیسویں صدی' نئی دہلی میں بعنوان 'گلاب کے پھول' چھپی تھی جبکہ ان کا پہلا ڈرامہ 'دل کی روشنی' ریڈیو کشمیر سرینگر سے نشر ہوا تھا۔

نور شاہ کی افسانہ نگاری کے بارے میں ڈاکٹر برج پریمی اپنے خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''نور شاہ بنیادی طور پر شاعرانہ ذہن رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب بھی شاعرانہ ہے جس سے ان کی کہانیوں میں قوس قزح کے رنگ آ گئے ہیں اور اس خصوصیت نے نورؔ کے افسانوں کو ایک انفرادیت بخش دی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ نور شاہ افسانہ بُننے کے گُر سے بھی واقف ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی مجبوریوں اور ناکامیوں کی کہانیاں لکھتے ہیں جس سے ان کے افسانوں میں غم کی ہلکی ہلکی کسک پیدا ہو گئی ہے۔ 'بے گھاٹ کی ناؤ'، 'من کا آنگن اداس اداس' اور 'گیلے پتھروں کی مہک' جیسے افسانے قابل قدر ہیں اور ہمارے افسانوی ادب میں اضافہ۔''

(ڈاکٹر برج پریمی، 'اردو افسانہ ریاست میں' انتخاب اردو ادب، ۴۷ تا ۷۱، نور شاہ ۱۹۷۲ء)

ان کے افسانوں کے مجموعے 'بے ثمر سچ' پر راقم الحروف کے تبصرے کا اقتباس بھی یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''نورشاہ افسانے لکھتے وقت 'ستیم ،شوم اور سندرم' کی کھوج میں نکلتے ہیں۔ وہ نہ صرف عورت کے حسن سے متاثر ہیں بلکہ مناظر قدرت سے بھی جھوم اٹھتے ہیں۔ بہرحال عورت ان کے تخیل پر حاوی رہتی ہے۔ اس عورت میں وہ دوشیزہ کی پاکیزگی بھی دیکھتے ہیں اور ماں کی ممتا بھی۔ بیوی کی رعنائیاں بھی ڈھونڈتے ہیں اور کسی کی شہوت انگیز انگڑائیاں بھی۔''

(دیپک بُدکی، تبصرہ 'بے ثمر سچ' عصری تحریریں، میزان پبلشرز، سرینگر کشمیر، ص ۸۴)

مذکورہ مجموعے (بے ثمر سچ) کی کئی کہانیاں بہت متاثر کرتی ہیں جیسے وہ جو ایک شخص تھا، لکیریں بے جڑ پودے، صلیب وغیرہ۔ مجموعے میں شامل کچھ افسانوں کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

☆ ''یہ زندگی ایک کہانی ہے اور اس کہانی میں ماضی کے کچھ حسرت بھرے لمحے حال کی بے پناہ اُداسیاں اور مستقبل کی ان دیکھی ان جانی پرچھائیاں پوشیدہ ہیں۔'' (رات کا سورج)

☆ ''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم کس دور میں سانس لے رہے ہیں۔ ہم کس سماج اور کس سوسائٹی کی تخلیق کر رہے ہیں۔ یہاں ہر شے میں بناوٹ ہے، ملاوٹ ہے، ہماری باتیں، ہماری سوچیں بھی تو نقلی ہیں۔ سبھی پر ملمع چڑھا ہوا ہے۔'' (بے جڑ پودے)

☆ ''ہر شاخ ایک صلیب ہے اور ہر صلیب پر نڈھال عیسیٰ کو خدا کی تلاش ہے!'' (صلیب)

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ابتدا میں نورشاہ کے افسانوں میں رومانیت غالب رہی اور نفسیاتی واہ واہی (Appreciation Therapy) کے باعث وہ اس ڈگر پر بہت عرصہ تک گامزن رہے۔ البتہ ان کے افسانے وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا کی منزلیں طے کرتے رہے اور حقیقت پسندی کے نزدیک آنے کی کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ انہی دنوں ترقی پسند تحریک اپنے زوروں پر تھی اس لئے نورشاہ نے بھی غریبوں اور مفلسوں کی حمایت میں افسانے لکھے مگر انہوں نے نہ اپنا اندازِ بیان ترک کیا اور نہ ہی اپنے افسانوں کو فوٹو گرافی یا تحریکی منشور بننے دیا۔ اس بارے میں عبدالقادر سروری فرماتے ہیں:

''اس عہد کے افسانہ نگاروں کی طرح انہیں بھی مظلوم اور مفلوک انسانوں سے ہمدردی ہے،

اکثر افسانوں میں انسان دوستی کے جذبے سے کام لیتے ہیں۔ کشمیری عوام کی زندگی، ان کے جذبات، ان کے رنج وغم، ان کی مسرتوں، ان کی تمناؤں اور خواہشات کے کتنے ہی مرقعے ان کے افسانوں کی کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔''

(عبدالقادر سروں، 'کشمیر میں اردو' جے اینڈ کے اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر کشمیر، تیسرا حصہ، ۱۹۸۴ء، ص ۲۲۴)

نورشاہ دورِ جدیدیت میں بھی کافی فعال رہے مگر ان کے افسانوں پر جدیدیت کا اثر بہت کم نظر آتا ہے۔ وہ استعاراتی وعلاماتی حد بندیوں سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنے جذبات کا اظہار کھل کر کرتے ہیں۔ انہوں نے بیانیہ کا خوب استعمال کیا ہے حالانکہ مکالمہ کو بھی ضرورت کے مطابق کام میں لاتے ہیں۔ بقول رؤف راحت ''...... یہاں تک کہ قاری کی موت واقع ہوتی اگر نورشاہ جیسے تخلیق کار نہ ہوتے۔''

(رؤف راحت، حرفِ چند، نورشاہ کے تین ناولٹ، میزان پبلشرز، سرینگر، کشمیر ۲۰۰۹ء، ص ۷)

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انہوں نے علامتوں کا استعمال کبھی نہیں کیا۔ ان کے کئی افسانوں میں کتا، چنار، سفید رنگ اور برف وغیرہ بطور علامات استعمال ہوئے ہیں مگر ان علامتوں کو وہ منزل نہیں سمجھتے بلکہ ان کو منزل تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

نورشاہ کے افسانوں کی ایک اور خوبی ان کی منظر نگاری ہے۔ وہ قاری کے ذہن پر مطلوبہ منظر کا ہو بہو عکس بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے افسانے اندھیرے اجالے، بے جڑ پودے، لکیریں قابل غور ہیں۔ اچھا ڈرامہ نگار ہونے کے سبب ان کے افسانوں میں ڈرامائیت بھی ملتی ہے۔ ان کے مکالمے جچے تلے اور چست ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ طنز کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔ نورشاہ کے افسانوں کا اختتام بھی عنوان ہی کی طرح چونکانے والا ہوتا ہے۔ جہاں تک کرداروں کا سوال ہے وہ باہر سے زیادہ کردار کے درون میں جھانکتے ہیں۔ کردار کی نفسیاتی کشمکش، الجھن اور کجروی کو وہ بڑی ہنرمندی سے پیش کرتے ہیں اور شجرِ ممنوعہ کے پھل کو چکھنے سے گریز نہیں کرتے۔ چنانچہ اپنے کرداروں کے بارے میں خود ہی

لکھتے ہیں:

''میرے افسانوں کے اکثر و بیشتر کردار رومانوی ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے پھوٹتے ہیں۔ میرا ایسا سوچنا بجا بھی ہے کہ زندگی حسن وعشق سے عبارت ہے اور نسل آدم کی بقا ان ہی سے قائم ہے۔''

(نور شاہ، افسانوی مجموعہ 'بے ثمر سچ'، امیکس بکس، حضرت بل، سرینگر کشمیر ۲۰۰۵ء، ص ۸)

جیسے کہ پہلے ہی ذکر آچکا ہے کئی افسانوں میں کرداروں کی نفسیاتی کجرویوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ مثلاً دستک Electra Complex؛ صلیب Sexual Dissatisfaction؛ وہ جو ایک شخص تھا، زمین کھولے گی زبان اپنی، اور آخری دن سے پہلے Guilt Complex؛ رات کا سورج Oedipus Complex؛ ایک لمحے کی محنت Sodomy؛ اشرف المخلوقات اور انجانے اتہاس کی کڑیاں Lesbianism & Wife Swapping وغیرہ۔ اس کے باوجود وہ ان معاملوں پر کُھل کر نہیں لکھتے بلکہ بڑی ہی سنجیدگی کے ساتھ اور سلجھے ہوئے طریقے سے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں۔

کشمیر افسانہ نگار کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ وہ اسی دھرتی پر پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور زندگی کے نرم وگرم سے جھوجھتے رہے۔ ان کے اکثر افسانوں میں کشمیر کا عکس بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر ملتا ہے۔ مجموعہ 'بے ثمر سچ' کے کئی افسانے کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے 'ٹوٹتے لمحوں کا بیان'، 'لکیریں'، وغیرہ۔ افسانہ 'اس کی گلی کا پاپ' میں کشمیر کے موجودہ ماحول کی منظر نگاری بالواسطہ طور پر یوں کی گئی ہے۔

''اب یہاں کوئی ہنگامہ نہیں، کہیں کوئی چیخ نہیں، کوئی شور نہیں۔ برف کی سفید روشنی میں ساری گلی اونگھ رہی ہے، سارا ماحول تھکا تھکا اور سویا سویا سا ہے جیسے اب کوئی یہاں نہیں رہتا۔ یہ انسانوں کی بستی نہیں قبرستان ہے، سارے مکان سارے گھر برف کی قبریں ہیں اور ان میں رہنے والے لوگ برف کی مورتیاں، بے حس بے جان، یخ ٹھنڈی لاشیں، مسخ شدہ چہرے، گوشت پوست کے بغیر جسم، خالی خالی بے رس ہڈیاں۔ اب یہاں وہ آواز بھی نہیں جو دل کے

جنگل میں محبت کی کوئی قد آور شاخ بلندی سے پستی کی جانب ٹوٹنے سے بے ساختہ نکلتی ہے اور چند لمحوں کے لئے دل کی دنیا میں ایک مرگ آلودہ سناٹا چاروں سمت پھیلا دیتی ہے۔!!

بیسویں صدی کے آٹھویں دہے میں کشمیر میں جو انقلاب آیا اس نے یہاں کی زندگی کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ ایک ایسے قلم کار کے لئے جو چالیس سال اپنے رومانی خامہ کو جمالیات کی روشنائی میں ڈبو ڈبو کر حسن و جمال کے پیکر بناتے رہے اور جو ہمیشہ کہتے رہے کہ ''ہم سب کا جسم ایک ہے، جسم کی بناوٹ ایک ہے، جسم کے اندر خون ایک ہے، خون کا رنگ ایک ہے، تو پھر یہ فرق کیوں......؟''۔ ان کے لئے یہ ایک بہت بڑے امتحان کا وقت آن پڑا تھا۔ ان کے ہم راہی کچھ تو راہ عدم اختیار کر گئے تھے، کچھ وادی کو الوداع کہہ چکے تھے۔ اپنی قوم کا شیرازہ بکھرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اندر سوئی ہوئی روح جاگ اٹھی، ایک نئی توانائی نے پھر سے جنم لیا، ان کے سوچ و فکر میں کافی تبدیلی آئی اور وہ اپنے شہر آشوب کا نوحہ رقم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اب وہ غریب معصوم کشمیریوں کے بہتے لہو کو قرطاس پر جمع کر کے ان کا کولاج بنا گئے، ان کی خاموشیوں کی صدا سننے کے لئے اپنے کان دھرنے لگے، ان کی محرومیوں کا دکھ درد بانٹنے لگے اور ان کی بے زبانی کو زبان دینے لگے۔ اس حوالے سے ماہنامہ 'بیسویں صدی' دہلی کی ایڈیٹر ڈاکٹر شمع افروز زیدی فرماتی ہیں:

''نور شاہ ایک جانب لفظوں، رنگوں موسیقی کی دلکش تان، بانسری کی لے، وائلن کی دُھن اور جسم کے آہنگ کے ذریعہ انتہائی لطیف انداز میں اپنے احساسات کو واضح کرتے ہیں تو دوسری جانب زندگی کی سنگلاخیت کا ذکر بھی اسی شد و مد سے کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں کہ موجودہ کشمیر پہلے جیسا جنت بے نظیر رہا بھی تو نہیں۔ اب وہاں نہ بانسری کی مدھر تان گونجتی ہے، نہ ہی دل نواز مناظر دل کو موہ لیتے ہیں، نہ وہاں کے حسین موسم کہانی کہتے محسوس ہوتے ہیں، نہ ڈل جھیل کے ٹھنڈے پانی کی سرد لہر جسم میں سرایت کرتی ہے، نہ چنار کے درختوں کی پُرسکون چھاؤں میسر آتی ہے اور نہ وہاں کی وادیاں سرگوشیاں کرتی محسوس ہوتی ہیں لیکن یادِ رفتگاں کے طور پر نور شاہ اپنے ماضی کے کشمیر کو تلاشتے ہوئے ضرور محسوس ہوتے ہیں۔''

نور شاہ کے تین ناولٹ 'آدھی رات کا سورج'، 'آؤ سو جائیں، لمحے اور زنجیریں' ان کے شروعاتی دور کی تخلیقات ہیں اس لئے ان میں بھرپور رومانیت نظر آتی ہے۔ نور شاہ نے رومانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان ناولٹوں کے کرداروں میں عجیب سا لاابالی پن ملتا ہے اور کشمیر کے حسین مناظر کے ساتھ ساتھ او برائے ہوٹل میں ماضی کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔

ناولٹ 'آؤ سو جائیں' پر اعجاز صدیقی، ایڈیٹر ماہنامہ شاعر ممبئی لکھتے ہیں:

''آؤ سو جائیں' جہاں ایک لمحے کی کہانی ہے، وہیں ایک یگ کی کہانی بھی ہے۔ اس ناولٹ میں نور شاہ نے ایک خاص ماحول اور اس ماحول میں رہنے والے کرداروں کی نقاب کشائی اپنے منفرد ڈھنگ سے کی ہے۔''

(حرف چند، نور شاہ کے تین ناولٹ، مرتبہ رؤف راحت، میزان پبلشرز سرینگر، کشمیر، ۲۰۰۹ء ص vi)

نور شاہ نے گزشتہ کئی برسوں سے اپنی ڈائری کے صفحات اور اپنی یادداشتوں کو قرطاس کے حوالے کر دیا ہے۔ ان خاکوں اور ماضی کے واقعات کو پڑھ کر قاری ایسے محسوس کرتا ہے کہ وہ رائٹر کی یادوں کے البم کی ورق گردانی کر رہا ہے۔ 'بند کمرے کی کھڑکی' ان کی ڈائری کے چنندہ اوراق پر مشتمل ہے جن کی ترتیب تاریخ کی بجائے موضوعیت پر دی گئی ہے۔ اس ڈائری میں ۴۴ ادیبوں و صحافیوں، ۳ فلمی شخصیتوں، ۳ر مصوروں و مجسمہ سازوں، ایک موسیقار، اور ۲ر ادبی تنظیموں کا ذکر آ چکا ہے۔ اس سے بڑھ کر اس ڈائری سے خود قلم کار کی شخصیت کے پوشیدہ پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ ان کی نیک نیتی، ہمدردی اور اصول پرستی کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے۔ گاندھی جی کے اصولوں کی ان دیکھی، فرقہ وارانہ فسادات نیز انسانی اقدار کی پامالی پر ان کا دل رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کشتواڑ اور بھدرواہ کے دورے پر وہاں کی حالت دیکھ کر وہ اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں۔

''ایک ڈر کا ماحول ہر سمت پیدا ہو گیا اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟ خود ہم لوگ، ہمارے رہنما اور سیاست دان، ہماری معاشرہ، ہمارا انتظامیہ......کوئی بھی آدمی جنم سے برا نہیں ہوتا۔ تو کیا یہ مادہ پرست دنیا ہے جو آدمی کو کرپٹ Corrupt کرتی ہے۔......یہ سوال میں اپنے آپ سے بھی

کرتا ہوں اور آپ سے بھی......!''

ماحولیات پر نور شاہ کی فکر مندی اس بات سے ثابت ہوتی ہے کہ انہیں ایک جانب ڈل جھیل کے پاس اپنے مکان کے کھونے کا غم ستاتا ہے اور دوسری جانب ڈل جھیل کی آلودگی پریشان کر دیتی ہے۔ اِدھر جہلم دریا کے بہاؤ کی کمی دیکھ کر وہ مایوس ہوتے ہیں اور اُدھر سکڑتے ہوئے ولر جھیل کو دیکھ کر۔ انہوں نے اردو کے پر خلوص خادم اور بیسویں صدی کے ایڈیٹر خوشتر گرامی سے ہوئی دھوکے بازی کو اسی شدت سے بیان کیا ہے جس شدت سے انہوں نے اپنے کھوئے ہوئے یار دوستوں کے بارے میں لکھا ہے۔ 'یادوں کی مہک' کے عنوان سے نور شاہ نے کشمیری پنڈت کلچر اور پنڈت ادیبوں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اپنے پنڈت دوستوں کا دردمندی سے ذکر کیا ہے اور ان کے ساتھ ہمدردی بھی جتائی ہے۔ اس ڈائری کے بارے میں عمر مجید لکھتے ہیں کہ:

''نور شاہ نے ہفتہ وار ایک ادبی ڈائری لکھنے کا فریضہ اپنے کندھوں پر لیا اور ادبی شخصیات اور عصر حاضر کے ادبی حالات و واقعات کو اپنے منفرد اور مخصوص انداز میں پیش کرنے لگے۔ یہ محض ایک خانہ پری نہ تھی بلکہ ایک بامقصد کوشش تھی جسے بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔ یہ برصغیر کی ادبی دنیا کے لئے نئی چیز ہے۔''

(عمر مجید، 'فلک رنگ تاثرات' بند کمرے کی کھڑکی، نور شاہ، ص ۹۰-۸۹)

اسی نہج کی ایک اور کتاب 'کہاں گئے وہ لوگ' کے عنوان سے سامنے آئی ہے جس میں نور شاہ نے ۶۷ شخصیات پر اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔ اس کے علاوہ خود ان کے فن پر لکھی گئی آرا کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں اردو کے ادیب ہیں جیسے پریم ناتھ پردیسی، موہن یاور، ابن صفی، جگن ناتھ آزاد، کرشن چندر، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین، حکیم منظور، خواجہ احمد عباس، شکیل الرحمن، کشمیری ادب سے وابستہ قلم کار ہیں جیسے اختر محی الدین، دینا ناتھ نادم، موتی لال ساقی، فاضل کاشمیری دانشور ہیں جیسے پی این پشپ، محمد دین فوق، محی الدین حاجنی، صحافی ہین جیسے ملک راج صراف، فلمی ہستیاں ہیں جیسے محمد رفیع، پرتھوی راج کپور، نور جہاں، مدھو بالا،

نوشاد علی، امجد خان اور ریڈیو دوردرشن سے وابستہ آرٹسٹ ہیں جیسے بنسی نردوش، شجاع سلطان، غرض ایک کہکشاں ہے جوان صفحات پر سجائی گئی ہے۔ طوالت کی وجہ سے یہاں پر پوری فہرست نہیں دی گئی ہے البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ جن لوگوں کے خاکے اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں ان میں سے قریب قریب سب کے ساتھ نور شاہ کے قریبی تعلقات رہے ہیں جبکہ دوسرے لوگوں سے وہ ملے بھی نہیں ہیں مگر وہ اپنی زندگی میں کسی نہ کسی موڑ پر ان سے کافی متاثر رہے ہیں ۔کتاب میں کئی ایسی باتیں درج کی گئیں ہیں جو قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں۔

'جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار۔ تعارف، فن اور مکالمہ' کے عنوان سے نور شاہ کی ایک اور دستاویز ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی جس میں انہوں نے چند مضامین کے علاوہ ریاست کے ۶۰ ؍افسانہ نگاروں کے مختصر کوائف، ان کے ایک چنندہ افسانے کا تجزیہ اور افسانے کے ایک سین کو مکالمی روپ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ مشمول افسانہ نگاروں میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے آزادی سے پہلے قلم اٹھایا تھا اور وہ بھی ہیں جو ابھی بھی طفلِ مکتب ہیں، وہ ادیب بھی ہیں جو شہابِ ثاقب کی طرح ادبی افق پر نمودار ہو کر ٹوٹ گئے اور وہ بھی ہیں جو عمر بھر ادب کی آبیاری کرتے رہے، کشمیر سے ہجرت کرنے والے وہ قلم کار بھی ہیں جنہوں نے تقسیم وطن کے دوران سرحد پار اپنی بستیاں بسائیں اور وہ مہاجر بھی ہیں جنہوں نے ۱۹۹۰ء میں ملک کے مختلف علاقوں میں پناہ لی۔

آخر میں مجھے یہ بات کہنے میں ذرا بھر بھی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ نور شاہ کے ادبی سفر کو چند صفحات میں سمیٹنا بہت مشکل کام ہے۔ تاہم میری یہ کوشش رہی ہے کہ کم سے کم ان صفحات میں نور شاہ کی حصولیابیوں کا اعتراف کرسکوں اور آئندہ نسلوں کو یہ بتا سکوں کہ بیسویں صدی میں ایسے بھی جیالے اردو ادب کی آبیاری میں مصروف رہے ہیں۔

...........●●●...........

● ...... محمد یوسف مشہور

نور شاہ کے افسانوں میں حقیقت کی عکاسی

نور شاہ کے افسانے نصف صدی سے زیادہ عرصے سے اُسی شوق و ذوق سے پڑھے جا رہے ہیں جس ذوق و شوق سے لکھے جا رہے ہیں۔ ہر بڑا فن کار کسی خاص فن میں اپنی پہچان بنانے میں تبھی کامیاب ہوتا ہے جب وہ استقلال اور پیہم ریاضت کو اپنا شعار بناتا ہے۔ نور شاہ نے افسانہ نگاری کو اپنا خاص میدان بنایا تو افسانے کی تخلیق میں وہ کچھ اس طرح منہمک ہوئے کہ یہ اُن کا ہمہ وقتی مشغلہ بن گیا۔ وہ افسانہ سوچتے، بُنتے اور جیتے ہیں۔ گویا افسانہ اُن کی طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔ اُن کی پُر اسرار شخصیت اگر چہ اُن کے افسانوں اور کرداروں میں مناسب موقع و محل پر ڈھلتی رہی ہے اور سنجیدہ قارئین کے لئے اجنبی نہیں رہی تاہم سطحی نظر سے دیکھنے والوں کے لئے وہ اب بھی ایک معمہ ہیں۔ بقول قتیل شفائی ؎

اِک عمر گزاری ہے اس فن میں ہم نے قتیلؔ
ملتے ہیں کہاں ہم سے فن کار لگن والے

نور شاہ جیسا لگن والا فن کار ریاست جموں و کشمیر کے دبستان اردو میں اپنے تخلیقی سفر کے دوران ڈرامے، خاکے، افسانچے اور افسانے تخلیق کرتا رہا ہے مگر اُن کی سبھی تحریروں پر افسانویت غالب ہے۔ اُن کے ڈراموں اور خاکوں میں بھی اُن کے افسانوں کی طرح کہانی پن اور مکالمے کے عناصر مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ خاص طور سے اُن کی زبان جو سادہ، روزمرہ اور مختصر فقروں پر مشتمل ہے، اُن کی جملہ تحریروں میں خاص دل چسپی کا باعث ہے۔

روزمرہ کی عملی زندگی میں پیش آنے والے سامنے کے حالات و واقعات کو افسانوں کا مواد بنانے والا یہ فن کار ماضی کی تاریخ، اسطور دیو مالا اور مذہب کا سہارا لئے بغیر افسانہ تخلیق کرنے میں کامیاب ہوتا ہے وہ کسی تحریک یا مسلک کا ڈھنڈورچی نہیں ہے بلکہ زندگی کی برہنہ حقیقتوں سے براہِ راست سروکار رکھتا ہے۔ نور شاہ افسانہ کے مواد پر اور کہانی کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لئے اپنی تخلیقی صلاحیت اور فنکارانہ بصیرت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ ضرب الامثال، محاورات، تشبیہات اور استعارات کا کم سے کم استعمال کرتے ہیں تا کہ قاری زبان کے خارجی گورکھ دھندے اور بھول بھلیاں میں پھنس کر نفسِ مضمون اور اصل غرض و غایت تک پہنچنے میں ناکام نہ رہے۔ سماجی افسانے کی جمالیات یہی ہے کہ ترسیل و ابلاغ کی راہ میں خود متن رُکاوٹ نہ بن جائے۔ شاعری کی بات اس سے بالکل مختلف ہے۔ شاعری میں شعرِ شور انگیز مستحسن ہے کیونکہ اس میں اسی وسیلے سے گہرائی اور کثیر معنویت پیدا ہوتی ہے۔ اِس کے برعکس افسانے میں یہی مقصد پلاٹ بندی، مکالمے اور کردار نگاری کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

میرے خیال میں افسانہ نگار کا کمال یہی ہے کہ بالکل سادہ زبان، آسان اور مختصر جملوں میں عرض مطلب کرنے، مرصع و مسجع اور گنجلک زبان ایک گونہ ''شور'' کا باعث ہوسکتی ہے قاری اس طرح کے اسلوب میں اُلجھ کر متن کی کنہ تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔ بعض نقادوں اور قارئین کو نور شاہ کے افسانوں میں، اکہرا اور یک معنویت پر اعتراض ہوگا کیوں کہ ادبی تنقید میں تہداری اور کثیر معنویت کا بہت زیادہ چرچا کیا جاچکا ہے مگر یہ شاعری، انشائیہ نگاری یا زیادہ سے زیادہ علامتی افسانے کی حد تک درست ہے جو ادیب، سماج اور فرد کے دُکھ درد کو شدت سے محسوس کرتا ہو اور اِس کے ازالے کے لئے ادب تخلیق کر رہا ہو وہ بھلا اُدھر اِدھر کی ہانک کر کیا کرے گا۔ وہ بے اختیار کراہتا ہے چیختا ہے، چلاتا ہے کیوں کہ

دردکی کوئی لے نہیں ہے

نالہ پابندِ نے نہیں ہے

نور شاہ اُس سماج کا حصہ ہے جہاں انصاف کا خون ہوتا رہا ہے۔ استحصال کے نت

نئے حربے ایجاد کئے جاتے رہے ہیں۔انسانی حقوق کی پامالی اپنی آخری حدود کو چھورہی ہے۔ ایسے ماحول میں حق وانصاف کی جدوجہد میں شامل ہونے والے ادیب اور فن کار کو وہی زبان اور وہی طرزِ اظہار اختیار کرنا چاہئے جس سے ترسیل میں دِقت نہ ہو۔اسی لئے عدلیہ کے لئے واضح اور غیر مبہم زبان کی سفارش کی جاتی ہے۔اس میں ملمع کاری اور تصنع سے مغالطے اور گمراہیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ان کے مجموعے ''کیسا ہے یہ جنوں'' میں شامل اسی عنوان کی کہانی کا یہ اقتباس نورشاہ کی سادہ عبارت اور مطلب برآری کا کافی وشافی ثبوت ہے۔

''میرا نام عامر ہے اور میری عمر لگ بھگ بارہ برس ہے۔ بھلا بارہ برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ یہ تو کھیلنے کودنے، ہنسنے ہنسانے اور گلی ڈنڈا کھیلنے کی عمر ہوتی ہے۔زندگی کے طویل سفر میں بارہ برسوں کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہوتی لیکن جب بچپن اور لڑکپن کے مٹھاس بھرے دِن تلخیوں اور کڑواہٹوں کی نذر ہوجاتے ہیں۔کھیل کود کے ایام جدوجہد اور کشمکش کا روپ اختیار کرلیتے ہیں تو ذہن میں اپنی کم علمی اور کم فہمی کے باوجود کئی سوال اُبھرتے دکھائی دیتے ہیں۔''

نورشاہ کے افسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اِن میں راوی کوئی فالتو شخص نہیں بلکہ خود افسانے کا کردار بلکہ بعض اوقات مرکزی کردار ہے۔وہی اپنی بپتا سناتے ہوئے کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔اس طرح راوی قاری اور کرداروں کے درمیان حائل نہیں ہوتا بلکہ کردار براہِ راست قاری سے مکالمہ قائم کرتا ہے۔راوی کی درمیانہ داری اور دلالی سے اپنے افسانوں کو پاک کرنا بھی نورشاہ نے یوں ہی روا نہیں رکھا ہے۔اِس کے پیچھے بھی حقیقت کارفرما ہے کہ سماج میں ان ہی عناصر کی کارستانیوں نے زندگی کو جہنم بنادیا ہے۔یہاں یہ بات بھی بے محل نہیں ہے کہ خود افسانہ نگار اپنے اکثر افسانوں میں اسی متذکرہ بالا راوی نما کردار کے خول میں چھپ کر آپ بیتی سناتا ہے۔اسی آپ بیتی کے پہلو میں جگ بیتی عیاں ہے۔دراصل افسانہ نگار اپنے سماج کے بارے میں اتنا فکرمند ہے کہ وہ وقت ضائع کئے بغیر قاری کو اپنا ہم نوا بنانا چاہتا ہے تاکہ ظلم وستم کا فوری مداوا ہوسکے۔یہ اور بات ہے کہ اِس سماج میں اب قاری ہی ناپید ہورہا ہے اگر اِکا دُکا ہے بھی تو وہ اپنے ادیب اور فن کار کے تجربے سے گزر کر اُس کے درد کو بانٹنے کیلئے تیار

نہیں ہے۔ ''کیسا ہے یہ جنون''میں شامل کہانی ،رشتوں کا درد، سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''میں کبھی ان گیتوں پر جان دیتا تھا۔اب انہیں سننا نہیں چاہتا۔اب مجھے ان نیم سریلی آوازوں سے بھی نفرت ہوگئی ہے......نہیں ،نہیں، آج مجھے ٹھنڈی تازہ ہوا کی ضرورت نہیں ۔آج میں اپنے بند کمرے میں گھٹ گھٹ کر رونا چاہتا ہوں۔ میں اپنی ان ساری کہانیوں کو اپنے کمرے کی گھٹن میں دفن کرنا چاہتا ہوں تاکہ صبح کوئی نئی کہانی نہ جاگے۔کسی نئی کہانی کا جنم نہ ہو۔ میں نئی صبح کی دلہن کو اندھیاروں میں پیدا ہوتے نہیں دیکھ سکتا......!

راوی جو اس کہانی کا مرکزی کردار اور خود کہانی کار ہے تخلیقی کرب میں مبتلا ہے اور ایک سے بڑھ کر ایک کہانی روپ دھارنے پر تلی ہوئی ہے مگر وہ انجام سے واقف اپنے شاہکاروں کی بے قدری گوارا نہیں کرسکتا۔ وہ بہ بانگِ دُہل کہتا ہے کہ وہ ان کہانیوں کو تشکیل نہیں دے گا۔مگر اپنے آس پاس کے حالات کے ہاتھوں مجبور نہ چاہتے ہوئے بھی حقیقت سے پردہ اُٹھاتا ہے تاکہ اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہوسکے۔ یہ ذمہ داری بحیثیت حساس سماجی کارکن اور مخلص انسان اُس نے خود اپنے اوپر عائد کردی ہے۔اسی سے اُس کا ضمیر زندہ ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اتنا کرسکتا ہے کہ خودنمائی سے بچنے کے لئے اپنی اَنا کو دبائے رکھے۔ بڑ بول اور بلند آہنگی کا دعویٰ کرے نہ مظاہرہ۔ بالکل دھیمی آنچ پر وہ معجونِ مرکب تیار کرے جو مظلوم اور کمزور کے درد کے لئے مجرب ہو۔ چنانچہ نورشاہ خواص کے بجائے عوام کے فن کار ہیں۔ اُنہیں پاپولر کہانی کار کہلانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ یہی اُن کے فن کی کامیابی ہے۔

نورشاہ کے افسانوں کی حقیقت سمجھنے کے لئے یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وہ جذباتیت اور ہیجان انگیزی سے بہت حد تک گریز کرتے ہیں۔اُنہیں معلوم ہے کہ جذباتی اور ہیجان انگیز تخلیقات میں ہماری دل چسپی خطرناک رجحان ہے کیوں کہ اِس طرح ہم ٹھوس حقائق کا سامنا کرنے کے عمل سے بچنا چاہتے ہیں۔ اِدھر استحصال کی قوتوں کا ایک خطرناک حربہ یہ بھی ہے کہ ستم کشوں کو، مبہم اور گمراہ کن لسانی روّیوں میں اُلجھایا جائے اور اُن کے جذبات کو اس طرح اُبھارا جائے کہ وہ اِس کی رو میں بہہ کر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کی صلاحیت سے محروم

ہوجائیں۔نورشاہ جیسا خاموش طبیعت اور بردبار فنکار کسی استحصالی کی نقاد کے بہکاوے میں نہیں آتا، وہ اپنے مشن پر مسلسل کام کرتا ہے وہ کسی صلے یا کسی کی واہ! واہ! کے بھوکے نہیں ہیں۔ فکشن کی دُنیا کا یہ مجذوب زندگی کی بھیڑ میں کھوجانے کے بجائے اپنی انفرادیت کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنی تخلیقی دُنیا آباد کرنے میں مصروف ہے۔

............●●● ....

● ...... ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

نور شاہ: کشمیر میں اردو افسانے کا سرخیل

ریاست جموں وکشمیر میں جب بھی اردو افسانے کی تاریخ لکھی جائے گی تو نور شاہ جیسے کہنہ مشق اور ہمہ جہت فکشن نگار کا خصوصی ذکر کئے بغیر وہ نامکمل رہے گی۔

نور شاہ نے اپنی پوری زندگی علم و ادب کی خدمت میں صرف کر دی ہے۔ دراصل جب ایک باذوق قلمکار کثیر مطالعے، گہرے مشاہدے اور عملی مشق کا عمل جاری رکھتا ہے تو اس کی تخلیق کاری میں وہ تمام عوامل ایک تدریجی ارتقا کے ساتھ معرض وجود میں آ جاتے ہیں جو اس کی تخلیق کو مقام ارفع تک پہنچاتے ہیں۔ نور شاہ کے ادبی فن پاروں میں زبان و بیان کی سحر انگیزی، موضوعاتی تنوع، فنی لوازمات کی کارفرمائی، نفسیاتی و جنسی الجھنوں اور کجرویوں کا بے باکانہ اظہار دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کشمیر کی تہذیب و ثقافت اور ان تمام دلکش و روح افزا مقامات کی بھی کہیں کہیں منظر کشی کی ہے جنہیں دیکھنے کے لئے دنیا کے مختلف ممالک کے لوگ کشمیر آتے ہیں لیکن اس بات میں کوئی بھی مبالغہ نہیں ہے کہ نور شاہ کے افسانوں میں جمالیاتی، نفسیاتی اور جنسیاتی مسائل و معاملات کی پیش کش بڑے عمدہ طور و طرز سے در آئی ہے۔ بقول پروفیسر شکیل الرحمٰن:

”حسن کے احساس میں جو تازگی ہے۔ اس کا لطف ہی دیگر ہے۔ نور شاہ کا احساس جمال کشمیر کے رنگ و نور کی دین ہے۔ حسن کا مشاہدہ کرنا اور پھر حسن میں ڈوبتے جانا تخلیقی ذہن کا وہ کارنامہ ہے جو برسوں کی لذت عطا کرتا ہے۔ یہاں کشمیری نمکین چائے کا لطف وہی لے سکتے ہیں جو چائے کے رنگ اور

اس کی لذت سے کبھی آشنا ہوں۔ نور شاہ کی عمدہ فنکاری کا ثبوت وہاں بھی ملتا ہے جہاں وہ جسم کی تشنگی کا نقش احساس اور جذبے سے ہم آہنگ کردیتے ہیں۔''

(ذکر نور شاہ کی نئی کہانیوں کا۔ مشمولہ۔ ماہنامہ ''لفظ لفظ'' مدیر۔ زاہد مختار۔ سرینگر کشمیر۔ ص ۴۴)

نور شاہ کے افسانوں میں موضوعاتی بوقلمونی اور زبان و بیان کی حسن کاری ایک سنجیدہ قاری کو روحانی حظ اور ذہنی بالیدگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ کسی وقوع پذیر سماجی، سیاسی، معاشی، نفسیاتی، جنسی اور مذہبی واقعے کو فنی لوازمات کے ساتھ کہانی بند کرنا آسان نہیں ہوتا۔ کہانی میں معمولی سا بھی جھول پیدا ہو جائے تو کہانی کہانی نہیں رہتی لیکن نور شاہ کی برس ہا برس کی محنت و ریاضت کے سبب ان کی کہانیاں فنی اعتبار سے بھی خاصی جاندار معلوم ہوتی ہیں۔ اس فنی و فکری ارتکاز کی رو سے اگر یہ کہا جائے کہ نور شاہ کے افسانے زندگی رنگ افسانے ہیں۔ جن میں ادبی چاشنی اور تخلیقی شعور کی نورانیت موجود ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ میرے لئے یہاں یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ نور شاہ کی افسانوی کائنات سے ماخوذ چند افسانوں کے اقتباسات بطور نمونہ پیش کروں تاکہ قارئین بذات خود نور شاہ کی تخلیقی ذہنیت اور ان کی زبان و بیان پہ دسترس کو نہ صرف بہتر طور پر سمجھ سکیں بلکہ لطف اندوز بھی ہوں۔ اس سلسلے میں ''خوشبو کا سفر'' ''رات کا سورج'' ''اس کی گلی کا پاپ'' ''لکیریں'' ''زمین کھولے گی زبان اپنی'' ایک لمحے کی جنت ''ہیلنگ ٹچ'' ''بے ثمر سچ''، ''اندھیرے اجالے'' ''علیا اور بلبل'' ''مرغابی'' بٹوت کی آخری رات'' ''تتلی اور'' آسمان، پھول اور لہو'' پیش کئے جاسکتے ہیں۔

افسانہ ''خوشبو کا سفر'' میں نور شاہ نے جہاں وادئ کشمیر کے ایک دلکش سیاحتی مقام گلمرگ کا ذکر بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے تو وہیں اس افسانے میں غلام محمد جیسے شخص کا ذکر بھی آیا ہے کہ جو اپنی گھوڑی بلبل پہ آج تک کتنی ہی عورتوں کو سواری کروا چکا ہے۔ وہ تیس سال سے یہ کام کر رہا ہے۔ اس لئے اسے بھانت بھانت کی عورتوں کو بہت قریب سے دیکھنے سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن گوری نام کی میم صاحبہ کا نیم عریاں وجود غلام محمد کو خیالوں ہی خیالوں میں ایک حسین جہاں میں پہنچا دیتا ہے۔ نور شاہ نے اس افسانے میں فطری مقامات کی خوبصورتی میں

نسوانی حسن کی دلکشی کو بیان کیا ہے۔ مثلاً مذکورہ افسانے کے مرکزی کردار غلام محمد کے ذاتی تجربے کو انہوں نے ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کروایا ہے۔

''اپنی تیس سالہ زندگی میں مجھے تین چیزوں سے لگاؤ رہا ہے۔ گلمرگ کی ہریالی، بلبل کی خوبصورتی اور جوان عورتوں کے جسم۔ لیکن جب میں نے گوری میم صاحب کو دیکھا تو اپنے وجود کو ہی بھول بیٹھا۔ اسے دیکھ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ دھرتی مدتوں سے اس کے قدموں سے دھڑکتی رہی ہے۔ وہ مجھ سے چند قدم آگے جارہی تھی بلبل کی لگام تھامے۔ اس کی کمر کا خم نمایاں تھا۔ کولہوں کا ابھار چلنے کے انداز سے متحرک تھا۔ وہ ایک مجسمہ تھی اور مجسمہ ہر لحاظ ہر زاویے سے مکمل تھا۔''

نور شاہ کا سماجی مطالعہ و مشاہدہ نہایت گہرا اور باریک بینی سے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے جنس کو انسان کی بہت بڑی کمزوری قرار دیا ہے۔ افسانہ ''اس کی گلی کا پاپ'' اسی سلسلے کا ایک مایوس کن رخ ہے جس میں انہوں نے ایک دوشیزہ زیب اور اشفاق کی باہمی محبت کو ارتکاب گناہ کے طور پر پیش کیا ہے کہ کس طرح اشفاق زیب پر فریفتہ ہوتا ہے اور وہ ایک ناجائز اولاد کو جنم دیتی ہے۔ وہ بدنامی کے داغ سے بچنے کے لئے اپنے نوزائدہ بچے کو ایک گلی میں بے سروسامانی کی حالت چھوڑ دیتی ہے۔ اسی افسانے میں آصف اور حاجی صاحب کا ذکر افسانے میں کچھ ایسے موڑ پیدا کرتا ہے جو قاری کو نئی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ نور شاہ نے اس افسانہ میں اپنی فنی بصیرت کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے وہ قابلِ ملاحظہ ہے:

''زیب میرے قریب آئی۔ پھر ہم دونوں قریب آئے۔ خیالوں میں شہنائیاں بابل کے گیت گاتی رہیں سکھیاں ہاتھوں میں مہندی رچاتی رہیں۔ سرخ جوڑے پہناتی رہیں اور شام کی تنہائی میں زیب کی زندگی پر پڑی ہر نقاب کو الٹتا چلا گیا۔ پھول میں جب تک آخری جھونکا رہتا ہے۔ بھونرا اس کے اردگرد منڈلاتا رہتا ہے۔ شمع کی آخری لو تک پتنگا اردگرد گھومتا رہتا ہے۔ میں نے بھونرا بن کر زیب کی زندگی کا آخری سانس بھی اپنی سانسوں میں اتار لیا۔ اس کا سارا رس نچوڑ لیا۔ میں خود جل کر راکھ بن چکا تھا۔ بے خود بن چکا تھا اور زیب ماں بن چکی تھی۔''

عموماً ہمارے سماج میں پیار، محبت، عشق اور چاہت کی جذباتی دنیا کے کھیل تماشے اس

طرح کے بھیانک اور مایوس کن حالات وواقعات کا باعث بنتے ہیں جس کی طرف نور شاہ نے بڑے ہنر مندانہ انداز میں اشارے کیئے ہیں۔

افسانہ ''زمیں کھولے گی زبان اپنی'' کا تعلق احساسِ جرم یا احساس گناہ سے ہے۔ وشال اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔قومی شاہراؤں اور چھوٹے بڑے شہروں میں ہر روز کوئی نہ کوئی جانی حادثہ سڑک پار کرتے واقع ہوتا ہے۔ کئی ڈرائیور لوگ تیز رفتاری اور غیر ضابطگی کی وجہ سے جانوروں اور انسانوں کو روندتے ہوئے فرار ہو جاتے ہیں۔ وشال سے بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔وشال کی گاڑی کے نیچے ایک نوجوان کچلا جاتا ہے اور وہ موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گاڑی بڑی تیز رفتاری سے بہت دور لے جاتا ہے۔ پولیس کی پوری تحقیقات کے باوجود ملزم گرفت میں نہیں آتا ہے لیکن ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود وشال کو رات بھر اس کچلے ہوئے نوجوان کی شکل وصورت خوابوں اور خیالوں میں ڈراتی ہے اور وہ پریشانی وگھبراہٹ کے عالم میں بالآخر اپنے آپ کو پولیس کے سپرد کر کے اقرار جرم کرتا ہے۔زیر نظر افسانے میں نور شاہ قاری کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ انسان کا ضمیر اس کے اچھے برے اعمال پہ جھنجھوڑتا ضرور ہے۔

افسانہ ''ایک لمحے کی جنت'' میں کسی حد تک ابہامیت پیدا ہوگئی ہے۔اس افسانے میں ایک ہیڈ ماسٹر کی روداد ہے جو کنوارے پن میں خوبصورت طالب علموں کو ٹیوشن پڑھانے میں ذہانت کے بدلے خوبصورت ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ دینا ناتھ جو دینو کے نام سے مشہور ہے۔ ماسٹر جی کا چپراسی ہے جو ماسٹر جی کی تمام حرکاتِ خبیثہ سے بہت حد تک واقف ہے۔ مالا نام کی لڑکی کا کردار افسانے کے نصف آخر میں آتا ہے جو اپنے بھائی کو ماسٹر جی کے پاس ٹیوشن پڑھانے لاتی ہے اور ماسٹر جی راضی ہو جاتے ہیں۔اس افسانے کی قرأت اشاروں ہی اشاروں میں اس امر کو نشان زد کرتی ہے۔ کہ معمار قوم (ٹیچر) آج کے سماج میں اپنا مقام ومرتبہ کس حد تک کھو چکا ہے۔ مذکورہ افسانے میں بھی نور شاہ نے اپنی زبان کا جادو کچھ اس طرح جگایا ہے۔

''دیکھیئے۔لڑکی بے حد حسین ہو، کنول کے پھولوں جیسا گلاب چہرہ ہو، آنکھوں میں بے حد مستی ہو، آواز میں مٹھاس اور باتیں کرتے سمے پلکیں خود بخود جھک جاتی ہوں۔تو کیا بے کیف وبے رنگ زندگی

میں محبت کی ایک ہلکی سی حرارت کا جذبہ پیدا نہ ہوگا۔ میں اپنی ہی بات کرتا ہوں۔ یوں تو میرا نام دینا ناتھ ہے لیکن سب ہی مجھے دینو کہتے ہیں۔ میری عمر شاید 22 برس کی ہے۔ شاید اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے خود یاد نہیں کہ میں کب کہاں اور کس کے یہاں پیدا ہوا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اور میرے ناپختہ شعور میں کچھ سمجھنے اور کچھ پہنچاننے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو ماسٹر کے گھر میں پایا۔ یہ تو بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ مجھے ایک ایسے گھر میں ایک عورت نے جنم دیا جس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میری ماں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ میرا باپ کون ہے۔ چار سال کی عمر تک تو وہ مجھے گھر گھر گھوماتی رہی اور پھر ایک شام فاقوں سے تنگ آکر اور طعنوں کی تاب نہ سہہ کر مجھے ماسٹر جی کے دروازے پر چھوڑ گئی اور خود نہ جانے کہاں چلی گئی۔"

مذکورہ افسانے سے ماخوذ مندرجہ بالا اقتباس جہاں ایک دوشیزہ کے حسن و جمال اور اس کے پرکشش پہلوؤں کا تصور ایک حسین پیکر میں قاری کے ذہن و دل میں ہلچل سی پیدا کر دیتا ہے۔ تو وہیں دوسری جانب معاشرتی خرابیوں پر سوالیہ نشان قائم کرتا ہے۔ حرام کاری اور حرام خوری کے لئے کس طرح کے حربے استعمال کئے جاتے ہیں۔ نورشاہ کا افسانوی اسلوب بغیر کسی مبلغانہ انداز کے سماجی حقائق اور مسموم ماحول پر گرفت کرتا معلوم ہوتا ہے۔

نورشاہ کے بہت سے افسانوں میں فطری مناظر کے جمال و کمال کے ساتھ ساتھ کئی جمالیاتی و جنسی معاملات و واقعات کی منظر نگاری بھی اتنی دلچسپ اور ادبی لطافت کی حامل ہے کہ بعض موقعوں پہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ نثر میں شاعری کر رہے ہوں۔ افسانہ "بے ثمر سچ" اسی قبیل کا افسانہ ہے جس میں جنس مخالف کا جنسی میلان روح اور جسم کی سرحدوں کو نہیں پھلانگ پاتا ہے۔ واحد متکلم میں یہ افسانہ بیان اور بیانیہ کی کئی تہیں کھولتا ہے۔ شیتل نام کی پرائی عورت کا حسن و جمال۔ بے نام مرد کا غسل خانے کی جانب بڑھنا اور وہاں ایک جوان بے قرار نسائی وجود کا دیدار قاری کو ایک مخصوص و عجیب واقعاتی لمحے سے آشنا کراتا ہے۔ افسانہ نگار نے جس نازک اور پر کیف صورت حال کو سامنے لایا ہے اس میں ان کی بے باکی اور حقیقت شناسی کمال درجے کی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً مذکورہ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے......

''شیتل اپنے مکان کے برآمدے میں کھڑی ہے۔ میری طرف دیکھتی ہے اور ایک ان دیکھی سی مسکراہٹ لئے اپنی خواب گاہ میں چلی جاتی ہے۔ مکان کے آس پاس خاموشی ہے۔ اس خاموشی میں بھی اک شور ہے جو میرے انگ انگ میں حرارت پیدا کر رہا ہے۔ میں پہلے اپنے کمرے کی اور پھر اپنے ذہن کی کھڑکی بند کر لیتا ہوں اور بے آواز قدموں سے شیتل کے مکان کے برآمدے کو پار کر کے اس کی خواب گاہ میں چلا جاتا ہوں۔ کمرہ خالی ہے لیکن کسی جوان جسم کی خوشبو بکھری بکھری سی محسوس ہوتی ہے۔ کوئی صدا کوئی آواز نہیں۔ ہاں صرف خواب گاہ کے ساتھ والے غسل خانے میں مدھم مدھم سی روشنی پھوٹتی نظر آرہی ہے۔ دفعتاً گزرتے ہوئے وقتوں کا ایک رس بھرا لمحہ میرے وجود کی اندھیر نگری میں ایک پل بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور میں اپنی آنکھیں بند کر کے غسل خانے کی جانب سرکنے لگتا ہوں۔ یہاں ایک سراپا ہے۔ ایک روپ۔ ایک جسم...... جوان اور بے قرار۔ لیکن اپنی آنکھیں بند کرنے سے پہلے سے ہی میں ٹھٹھک کر رہ جاتا ہوں۔''

جیسا کہ اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ نور شاہ کے بیشتر افسانوں میں کشمیری تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ کشمیر کے وہ خوب صورت مقامات کہ جنہیں دیکھنے کے لئے ہر سال لاکھوں سیاح دنیا کے ہر ملک سے یہاں آتے ہیں۔ نور شاہ کے افسانوں میں ان تمام دلکش مقامات کی منظر کشی پوری جزئیات کے ساتھ در آئی ہے۔ دراصل ایک شاعر و ادیب جس ماحول و معاشرہ میں پیدا ہوتا ہے۔ پلتا بڑھتا اور شعور و ادراک کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اس پورے ماحول کا جغرافیہ شعوری و لاشعوری طور پر اس کی ادبی زندگی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اپنے وطن کی مٹی اس کے پھل پھول اور قدرتی مناظر اسے بہت پیارے لگتے ہیں۔ وہ دنیا کے کسی کونے میں کیوں نہ جائے مگر انہیں بھلائے نہیں بھول پاتا ہے۔ نور شاہ کو اپنے وطن وادیٔ کشمیر کے ہر شجر و حجر، کوہ و دریا، بیابانوں، آبشاروں اور نظاروں سے بے پناہ محبت ہے۔ ان کے بہت سے افسانے کشمیری تہذیب و ثقافت کی بھرپور عکاسی کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ ''اندھیرے اجالے'' سے ماخوذ یہ اقتباس بطور مثال قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے کہ جس میں نور شاہ نے کشمیر کی تاریخ کو سمیٹا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو......

''کشمیر کی ہر چیز قابل تعریف۔ ہری بھری شاداب وادی، سندر دھرتی، بھانت بھانت کے لوگ، پہاڑ جن کی گود میں ہرے بھرے جنگل ہیں جو آگے پھیل کر ایسی شکھر مالاؤں میں بدل جاتے ہیں جہاں بارہ مہینے برف کا راج رہتا ہے۔ یہاں کے بہتے ہوئے پانی کا رنگ نیلا ہے سبز ہے۔ یہاں پھولوں سے جڑی مرگیں ہیں۔ رنگ برنگے پھولوں سے سجے سنورے تختے ہیں جن کی خوشبو میں سیاحوں اور یاتریوں کی سانسیں رچی بسی ہیں۔ یہ گلمرگ، یوس مرگ، پہلگام، یہ شالیمار ہے۔ یہ نشاط ہے نور جہاں کے خوابوں کا باغ، جہانگیر کی جوانی کی یادگار، یہ ڈل جھیل ہے۔ اس پر چلتی پھرتی ننھی ننھی کشتیاں اور دلہن کی طرح سجے سنورے ہاؤس بوٹ۔ یہاں لدر نالہ ہے جس کا پانی پتھروں سے سر پھوڑتا جھاگ ہوا جاتا ہے۔''

پورے اقتباس میں نور شاہ نے لفظی پیکروں میں اپنے وطنِ عزیز کا جو منظر پیش کیا ہے وہ دل کو موہ لینے والا ہے۔ میں یہاں یہ بات کہے بغیر آگے نہیں بڑھوں گا کہ جس نے جنتِ نظر وادیٔ کشمیر کو ابھی تک نہیں دیکھا ہو۔ اسے نور شاہ کے افسانوں بالخصوص ''اندھیرے اجالے''، ''علیا اور بلبل''، ''بٹوت کی ایک شام''، ''تتلی''، ''میرے حصے کے خواب'' اور ''ایک کہانی کے تین باب'' کو بطور خاص پڑھنا چاہیئے۔

نور شاہ کے افسانوں سے متعلق یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں پیش آمدہ حالات و واقعات اور اس کے دکھ درد اور مسرت و بصیرت کو افسانوی انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ لگتا ہے ہم انسانی فطرت اور خارجی واقعات کے ساتھ مکالمہ کر رہے ہیں۔ یہ ہنرمندی اس بات کی دلیل ہے کہ نور شاہ کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا ہے۔ انہوں نے نہ صرف ناول اور افسانے لکھے ہیں بلکہ بہت سے افسانچے بھی لکھے ہیں جن میں دلچسپی اور دانشوری کا عنصر موجود ہے۔ ۲۰۱۴ء میں کشمیر میں سیلاب کی بھیانک صورتِ حال کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا محسوس کیا اور اسے اپنی تخلیقی ذہنیت کا حصہ بنایا۔ بڑھتی عمر کے باوجود نور شاہ کا افسانوی سفر برابر جاری ہے۔ علم و ادب کے جنونِ عشق میں انہیں تھکان محسوس نہیں ہوتی۔ دراصل ایک سچے اور اچھے قلم کار کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے قارئین کو نئی منزلوں اور نئے آفاق کا پتہ دیتا ہے۔ اپنے تخلیقی شعور و ادراک کے ذریعے وہ آپ بیتی اور جگ بیتی کے نئے نئے

جہاں آباد کرتا ہے۔ یہاں اس بات کی بھی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ نور شاہ کے افسانوی فن پر بھی اظہار خیال کیا جائے۔ تخلیقی فن پارہ فنی لوازمات کا متقاضی ہوتا ہے۔ افسانے میں پلاٹ، کردار نگاری و مکالمہ نگاری، منظر نگاری، ماحول وفضا اور وحدت تاثر کے علاوہ زبان و بیان یہ تمام عناصر وعوامل اپنی اپنی جگہ ایک خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ نور شاہ کے یہاں کہیں تو منظر نگاری سے کہانی شروع ہوتی ہے اور کہیں ڈرامائی اسلوب میں کردار کو متعارف کرواتے ہیں۔ اسی طرح تحیر و تجسس کا بھی وہ خاص خیال رکھتے ہیں یعنی واقعے کی پیشکش میں ایک منطقی ربط قائم کرتے ہوئے اس بات کا دھیان رکھتے ہیں کہ قاری کو افسانے کے اختتام تک مضطرب رکھا جائے اور آخری جملے پر وہ چونک جائے۔ اسی طرح ان کے افسانوں کے کردار ہمارے آپ کے ماحول سے تعلق رکھتے معلوم ہوتے ہیں جو حالات کے جبر اور مسائل کے انبوہ میں زندگی کرتے ہیں۔ نور شاہ کا تازہ افسانوی مجموعہ ''کیسا ہے یہ جنون'' اس بات کا مظہر ہے کہ وہ فن افسانہ نگاری سے کماحقہٗ واقف ہیں اور بہت حد تک انہوں نے راست بیانیہ کو ہی اہمیت دی ہے۔ وہ اپنے قاری کو افسانے کے ذریعے پہلیلیاں بھجوانے کا کام نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے اسلوبِ بیان میں دقیق، بوجھل الفاظ وتراکیب اور غیر مانوس علامتوں، استعاروں، تشبیہوں اور ابہامیت کا عمل دخل پایا جاتا ہے بلکہ وہ تو اپنے تجربات ومشاہدات اور حیات و کائنات میں وقوع پذیر واقعات کو سیدھے سادھے جملوں اور خالص افسانوی زبان کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ نور شاہ کی مقبولیت کا راز اسی بات میں مضمر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

............●●●............

●......محمد سلیم سالکؔ

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

انسان ہمیشہ اپنی یادوں کو سرمایہ سمجھ کر محفوظ رکھنے کی کوشش ازل سے کرتا آیا ہے۔ کیونکہ یادوں کو بیش بہا خزانہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسی لئے بعض لوگ اپنی یادوں کو محفوظ رکھنے کے لئے روزنامچہ یا ڈائری لکھنے کا اہتمام کرتے ہیں، تا کہ غیر معمولی واقعات وحادثات یا دداشتی بیاض میں محفوظ رہ سکے۔ چینی محاورہ مشہور ہے کہ اگر بات کو مختصر وقت کے لئے یاد رکھنا ہے تو ذہنی یادداشت پر بھروسہ کرسکتے ہیں لیکن جب بات کو صدیوں تک محفوظ رکھنے کا ارادہ ہو تو اس کو تحریری صورت دینا ناگزیر ہے۔

ڈائری میں مصنف نہ صرف اپنی روز مرہ مصروفیات کا انکشاف کرتا ہے بلکہ اپنی انفرادی شخصیت کی سچی تصویر بھی پیش کرتا ہے۔ ڈائری کی مدد سے ہم مصنف کی شخصیت کے ان پہلوؤں سے واقف ہو جاتے ہیں جو کہیں اور کسی ذریعہ سے ملنا ناممکن ہوتے ہیں۔ ان سے نفسیاتی مطالعہ میں بڑی مدد ملتی ہے ساتھ ہی تجربات اور معلومات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ عام طور پر ڈائری لکھنے والے کچھ محتاط ہو کر لکھتے ہیں اور بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو بے کم وکاست اپنے تاثرات کو صفحہ قرطاس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ڈائری کے مطالعہ سے مصنف کے رجحان، ذوق، پسند اور زاویۂ نگاہ سے بخوبی واقفیت ہوتی ہے۔

انگریزی زبان میں ڈائری لکھنے کا باقاعدہ آغاز ایولن (Eveln) اور پیپس (Pepys) نے اٹھارویں صدی کے شروع میں کیا۔ انگریزی زبان کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس میں

ڈائری کا سلسلہ بہت دیر تک چلا، جو آج بھی جاری و ساری ہے۔ اردو میں ڈائری تذکروں کی شکل میں ملتی ہے قدیم شعرأ جب کسی کے متعلق اپنے تاثرات ڈائری میں قلمبند کرتے، تو کچھ باتوں کا خاص اہتمام کرتے جن میں شاعر کے مختصر حالات و کلام پر اپنی ذاتی رائے اور کلام کا مختصر انتخاب ہوتا جو بعد میں ادبی تاریخ رقم کرنے میں بہت معاون ثابت ہوتے رہے۔ انشاؔ نے باقاعدہ ترکی زبان میں روزنامچہ تحریر کیا۔ لیکن اُردو میں ادبی ڈائری لکھنے کا سہرا مولوی مظہر علی سندیلویؔ کے سر ہے جنہوں نے باقاعدہ اس صنف میں پیش رو کی حیثیت حاصل کی لیکن بعد میں اس کی کوئی خاص روایت نہ چل سکی، البتہ خواجہ حسن نظامیؔ نے سالہا سال دائری پابندی سے لکھی۔ اختر انصاریؔ کی ادبی ڈائری بہت مشہور ہوئی۔ انہوں نے اپنے معاصرین کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ مشہور معروف مزاح نگار ابن انشا نے ''آوارہ گرد کی ڈائری'' اور قاضی عبدالغفار نے ''مجنون کی ڈائری'' کے عنوان سے بڑی دلچسپ کتابیں لکھیں، جن میں اس دور کی عکاسی ملتی ہے۔

جہاں تک نور شاہؔ کا تعلق ہے انہوں نے ادب میں صنف افسانہ کے حوالے سے ایک اعلیٰ مقام پایا ہے۔ اس کے علاوہ ناول اور ڈرامے لکھ کر اپنی تخلیق تشنگی کو بھی کسی حد تک تکمیل کو پہنچایا ہے لیکن کچھ عرصہ سے وہ اپنے ماضی کے حسین دریچوں کو وا کرنے میں خوشی محسوس کررہے ہیں۔ اُس وقت کے ہفتہ روزہ اخبار اور موجودہ روزنامہ ''کشمیر عظمیٰ'' میں بلاناغہ اور باقاعدہ اپنی ڈائری کے اوراق قلمبند کررہے ہیں جو ریاست میں ڈائری رقم کرنے کی نقش اول کوشش ہے۔

شاہ صاحب کی ادبی ڈائری یادرفتگان پر مشتمل ہے۔ انہوں نے ریاست میں ہونی والی ادبی اور ثقافتی چہل پہل کو بہت قریب سے دیکھا ہی نہیں ہے بلکہ ایک جز ولاینفک حصہ ادا کیا ہے۔ ان کا ادبی سفر پچاس سال کو محیط ہے جو اپنے آپ میں ایک کارنامہ ہے۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً غیر معمولی واقعات کو خام مواد کی صورت میں جمع کیا تھا جو اب ڈائری کے قالب میں سما گیا ہے۔ شاہ صاحب کی ادبی ڈائری کی سب سے بڑی خوبی زبان کا تخلیقی برتاؤ ہے۔ انہوں نے ڈائری میں قلمی خاکے، ہمعصر ادبأ کے تعلقات، رسائل کی ورق گردانی اور ناسٹیلجیا کے لاشعوری نہاں خانوں کے پردے اٹھائے ہیں۔

شاہ صاحب کی ادبی ڈائری ہفتہ روزہ اخبار ''کشمیر عظمیٰ'' میں باون قسطوں میں سلسلہ وار شائع ہوئی۔ ڈائری کسی منصوبہ بند طریقے پر قلم بند نہیں کی گئی ہے بلکہ مصنف نے مختلف اوقات میں اپنی یادداشت رقم کی ہے۔ اس لئے تاریخی تسلسل قائم نہیں رہ سکا ہے۔ ان اوراق میں مصنف کی دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی ہے جو قاری کو مسحور کرنے کے لئے کافی ہے۔ ڈائری کا سرسری مطالعہ کرنے سے ہی پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک افسانہ نگار کی ڈائری ہے اکثر و بیشتر اوراق میں افسانہ اور افسانہ نگاروں کے متعلق پڑھنے کو ملتا ہے۔ بین الاقوامی سطح کے افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی، کرشن چندر، ٹھاکر پونچھی، موہن یاور کے ساتھ ساتھ ان افسانہ نگاروں کا ذکر بھی مفصل ہے جن کا ادب کے ساتھ سچا کمٹ منٹ تھا لیکن گردشِ زمانہ کے ہاتھوں اوراق پارنیہ کی حیثیت اختیار کر گئے۔ جن میں وجے سوری، رام کمار ابرول، پشکر ناتھ، سوم ناتھ زتشی، غلام رسول سنتوش، علی محمد لون، محی الدین شاہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ریاست میں افسانوں کے حوالے سے جائزہ بھی لیا ہے خصوصاً جب بشیر گاش کی ترتیب کردہ افسانوی مجموعہ کی بات کرتے ہیں تو صاف لفظوں میں یہ اعتراف کرتے ہیں ''کہ بشر گاش نے ''ارمغانِ کاشمر'' کا ایک تفصیلی دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں پھولوں کی مہک بھی ہے اور کانٹوں کی چبھن بھی، کڑواہٹ کچھ زیادہ ہی ہے اس کڑواہٹ کا ذمہ وار کسی حد تک میں بھی ہوں''۔ اسی طرح اپنی افسانہ نگاری کی وجہ تسمیہ بھی بلاخوف وتردو بیان کرتے ہیں۔

''یہ بات شاید بہت کم نئے قلم کار، کہانی کار، شاعر، ادیب اور قارئین جانتے ہوں گے کہ میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک زمانہ شاہدہ شریں سے کیا تھا۔ اب میرے ان دوستوں کے ذہن میں ایک سوال ابھرا ہوگا کہ میں نے اپنی جنس کب، کہاں اور کیسے تبدیل کر دی، نور شاہ سے شاہدہ شریں اور شاہدہ شرین سے نور شاہ کیسے بن گیا،...... ایک کہانی اردو دنیا کے ایک نامور مدیر کے نام ارسال کی، کہانی ارسال کرنے کے لمحے سے اس وقت تک یعنی جب تک مدیرِ محترم کا جوابی رقعہ نہیں ملا۔ دل کئی کئی زاویوں سے سوچتا رہا، جواب آیا اور جواب وہی تھا جو نئے نئے لکھنے والوں کو عام طور سے ملتا ہے یعنی آپ کی کہانی رسالے کے معیار پر پوری نہیں اُترتی اور ہم

اسے شائع کرنے سے معذور ہیں۔ اپنی کہانی کا یہ انجام دیکھ کر ظاہر ہے دل ٹوٹ گیا ہوگا لیکن افسانوی ذہن ایک اور چال چلا۔ اب میں نے کہانی اور اپنا نام بدلنے کی ٹھان لی.........

بہر حال نئے عنوان اور نئے نام سے کہانی مدیر محترم کو بھجوائی گئی، اب کے جو خط ملا وہ نہایت ہی دلچسپ تھا۔ یہ بات آپ کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوگی کہ وہی کہانی دوسرے نام یعنی ایک خوبصورت نسوانی نام سے شائع ہوئی اور اس طرح شاہدہ شریں کا جنم ہوا''۔

طویل اقتباس دینے کا یہی مقصد ہے شاہ صاحب کی ذہنی کیفیت کو سمجھا جائے۔ ورنہ آج کے دور میں سچائی کا ذکر کرنا کارے اردو والا معاملہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان اعترافات کو پڑھ کر ہر سنجیدہ قاری کے دل میں شاہ صاحب کے لئے عزت بڑھے گی۔

شاہ صاحب نے ان محفلوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جن میں وہ دوسرے ادیبوں کے ساتھ محفلیں جماتے تھے۔ ساتھ ہی معاصرین کی عزت افزائی اور نئی نسل کی حوصلہ افزائی کے نمونے بھی ملتے ہیں جو ایک بڑے فنکار کی نشانی مانی جاتی ہے۔ ڈائری میں پرانے رسائل کی ورق کردانی بھی ملتی ہے۔ ''بیسویں صدی'' کا ذکر کئی بار آیا ہے وہ اس لئے کہ مصنف کو پورے ایشیاء میں متعارف کرانے میں ''بیسویں صدی'' کا خاص رول رہا ہے۔ لیکن ماہنامہ ''کتاب'' کی اُس کوشش کو بھی سراہا ہے جب انہوں نے اردو افسانے کے حوالے سے ایک ایسا سوال نامہ مرتب کیا تھا جس کی اہمیت وافادیت آج بھی مسلم ہیں۔ شب خون بند ہونے پر افسوس ظاہر کرتے ہیں تو نئے رسائل اجرا ہونے پر مبارک باد بھی دیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اگر انسان اپنی پشتینی جگہ سے ہجرت کرے تو پھر بھی لاشعور کے نہاں خانوں میں وہ جگہ موجود رہتی ہے جو تخلیق کار کی تحریروں میں گاہ بگاہ نادانستہ طور در آتی ہے۔ شاہ صاحب نے زندگی کا بہت حصہ ڈل کے کنارے پر گزارا ہے جس کے آثار ان کے افسانوں میں بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن ڈائری کے اوراق پر بھی اس کے اثرات نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔

''زبرون اور مہادیوں کے برف پوش پہاڑ اسی کائنات کا ایک حصہ ہیں اور ان پہاڑوں کی گود میں محوخواب ڈل جھیل کتنی بڑی پیاری دنیا ہے۔''

شاہ صاحب نے ڈائری میں افسانوی اسلوب اپنا کر ڈائری کو دلچسپ اور دلآویز بنایا ہے جس سے قاری ڈائری کے اوراق پڑھتے ہوئے کوئی تھکن محسوس نہیں کرتا بلکہ ایک ورق پڑھنے کے بعد دوسرا ورق پڑھنے کی خواہش بڑھ جاتی ہے، جو اس ڈائری کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ڈائری میں غیر محسوس طریقے پر ریاست کی سماجی، ادبی اور ثقافتی پہلوؤں پر اتنا مواد جمع ہوا ہے کہ جب بھی ریاستی سطح پر کوئی تاریخ مرتب کی جائے گی تو شاہ صاحب کی ڈائری کو نظر انداز کرنا ناممکن ہوگا۔

غرض شاہ صاحب کی ڈائری کا غائر مطالعہ کر کے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے پوری زندگی میں ادب کو سنجیدگی سے لیا ہے۔ جہاں تک ڈائری کا تعلق ہے، اس میں غیر جانبدارانہ طرز تحریر اپنا کر ایک نیا اسلوب اپنانے کی کوشش کی ہے، جو قابلِ تعریف ہی نہیں بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔

............●●●............

●...... فاروق احمد وانی

نور شاہ کے افسانوں میں رومانیت

اردو ادب میں جہاں کئی تحریکیں رونما ہوئیں وہیں کئی رجحانات بھی وقتاً فوقتاً رونما ہوتے رہے۔ اردو کی ادبی تاریخ کا کوئی بھی دور تحریکات ورجحانات سے خالی نہیں رہا۔ ہر زمانے میں ہمارے ادیب وشاعر کسی نہ کسی تحریک یا رجحان سے وابستہ رہ کر سرگرم عمل رہے۔

اردو ادب کی ان تحریکوں میں ایہام گوئی کی تحریک، فورٹ ولیم کالج کی تحریک، علی گڑھ تحریک، انجمن پنجاب کی تحریک، رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک، جدید تحریک اور مابعد جدید تحریک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ تحریکیں اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں رونما ہوئیں۔ ان میں بعض تحریکات کا اثر بہت جلد ختم ہوگیا اور بعض کا اثر ابھی تک دکھائی دے رہا ہے۔ اگر ہم رومانی تحریک کی بات کریں تو یہ تحریک علی گڑھ تحریک کے ردعمل میں پیدا ہوئی ہے اور اس کا تصور انگریزی ادب سے اردو ادب میں آیا ہے۔ اس تحریک سے وابستہ طبقہ مقصدیت کی بجائے تخیل کی کارفرمائی اور جذبہ اور خیال کی آزادی چاہتا تھا۔ اس تحریک سے وابستہ ادیبوں نے جو ادب لکھا، وہ رومانی ادب کہلایا۔ پروفیسر احتشام حسین رومان کے بارے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"رومان سے مراد حسن وعشق کا افلاطونی اور تخیل بیان نہیں بلکہ روایات سے بغاوت، نئی دنیا کی تلاش، خوابوں اور خیالوں سے محبت، ان دیکھے حسن کی جستجو، وفور تخیل اور وفور جذبات، انانیت میں ڈوبی ہوئی انفرادیت، آزادیِ خیال، حس سے لطف اٹھانے میں ناآسودگی کا احساس اور اس

کا کرب۔ان سب کو میں رومانیت کہتا ہوں، رومان اسے بھی کہتا ہوں جو حقائق کی جستجو ، مادی اسباب سے زیادہ خیالات وتصورات کی رنگین دنیا میں کرتا ہے۔''

انور سدید، اردو ادب کے ارتقا میں تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، ۱۹۹۶ء، ص ۳۲۲

رومانی تحریک کے پانچ اہم پہلو جن پر زور دیا جاتا تھا درج ذیل ہیں۔جذباتیت میں انتہاپسندی، فطرت پسندی، عقل سے بیزاری، مسرت کی تلاش اور ماورائیت قابل ذکر ہیں۔اس تحریک کا آغاز سرسید احمد خان اور الطاف حسین حالؔی کی اصلاحی تحریک کے بعد ہوا۔اس کے اولین نمونے عبدالحلیم شرر کی تخلیقات میں نظر آتے ہیں۔اس کا اثر براہ راست شعروادب پر پڑا۔اس تحریک سے وابستہ ادیبوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مہدی افادی، سجاد انصاری، نیاز فتح پوری، امتیاز علی، مجنوں گورکھپوری، سجاد حیدر یلدرم، عنایت اللہ دہلوی، جلیل قدوائی، ظفر قریشی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ملکی سطح کے ان ادیبوں کا اثر ریاستی سطح کے ادیبوں پر بھی پڑا۔ریاست جموں وکشمیر کے ادیب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔اس تحریک سے متاثر ہونے والے ادیبوں میں پریم ناتھ پردیسی، محمد دین فوق، پریم ناتھ در، تیرتھ کاشمیری اور نور شاہ وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں نور شاہ رومانی ادب میں پیش پیش رہے ہے۔نور شاہ بنیادی طور پر رومانی افسانہ نگار ہیں۔ان کے زیادہ تر افسانوں میں رومان کا عکس نظر آتا ہے۔ان کے ابتدائی افسانوں میں تخلیقی فن کی عام روش، حسن فطرت سے محبت اور عام قارئین کی پسندیدگی کے سبب ان کی کہانیوں پر حسن پرستی اور رومانیت کا غلبہ دکھائی دیتا ہے اور بعض ناقدین کی نظروں میں رومانیت نور شاہ کے فن کی بنیادی شناخت ہے۔نور شاہ اپنے افسانوں میں رومانی طرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں:

''مجھے اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ میرے افسانوں کے اکثر وبیشتر کردار رومانوی ہیں۔میرا ماننا ہے کہ زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے پھوٹتے ہیں، زندگی حسن وعشق سے عبارت ہے اور نسل آدم کی بقا ان سے قائم ہے۔میری کہانیوں میں ہر دم اور ہر آن حسن کی

پرچھائیاں منڈلاتی نظر آتی ہیں۔شاید میں بہت زیادہ حسن پرست ہوں اور شاید اسی لیے حسین جلوؤں اور منظروں کو اپنے قلم کے کیمرے میں اتار کر میں اندر چھپے ہوئے افسانہ نگار کی حسن پرستی کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرتا ہوں۔" نور شاہ، گیلے پتھروں کی مہک (افسانوی مجموعہ)ص ۷

نور شاہ ایک تخلیقی فن کار ہیں۔ان کی تخلیقات کا پس منظر ریاست جموں وکشمیر کی خوبصورت وادیاں، دلفریب مناظر اور صحت افزا مقامات ہیں۔ان کی عکاسی وہ بڑی ہنر مندی سے کرتے ہیں۔انہوں نے جوانی کے ایام ڈل جھیل کے اردگرد کے ماحول میں گزارے اور اسی ماحول سے ترغیب پا کر انہوں نے افسانے کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا اور عمر بھر اس کے ہو کر رہ گئے۔

نور شاہ کے افسانے موضوع، کردار نگاری، مکالمہ نگاری وغیرہ کے لحاظ سے انوکھے ہیں۔پروفیسر شکیل الرحمٰن نور شاہ کے افسانوں میں رومانی خصوصیت کے متعلق رقمطراز ہیں:

"نور شاہ کے رومانی کردار اجنبی نہیں، ان سے حقیقت کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔"

معروف افسانہ نگار اور ادیب ڈاکٹر منصور احمد منصور نور شاہ کی افسانہ نگاری کے متعلق رقمطراز ہیں:

"نور شاہ کے افسانوی فضا پر رومانیت کی شفق چھٹکی ہوئی ہے، وہ زندگی کے ہر انداز اور پہلو کو اس کج رویوں اور غلط کاریوں کو رومان میں گوندھ کر پیش کرتے ہیں۔ان کے فکر ونظر کے پس پردہ رومان کی جو ٹھاٹھیں مارتی ہوئی لہریں ہیں، وہ ہر چیز کو بھگو کر رکھ دیتی ہیں۔چنانچہ نور شاہ کے یہاں بھرپور رومانی فضا تنی ہوئی ملتی ہے۔"

ڈاکٹر منصور احمد منصور، پریم ناتھ در اور جدید افسانہ

نور شاہ کی رومانیت موضوع اور اسلوب کے علاوہ واقعہ بھی رومانی فکر کے سانچے میں ڈھلا ہوا ملتا ہے۔افسانہ "پتھر دل" سے ایک اقتباس دیکھیں:

"یہی موسم!۔۔یہی وقت!۔۔یہی راستہ!!

اپنی تاریکیوں میں تاروں بھری راتوں کی جگمگاہٹ جگائے ہوئے۔میری نگاہوں کے سامنے

دیکھتے دیکھتے موسم، وقت اور راستے میں ایک عجیب سا تصادم ہوا فضاؤں، غنودگی، کہانیوں کی کہکشاں اور راتوں کی جگمگاہٹ ایک دوسرے میں غیر اختیاری طور پر تحلیل ہوگئیں اور ایک نئی خوش بخت کہانی کی صبح جاگی!۔'' نورشاہ، بے گھاٹ کی ناؤ (افسانوی مجموعہ)، ص ۴۸

افسانہ ''میری آرزو میری تمنا'' بھی ایک رومانی افسانہ ہے۔ یوں تو نورشاہ زندگی کی حقیقتوں کا افسانہ نگار ہیں۔ نورشاہ نے جس دور میں افسانے لکھنے شروع کیے، وہ دور رومان کا دور تھا لیکن ان کے یہاں محض تصوراتی وتخیلاتی رومان نہیں ہے بلکہ نورشاہ کے افسانوں میں حقیقت کی تپتی زمین میں کھلنے والا رومان ملتا ہے جو نورشاہ کے فن کارانہ رویے کے سبب بے حد فطری ہوگیا ہے۔ اس افسانے میں ایک ڈاکٹر راجندر اور ایک گلوکارہ شانتا کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ جذبات میں ڈوبی ہوئی ہلکی پھلکی کہانی، حسین اور پُر درد انداز میں دھیمی دھیمی جذباتیت کے ساتھ تصور وتخیل، تشبیہ واستعارہ کی مدد سے کامیابی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ اس افسانہ کا ایک اقتباس دیکھیں:

''یہ تنہا گوشہ ہمارے ملاپ کا مندر ہے، آؤ یہاں پھول چڑھائیں۔۔۔۔۔اور پھر آج ہماری شادی کی پہلی سالگرہ بھی تو ہے۔۔۔۔ راجندر نے شانتا کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے چوم لیا۔ نہرو پارک کی شام نہ جانے کب سے منتظر تھی اس مختصر لمحے کے لیے۔''[۱۰]

نورشاہ، بے گھاٹ کی ناؤ (افسانوی مجموعہ)، ص ۱۰۳

''بارش کا پہلا قطرہ'' ایک رومانی افسانہ ہے، جس میں ایک ڈاکٹر کی روداد بیان کی گئی ہے جو قریب المرگ مریضوں کا علاج کرتا ہے، لیکن خود اپنے دل کی محبت میں ناکامی کا روگ پالے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر ہونے کے ناطے مریضوں کی زندگی بچانا اس کا کام اور فرض ہوتا ہے۔ آخر میں ایک مریضہ شفیقہ نام کی لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔ اس افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ڈاکٹر۔۔۔کہو۔۔۔تم نے کبھی پیار کیا ہے؟

میں اپنی پلکیں اٹھا کر دیکھ رہا ہوں، سینی ٹوریم کی طرف۔ اب میں کھڑکی کے اور قریب

آ گیا ہوں۔ میں نے اپنا بازو کھڑکی سے باہر پھیلا دیا ہے۔ بارش کا پہلا قطرہ میری ہتھیلی پر کانپ رہا ہے اور میرے من کی اجڑی ہوئی بنجر دھرتی میں ایک بار پھر شگاف سا پڑ گیا ہے۔''

نورشاہ، گیلے پتھروں کی مہک (افسانوی مجموعہ)، ص ۱۴۱

افسانوی مجموعہ ''بے ثمر سچ'' میں دیپک بدکی نے نورشاہ کی عظمت اور انفرادیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''نورشاہ افسانہ نگاری کے اس رومانی اسکول سے وابستہ رہے ہیں، جو سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری سے جاملتا ہے۔ ان کے یہاں عشق کی جولانیاں ہیں۔ ہجر کی کسک، انتظار کی وارفتگی ہے اور ملن کی آشا ہے۔''

نورشاہ، بے ثمر سچ (افسانوی مجموعہ)، ۲۰۰۵ء، ص ۱۲

نورشاہ کے اکثر افسانے رومانی ہیں۔ ''زنجیریں، دائرے، آگ اور دھواں، جو میرے قریب، خوابوں کا سفر، بند آنکھوں کا سفر، تیسرا شوہر، ایک زخم اور سہی، کل کا دکھ، میرے حصے کا خواب'' وغیرہ عمدہ افسانے ہیں۔ یہ سارے افسانے نورشاہ کی فنی بصیرت کی دلیل ہیں۔ افسانہ ''دائرے'' جو ڈائری، خطوط اور اخباری خبر کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار پروفیسر احمد فرقان نامی شخص ہے جو اپنی ملازمت کی وجہ سے اپنی شریک حیات زیتون سے جدا ہو جاتا ہے اور اسے خط میں لکھتا ہے کہ تم سے جدا ہونے کے بعد مجھے سارا جہاں ویرانہ سا لگ رہا ہے۔ سلمیٰ اس افسانے کا ایک اہم کردار ہے۔ سلمیٰ پروفیسر کے پاس پڑھنے کے لیے آتی ہے، مگر پڑھنے کی بجائے وہ پروفیسر سے رومانی انداز کی باتیں چھیڑتی ہیں۔ افسانے کا ایک قتباس ملاحظہ فرمائیں:

''عجیب سی لڑکی ہے، میں جب غالب کی بات چھیڑتا ہوں تو وہ عامر خان کی اداکاری کی تعریف کرنے لگتی ہے۔ میں اردو ادب میں جدیدیت کی بات کرتا ہوں تو وہ سائرہ بانو اور دلیپ کمار کی شادی کا پس منظر پیش کرتی ہے اور کہتی ہے کہ ان دونوں کی عمروں میں کس قدر تفاوت ہے اور پھر وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہے، اور اسی لمحے مجھے اس کی آنکھوں میں چھپی بغاوت سے

خوف آنے لگتا ہے، میں اپنی نظر پھیر لیتا ہوں۔"

نور شاہ، آسمان پھول اور لہو (افسانوی مجموعہ) ۲۰۰۵ء، ص ۱۵۸

"جو میرے قریب ہے" رومانی نوعیت کا افسانہ ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار نیلی ہے، جو محبت کے مفہوم سے صحیح طور پر نا آشنا ہے۔ وہ پانچ اشخاص سے یکے بعد دیگرے محبت کرتی ہے۔ ایک ایک کر کے وہ سب کو چھوڑ دیتی ہے۔ آخر میں اسے منوہر نگینہ سے محبت ہو جاتی ہے، جو بہت اچھا تیراک ہے، لیکن ایک مرتبہ جب وہ اسے میلے کچیلے لوگوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے دیکھتی ہے تو اس کی محبت نفرت میں بدل جاتی ہے۔ پھر دیو سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔"

نور شاہ کا رومانی رجحان مناظر اور فرد کے داخلی ہیجانات اور اس کی اندرونی کیفیتوں کو جذب کر کے سامنے لاتا ہے۔ ان کے افسانوں کا محور تلاش حسن اور احساس جمال ہے مگر انہوں نے سماجی مسائل اور نفسیات پر بھی ایک گہری نظر ڈالی ہے۔ ان کے کچھ افسانے ایسے ہیں جن میں معاشرے کی صحیح عکاسی ملتی ہے۔ مثال کے طور پر "بن برسے بادل" میں محبت کو روپیوں کے بھینٹ چڑھتے دکھایا گیا ہے۔ ناتھ اور اوشا ایک دوسرے کو چاہتے ہیں لیکن ان کے درمیان دولت کی دیوار کھڑی ہے۔ رومان پرور لمحات میں اوشا اس دیوار کو ریت کا ڈھیر کہتی ہے، جبکہ محبت کو دولت سے آگے کی چیز قرار دیتی ہے، لیکن رومان پرور فضاؤں سے نکل کر جب وہ حقائق کی دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں، تو اوشا دولت کی دیوار کے سائے میں ناتھ کو ننگی دھوپ میں جھلستے دیکھ کر لاتعلقی کا اظہار کرتی ہے۔

بن برسے بادل، ایک لمبی عمر کی تنہائی، پھول کی تنہائی، رات کا سورج، میری کہانی کا سچ" اور "عکس" وغیرہ ایسے افسانے ہیں، جس میں نور شاہ نے انسانی نفسیات کو رومان میں ڈال کر خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ نور شاہ نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور فنکارانہ انداز سے اس کی عکاسی کی ہے، انہوں نے جو کچھ لکھا ہے گرد و پیش کے حالات کا خوردبین نگاہوں سے مطالعہ کر کے لکھا ہے۔ ان کا انداز بیان بہت نرالا ہے۔

نور شاہ اگرچہ بنیادی طور پر رومانی افسانہ نگار ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ

انہوں نے ترقی پسند تحریک کے اثرات بھی قبول کیے، اور ساتھ ہی ساتھ جدیدیت اور کشمیریت جیسے رجحان کے عمدہ نمونے ان کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ ایک بڑے ادیب کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ کسی محدود دائرے میں سمٹ کر نہیں رہتا، بلکہ حالات کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اسلوب اور رویہ میں بھی تبدیلیاں لاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نور شاہ ریاست جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کے اس افسانوی انفرادیت کے بارے میں چاندنی بیگم رقمطراز ہیں:

''کہانیوں اور افسانوں کی دنیا میں لوگ اپنا مقام بناتے ہیں، مگر نور شاہ نے اپنے طرز بیان اور انداز تحریر سے خود ہی ایک نئی دنیا بسائی ہے، اور یہ دنیا بے شک جنت سے کچھ کم نہیں۔''

............●●● ....

نور شاہ: مشاہیر کے آئینے میں

● ...... پروفیسر عبدالقادر سروری

کشمیر کے افسانہ نگاروں میں جنہیں افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک خصوصیت حاصل ہوگئی ہے۔ نور شاہ بہت نمایاں ہیں، ادب اور افسانہ نگاری کا شوق اُنہیں بچپن سے ہی رہا۔ نور شاہ کو کہانیاں لکھنے کا نہ صرف ذوق ہے بلکہ سلیقہ اور اچھا سلیقہ ہے۔ انہوں نے سینکڑوں کردار پیدا کئے۔ اس عہد کے افسانہ نگاروں کی طرح اُنہیں مظلوم اور مفلوک انسانوں سے ہمدردی ہے کشمیری عوام کی زندگی اُن کے جذبات، اُن کے رنج وغم، ان کے مسرتوں، تمناؤں اور خواہشات کے کتنے ہی مرقعے ان کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ فرائڈ کے جنسی نظریئے سے وہ متاثر ہیں اور جنسی جذبات کو پیش کرنے میں اُنہیں دلچسپی ہوتی ہے تاہم وہ کھل کر کہنے سے ہچکچاتے ہیں، اس لئے انہیں اکثر بیان کے پیچ وخم کی راہ اختیار کرنا پڑی ہے نور کو کہانی لکھنے پر اتنی دسترس حاصل ہوگئی ہے کہ وہ تکنیک بدل بدل کر لکھتے ہیں۔

...... ● ......

● ...... علی جواد زیدی

نور شاہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہے کہ افسانے ذہن میں نہیں بلکہ زندگی کی کھردری سطح پر بکھرے پڑے ہیں، ان کو سلیقے سے چننا اور ضاعی سے واقعات اور محسوسات کو ایک قصے کی روپ میں پیش کرنا نور شاہ کو خوب آتا ہے۔

...... ● ......

● ...... اعجاز صدیقی (ممبئی)

نور شاہ کی تحریروں میں زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں۔ انداز بیان میں جو شگفتگی

رچاؤ اور موسیقی ہے وہ تو کچھ حیات پرور پہاڑی وادیوں کی عظمت وجلال کی دین ہیں اور کچھ اپنے ماحول اور طبقے کی رہین منت۔ نور شاہ بطور کہانی کار مقبول ومعروف ہیں۔ نور شاہ کی تحریروں میں شعور وفکر کی اکثر مثالیں ملتی ہیں، زبان اور اسلوب فنکارانہ اور شاعرانہ ہے۔

...... ● ......

● ...... راما نند ساگر (ممبئی)

نور شاہ کی کہانیوں میں ایک ایسی افسانویت ہے جو آج کے افسانوں میں مشکل سے ہی ملتی ہے۔ افسانویت کے علاوہ جس چیز نے متاثر کیا وہ زبان کی سلاست ہے اور وہ انداز بیان جو افسانوں کے لئے موزوں ہے۔

...... ● ......

● ...... شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد)

آپ افسانے خوب لکھتے ہیں، کیا اچھا ہو کہ آپ اپنی محنت اسی صنف پر صرف کریں۔

...... ● ......

● ...... ڈاکٹر برج پریمی (سرینگر)

نور شاہ بنیادی طور پر شاعرانہ ذہن رکھتے ہیں، اُن کا اسلوب بھی شاعرانہ ہے جس سے ان کی کہانیوں میں قوس قزح کے رنگ آگئے ہیں اور اسی خصوصیت نے نور شاہ کے افسانوں کو ایک انفرادیت بخش دی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی نور شاہ افسانہ بننے کے گُر سے بھی واقف ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی مجبوریوں اور ناکامیوں کی کہانیاں لکھتے ہیں۔ انسانی نفسیات کا مطالعہ بھی نور شاہ کی کہانیوں میں صاف نظر آتا ہے۔

...... ● ......

● ...... کیول سوری (دہلی)

نور شاہ کی کہانیاں اُس کے اندر پوشیدہ کہانی کار کی جمالیاتی حِس کو بڑے پُر اثر انداز سے اُجاگر کرتی ہیں۔

● ...... **علی محمد لون (سرینگر)**

نور شاہ کی اپنی زندگی اُس کے چہرے کے خدوخال کی طرح ہموار رہی ہے لیکن اُس کی تخلیقات میں بڑے نشیب وفراز ہیں۔ وہ خود شاید جن حالات، ذہنی کیفیات اور انسانی نفسیات کی بھول بھلیوں سے نہیں گزرا اُن سے اپنے کرداروں کو دوچار کر کے معیاری ادب کی تخلیق کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ آغاز خوب ہے اور انجام خوب تر ہونے کی بہت سی توقعات۔

...... ● ......

● ...... **رام لعل (لکھنو)**

ہر تخلیق میں فن کار کا دل دھڑکتا ہے، اس کی اپنی سانسیں ہوتی ہیں۔ اُس کے اپنے جذبات و احساسات اور جب تخلیق مکمل ہو جاتی ہے تو لوگ اسے اپنے ہی احساسات کا آئینہ کہنے لگتے ہیں اس سے فنکار کی کامیابی کا ثبوت ملتا ہے اور اس کے فن کی ایک نئی سمت معین ہونے لگتی ہے۔ نور شاہ کے قلم سے نکلے ہوئے جواہر پارے دیکھ کر میں نے محسوس کیا ہے کہ اُن کا فن دریا کے ایک نئے دھارے کی طرح اپنا راستہ خود بناتا ہوا دھیرے دھیرے اُس سمندر کی جانب بڑھ رہا ہے جسے ''ادب'' کہتے ہیں۔

...... ● ......

● ...... **محترمہ چاندنی (لکھنو)**

کشمیر کو دنیا کی جنت کہا گیا ہے، جنت کا احساس کرتے وقت ہم اپنے آپ کو ایک خوبصورت ترین دنیا میں پاتے ہیں۔ نور شاہ کا تعلق کشمیر سے ہے اس لئے انہوں نے اپنی کہانیوں میں ایک جنت کا احساس دلایا ہے۔ نور شاہ کی کہانیوں میں ہمیں جمالیاتی احساس کی بلندیاں ملتی ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں جس خوبصورتی سے قدرت کے رنگوں کی آمیزش کر کے حسین اور شاہکار تصویروں کی تخلیق کی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی کہانیوں میں ایک طرف چناروں کا وقار، ڈل کی خاموشی اور وادی کی وسعت ہے تو دوسری طرف انہوں نے بڑی مہارت سے جذبات کی عکاسی بھی کی ہے۔ کہانیوں اور افسانوں کی

دنیا میں لوگ اپنا مقام بناتے ہیں مگر نور شاہ نے اپنے طرزِ بیان اور انداز تحریر سے ایک نئی دنیا بنائی ہے۔اور یہ دنیا...... بے شک جنت سے کم نہیں۔

...... ● ......

● ...... ابنِ اسماعیل (سرینگر)

نور شاہ کی شخصیت کسی بھی تکبر اور انانیت سے دور ہے اور یہی شئے اُن کو نہ صرف اپنے ساتھیوں میں مقبول بنائے ہوئے ہے بلکہ ان کے دشمن بھی اس خوبی کے معترف ہیں شخصیت کا یہ رُخ ان کی تحریروں کو ایک وقار بخشتا ہے۔ان کی ہر تحریر انسانی، ہمدردی اور دردمندی سے مملو ہوتی ہے۔

...... ● ......

● ...... وریندر پٹواری (مصر)

میں سمجھتا ہوں کہ میں خود پر کیوں نہ ناز کروں کیونکہ میں شوق سے نور شاہ کی کہانیوں کو پڑھتا ہوں اور فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اُن کو سمجھتا ہوں۔نور شاہ واقعی کہانیوں کے شہنشاہ ہیں۔

......●......

● ...... ڈاکٹر پریمی رومانی (جموں)

نور شاہ کی کہانیاں دراصل کشمیر کی کہانیاں ہیں جن میں نہ صرف یہاں کا حسن اور خوبصورتی اُمڈ آئی ہے بلکہ انہوں نے جس خوبصورتی کے ساتھ یہاں کے عوام کے رستے ہوئے درد کا مداوا کیا ہے اس کی داد نہ دینا کورِ ذوقی ہوگی۔

...... ● ......

● ...... ڈاکٹر فرید پربتی (سرینگر)

نور شاہ اردو کے موجودہ ادبی منظر نامے پر گہرے مشاہدات اور پُر اسلوب بیان کے بل بوتے پر توانا اور زندگی آمیز تخلیقات پیش کرنیوالوں میں اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں وہ جس طرح اپنے افسانوں میں تسلسل اور ترتیب کا خیال رکھتے ہیں اُسی شگفتگی بیان کا بھی بھرپور اہتمام کرتے ہیں۔

● ...... موہن یاور (جموں)

نور شاہ سراپا نور ہے اور دل کا شاہ یہی وجہ ہے کہ نور کی تحریر میں خلوص کی چاشنی، انسان دوستی کی خوشبو اور کسک پائی جاتی ہے۔ دراصل ایک اچھا انسان ہی ایک اچھا فن کار ہو سکتا ہے، نورؔ شاہ کی تخلیقات اس لئے جاندار ہوتی ہیں کیونکہ وہ بذاتِ خود ایک اچھا دوست ہے، اچھا محسن ہے، اچھا انسان ہے۔

نورؔ وقت کا عکاس ہے۔ جو دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے یا جو سوچتا ہے سمجھتا ہے۔ اُسے اپنے سیدھے سادھے مگر خوبصورت ڈھنگ سے پیش کر دیتا ہے کہ قاری اس کی تحریر میں ڈوب جاتا ہے اور اُس کے فن کا قائل ہو جاتا ہے۔

نورؔ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی آپ کی، سب کی کہانیاں لکھتا ہے۔

...... ● ......

● ...... ڈاکٹر اقبال مہدی (دہلی)

میں نے بند کمرے کی کھڑکی اس طرح کھولی کہ صبح ہوگئی اور کھڑکی کھلی ہی رہی جس خوبصورتی سے آپ نے اپنی ڈائری میں کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں کا احاطہ کیا ہے ایک صرف آپ نے کشمیر میں ادب کے لئے بہت اچھا کام کیا ہے بلکہ تمام برصغیر کے سامنے ایک کامیاب تقریر پیش کی ہے۔ یہ کتاب کوئی مقالہ نہیں بلکہ ایک حوالہ ہے ان نوجوانوں کے لئے کہ وہ آگے بڑھیں اور مقالے زعفران میں قلم ڈبو کر تحریر کریں۔

...... ● ......

● ...... عبدالرحمن مخلص (کشمیر)

ادبی ڈائریک لکھنا ایک فن ہے۔ اس قسم کی ڈائریاں ماضی کو مجسم کر کے سامنے لا کھڑی کر دیتی ہے۔ جب میں نے نور شاہ کی ادبی ڈائری بند کمرے کی کھڑکی پڑھی تو میں جیسے جوان ہو گیا کیونکہ میرا ماضی مجسم ہو کر میرے سامنے رقص کرنے لگتا ہے۔

● ...... نورشاہ

گلاب کا پھول

شام بابو کے کوٹ میں گلاب کا پھول دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک بھولا بسرا منظر گھوم گیا۔

"دیکھئے بابو جی! گلاب کا پھول اپنے کوٹ میں نہ لگایا کریں۔!"

اُس نے حیران ہوکر پوچھا۔ "کیوں مٹھو میاں......؟"

اب مٹھو میاں کیا جواب دیتا۔ بس خاموش رہا۔ ویسے مجھے باتیں بنانا آتی ہیں، ویسے میں ہر بات کو سمجھتا ہوں۔ کیا ہوا اگر ان پڑھ ہوں۔ ویسے ہوں تو ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا نورچشم۔ کیا ہوا جو اچھا گھرانا نہ رہا۔ دیکھتے دیکھتے میرے جیسے اور بھی کئی فقیر ہو گئے۔ چپراسی بن جانے سے خاندانی بو باس نہیں جاتی۔ کیا ہوا اگر میری شادی نہ ہوئی۔ ہمارے خاندان کے مردوں نے تو تین تین شادیاں کی تھیں۔ زمین جائیداد نہ رہی۔ سر پر اپنوں کا ہاتھ نہ رہا تو کیا برسوں پرانی خاندانی وجاہت ملیامیٹ ہوگئی۔ پیار کی بھوک ختم ہوگئی۔ جوانی میں بڑھاپا آسکتا ہے لیکن وہ اندر کے پیار کی حِس کو تو فنا نہیں کرسکتا۔ مٹھو میاں بننے سے تو میں بڈھا نہیں ہوگیا۔ اب تک کی زندگی میں بڑھاپے کا احساس مجھ میں صرف ایک بار جاگا تھا، جب میں نیا نیا چپراسی بھرتی ہوگیا تھا اور دفتر کی ایک خوبصورت الھڑ سی کلرک لڑکی نے مجھے مٹھو چاچا کہہ کر پکارا تھا۔ میں نے ترنگ میں آکر صاف صاف کہہ دیا تھا۔

میرا نام مٹھو چاچا نہیں۔ چاچا بننے سے پہلے دو تین بچوں کا باپ بننا چاہتا ہوں، اس

لئے مجھے مٹھورام کہہ کر پکاریئے یا مٹھومیاں حالانکہ میاں کا لقب بھی مجھے پسند نہیں، البتہ اگر چاہو تو مٹھو جی کہہ کر پکار سکتے ہو۔ ہاں مٹھو جی!''

لیکن یہ آخری فقرہ میں نے اُس لڑکی سے نہیں کہا تھا بلکہ صرف اپنے من میں سوچا تھا۔ تب میں کچھ باتیں بابو لوگوں اور بابو چھوکریوں سے کہہ دیتا تھا۔ من میں نہیں سوچتا تھا اور کچھ باتیں اپنے من میں سوچتا تھا کہہ نہیں پاتا تھا۔ کچھ ایسی ہی بات تھی اگر بابو مٹھورام ہوتا تو دوسری بات تھی، لیکن مٹھومیاں ایک چپراسی کی خاکی وردی میں۔ یہ سب کچھ بھلا کیسے زبان پہ لاتا؟ خیر جانے دیجئے۔ بات شام بابو اور گلاب کے پھول کی تھی۔ میں اپنے اندر کے میاں مٹھو کی ٹیں ٹیں بیچ میں لے آیا۔ بیکار سی کھوکھلی ٹیں ٹیں!

کیوں جی۔ لڑکی کا قد پورے پانچ فٹ ہو۔ رنگ ہلکا گندمی ہو، آنکھیں مست مست رُخسار گلابی گلابی اور دانت سپید سپید موتیوں جیسے تو کیا اُسے خوبصورت کہا جاسکتا ہے؟ اگر ہنستے وقت اس کے رخساروں میں ایک ہلکا سا گڑھا پڑ جائے۔ چلتے وقت انگ انگ رقص کرے۔ باتیں کرتے وقت کانسی کے کٹورے سے بجنے لگیں تو کیا اُسے خوبصورت کہا جاسکتا ہے؟ رانی کی بات کررہا ہوں۔ میرے پہلے دفتر میں کلرک تھی۔ جہاں صرف دس بارہ چھوٹے بڑے بابو تھے۔ میرے نئے دفتر میں تو بہت زیادہ عملہ ہے۔ سب کے سب غریب ہیں، اپنی اپنی مجبوریوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ زمانہ ہی مہنگا ہوگیا ہے۔ پہلے دفتر والی بات اب کہاں؟

ہاں تو شام بابو کے کوٹ میں گلاب کا پھول لگا دیکھا تو پہلے دفتر کی ایک بھولی بسری یاد آگئی۔ وہ کمرہ یاد آگیا، جس میں رانی بیٹھتی تھی۔ بھولا بابو اور سعید بابو بیٹھتے تھے دفتر میں دو تین کمرے اور بھی تھے۔ ایک ہیڈ کلرک کاظمی کا کمرہ تھا اور باقی دوسرے چھوٹے موٹے بابو لوگوں کے، لیکن زیادہ چہل پہل رانی ہی کے کمرے میں رہتی۔ ایسی چہل پہل جو صرف اشاروں اور سرگوشیوں کی پیداوار ہوتی ہے۔ زبانیں عموماً خاموش رہتیں۔ آنکھیں باتیں کرتیں۔ ایسی ہی چہل پہل میں ہر کوئی ایک دوسرے سے بے خبر اور بے نیاز رانی کو اپنانے کی فکر میں تھا۔ ہر کوئی اس جستجو میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی تگ ودو میں تھا۔ کاظمی صاحب بھی اپنی ادھیڑ

، مریل سی عمر میں رانی کی طرف کھنچتا جارہا تھا، اُس کا قصور نہیں تھا۔ بیوی کے سِوا اُسے کسی دوسری عورت کا قرب حاصل نہیں ہوا تھا۔ ہوا بھی کبھی ایسا حادثہ تو پسینے چھوٹ گئے بیوی سامنے آگئی۔ کاظمی صاحب اپنی بیوی سے بہت ڈرتا تھا جس طرح ایسی عمر میں عام طور مرد ڈرتے ہیں لیکن رانی کی اور بات تھی وہ دفتر میں معمولی کلرک تھی۔ ہر گھڑی ہیڈ کلرک سے واسطہ پڑتا۔ بار بار اُسے بُلوایا جاتا۔ دوسرے سمجھتے کام کے لئے بُلایا جاتا ہے لیکن میں سب جانتا تھا۔ ہاں تو کہہ رہا تھا سب بابو لوگ، چھوٹے بڑے بیاہے، بن بیاہے رانی کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے رہتے، ایسا کیوں نہ ہوتا رانی ایک پھول ہی تھی۔ ایک رس بھری ہی تھی۔ میں دیکھتا رہتا۔ بینائی ذرا کم تھی صاف دکھائی نہ دیتا تھا، صاف صاف دیکھنے کے لئے میں نے عینک بھی چڑھالی اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ بھولا بابو کے سِوا اور کوئی میرے ساتھ سیدھے منہ بات تک نہیں کرتا تھا۔ سب مجھے گھور گھور کر دیکھتے جیسے میں چپراسی نہیں خفیہ پولیس کا آدمی تھا لیکن بھولا بابو کی بات دوسری ہی تھی وہ نام اور شکل ہی کا بھولا نہ تھا دل کا بھی بھولا تھا! اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ رہنے والا بابو! خاموش اور گھمبیر چہرے پر گہری اداسی کی جھلک لئے ہوئے سنجیدگی۔ آواز بھی پیاری مٹھاس بھری، باتیں کرتے آنکھیں خود بخود جُھک جاتیں۔ ہنستے وقت تو چہرے پر شوخی آجاتی ہے لیکن بھولا بابو کی ہنسی میں بھی سنجیدگی تھی۔ سنجیدگی جس میں دنیاداری کی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے اور خاندانی شرافت کی قدروں کا پاس بھی۔ عمر میں سب سے چھوٹا تھا، سب سے زیادہ معصوم تھا، خوبصورت اور محنتی تھا، جوانی کی ایک خاص عمر میں گہری سنجیدگی اور معمر خاموشی انسان کو روگی بنادیتی ہے۔ اپنے بزرگ ایسا ہی کہا کرتے تھے، لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ سنجیدہ اور گھمبیر رہتے ہوئے بھی اس کا چہرہ گلاب کی طرح کِھلا ہوا تھا۔ اپنا کام ختم کر کے دوسروں کا ہاتھ بٹاتا۔ رانی نئی تھی۔ بھلے گھر کی لڑکی تھی، بے سہارا تھی، کلرک بن گئی۔ کلرکی میں کام کم ہوتا۔ مغز کھپائی زیادہ، وہ مغز کھپائی کی عادی نہ تھی جھنجھلا اُٹھتی۔ رو پڑتی، خاموش طبع تھی۔ کسی کو اپنا دُکھ درد بتاتی بھی نہ تھی۔ بتاتی بھی کِسے، وہاں چاہنے اپنانے والے تو تھے۔ لیکن ڈر، جھجک کے مارے خاموش بیٹھے صرف تاکتے۔ دل میں چور ہو تو محبت بھی چوری ہی نظروں سے کی جاتی ہے۔ اپنے محلے کے مولوی اللہ رکھا کہا کرتے تھے اور سچ ہی کہا کرتے تھے، لیکن بھولا بابو کی

بات ہی کچھ اور تھی، ایک دو بار رانی کو پریشان دیکھا تو اُسے اپنے پاس بُلایا۔

"دیکھئے آپ جتنا کام آرام اور آسانی سے پانچ بجے تک کرسکتی ہیں کرلیا کریں باقی کام میں سنبھال لیا کروں گا۔ احسان نہیں کررہا۔ یہ انسانی فرض ہے۔ پریشان ہوکر رونا اپنی کمزوری کا مظاہرہ کرنا ہے، جو گناہ سے بدتر ہے۔"

رانی نے اپنی جھکی ہوئی نظروں سے بھولا بابو کو ایسے دیکھا جیسے جس فرشتے کی اُسے تلاش تھی وہ اپنے پاس ہی بیٹھا مل گیا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اپنی خوشی کا اندازہ میں اپنی اُداسی سے لگاتا ہوں۔ اُداس ہو جاؤں تو سمجھ لیتا ہوں کہ آج بہت خوش ہوں۔ کچھ پالیا ہے۔ اور اس کے بارے میں سوچنا چاہتا ہوں۔ بھولا بابو اور رانی کو ایک دوسرے کے قریب آمنے سامنے دیکھا۔ تو اُداس ہوگیا اور پھر تو میں روز ہی اُداس رہنے لگا۔ اب دونوں کُھل کر باتیں کرتے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا بھی دیتے۔ چند دنوں میں مجھے یہ بھی معلوم ہونے لگا کہ اُداس میں ہی نہیں، دوسرے بابو لوگ بھی اُداس رہنے لگے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں اُداسیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بھولا بابو بدل رہا تھا۔ اُس کی باتیں بدل رہی تھیں ایک عجیب نئی سی تبدیلی عیاں ہو رہی تھی۔ سنجیدگی کے گہرے بادل بھی چھٹنے لگے تھے، لیکن اُس کی تبدیلی اتنی تعجب خیز نہ تھی جتنی کہ رانی کی۔ اب وہ ایک مسکراتی ہوئی کلی بن گئی تھی۔ ہر ایک سے کُھل کر، ہنس کر باتیں کرتی جیسی اس کی اکیلی تنہا زندگی کو کوئی خوبصورت سہارا مل گیا ہو۔ بھولا بابو کی تبدیلی جہاں سب کو کھائے جا رہی تھی، وہاں رانی کی تبدیلی سب کے لئے ایک شگفتہ بہار بن رہی تھی اور بہار کی آمد کے سواگت کی تیاریاں ہر ایک کے چہرے اور لباس سے مترشح تھیں۔ ان ہی دنوں ان تبدیلیوں کے چکر میں ایک خاص بات ہوئی، وہ یہ کہ اب بھولا بابو کے کوٹ میں گلاب کا ایک پھول بھی دکھائی دینے لگا تھا۔ ویسے تو عام سی بات تھی لیکن وہ عام سی بات خاص یوں ہوگئی کہ لنچ تک گلاب کا پھول بھولا بابو کے کوٹ میں رہتا اور اس کے بعد رانی کی انگلیوں میں چلا جاتا۔ میں نے دیکھا حسبِ فطرت اُداس ہوگیا۔ دوسروں کی نظریں بھی پڑیں حسب عادت جل گئے۔ ایک دن میں نے کاظمی صاحب کے تیور بھی بدلے ہوئے دیکھے۔ کہیں اس نے بھی گلاب کا پھول

بھولا بابو کے کوٹ سے اُڑ کر رانی کے ہاتھوں میں پہنچتے دیکھ لیا تھا۔ فوراً حکم ہوا کہ بھولا بابو کی میز اُس کے خاص کمرے میں لگا دی جائے حکم کی تعمیل ہوئی اور میز خاص کمرے میں لگا دی گئی۔ بھولا بابو کے لئے کوئی فرق نہ پڑا۔ اب وہ کاظمی صاحب کے کمرے میں بیٹھ کر کام کرتا۔ صرف اتنا سا فرق پڑتا کہ پہلے کاظمی صاحب دن میں کوئی درجن بار رانی کو اپنے کمرے میں بلواتا تھا، اب درجن بار خود ہی رانی سے ملنے دوسرے کمرے میں جاتا لیکن یہ سلسلہ بھی زیادہ دیر نہ چلا۔ ایک دن اُس نے بھولا بابو سے کہا۔ میرے کمرے میں بیٹھنے سے تم نے کافی بقایا کام ختم کر دیا، وہ بیچارہ منہ دیکھتا رہ گیا۔

کاظمی صاحب نے پھر کہا

''دفتر میں لائٹ کام کس کے پاس ہے؟''

بھولا بابو نے فوراً جواب دیا

''لائٹ کام تو رانی ہی کو دے رکھا ہے۔ نئی نئی ہے۔ سیکھ رہی ہے۔ پھر وقت بے وقت اس کا ہاتھ بٹانے کی ضرورت ہے۔''

کاظمی صاحب نے ایک لمبی بدبودار سانس چھوڑ دی۔

''ٹھیک ہے تم واپس اپنے کمرے میں چلے جاؤ''

بھولا بابو چونکا

''آپ کا مطلب ہے رانی کا ہاتھ بٹا دیا جائے!؟''

کاظمی صاحب نے تھوڑی دیر خاموشی کے بعد اپنے دل کی بات نکالی۔

''ہاں ایسا ہی خیال ہے۔ تمہارے پاس اپنا ہی کام بہتیرا ہے۔ وہ میرے کمرے میں بیٹھا کرے گی، میں اُسے سمجھا دیا کروں گا۔''

بھولا بابو کی میز پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ گھمبیر سی مسکراہٹ سنبھالے وہ پرانے سے نئے کمرے میں گیا تھا۔ وہی مسکراہٹ لئے پھر نئے سے پرانے کمرے میں چلا آیا۔ اس کے لئے تو کوئی فرق نہ پڑا لیکن اس آنے جانے کے دوران میری ادائیاں کافور ہو گئیں، شاید میرے

اندر کے مٹھورام کی خوشی مرگئی تھی اور رانی بھی شاید خوش نہ تھی۔ کاظمی صاحب کے کمرے میں اُس سے گھٹن سی محسوس ہوتی۔ سروس کا معاملہ ہے۔ گھٹن ملے چاہیئے تازگی، کام کرنا ہی پڑتا ہے۔ آج یہاں بیٹھ کر، کل وہاں بیٹھ کر، مجھے خود کئی کمرے، کئی افسر اور کئی دفتر آج تک بدلنے پڑے ہیں۔ دوسروں کے دل کا حال تو نہیں جانتا، لیکن مجھے رانی کی گھٹن کو دیکھ کر بہت کوفت ہوگئی، اور میں اُسے برداشت نہ کرسکا۔ ایسے معلوم ہوتا جیسے ایک کھوئی ہوئی لڑکی ہو۔ تنکے کا سہارا ملا تھا وہ تنکا ہی ٹوٹ گیا، حالانکہ اب اُسے ایک مضبوط سہارا مل گیا تھا۔ کاظمی صاحب کا سہارا! وہ بڑے پیار سے اُسے کام سمجھاتا ایک بات نہ جانے کیوں میں محسوس کررہا تھا کہ کام سمجھاتے، سکھاتے کاظمی صاحب بُری طرح سے رانی پر جھک جاتا جیسے اُسے نوچ کھانے کی سوچ رہا ہو۔ وہ رانی سے بھونڈے مذاق کرنا اور رانی سب کچھ جانتے ہوئے بھی مسکراتی رہتی، بالکل گاؤں کی الھڑ جاہل لڑکیوں کی طرح، جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو، جیسے جانتی ہو اور اچھی طرح لیکن......؟!''

رانی کے کاظمی صاحب کے کمرے میں چلے جانے سے دوسرے بابو خاموش ہوگئے تھے۔ بھولا بابو سے چڑنے لگے تھے کہ خشک زندگی میں اچانک شبنمی پھوار کا لمس حاصل ہوا تھا، وہ اس کی بدولت چھن گیا۔ بھولا بابو کے لئے تو کوئی خاص فرق نہ پڑا تھا لیکن ان سب کی زندگی بے کیف اور بے رونق ہوگئی تھی۔ امیدیں بندھ کر ٹوٹ گئی تھیں۔ دوسری دفتر کی کہانیوں کی طرح وہ بھی ایک کہانی تھی جن کی ابتداء روز ہوتی، لیکن انتہا تک کبھی نہ پہنچتیں۔ میرے خیال میں رانی کی کہانی بھی دیسی ہی کہانیوں میں سے تھی، لیکن اُس کی ابتدا جتنی خاموشی سے، آہستہ سے ہوئی، اُتنی جلدی اُس کا انجام بھی ہوگا۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ بات معمولی سی تھی۔ کاظمی صاحب ابھی اپنے خیالوں کے آدھے ہی راستے میں تھا کہ اُس کے چہیتے کلرک سعید بابو نے سب کی طرف سے شکایت کی کہ رانی اور بھولا ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور محبت کی پینگیں بڑھائی بھی جاتی ہیں۔ دفتری اوقات میں۔ یہ دونوں کا پرائیویٹ معاملہ ضرور ہے، لیکن دفتر میں دوسروں کے لئے بے چینی اور شکایت کی موجب ہے۔ کاظمی صاحب نے سُنا تو ادھیڑ عمر دل اور دماغ ہل گئے۔ چہرہ زرد ہوگیا۔ اُس نے اپنے طور پر جو بات بیچ میں ہی ختم کردی تھی وہ

ختم ہونے کی بجائے اب مکمل ہو رہی تھی۔ پایۂ تکمیل تک پہنچنے والے تھی۔ رانی اُس وقت میرے ساتھ دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ ساری باتیں سن رہی تھی۔ میں نے سوچا قصہ ختم ہو گیا۔ ہمیشہ کے لئے میری اُداسیوں کو چھٹکارا ملا۔ لیکن تعجب ہوا۔ شام کو پانچ بجے کے بعد دونوں دفتر میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہنس رہے تھے۔ رانی ہنستے ہنستے ایک دم خاموش ہو گئی اور دبی زبان میں پوچھا۔

''آپ نے کبھی اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچا ہے!؟''

بھولا بابو نے اپنی زندگی کا پہلا بھرپور قہقہہ لگایا۔

''میں تو حال کا آدمی ہوں۔ مستقبل دور ہے۔ ایک لمبی چھلانگ کی ضرورت ہے اور میں تو ایک کمزور انسان ہوں۔ لیکن......''

رانی نے بات کاٹ دی۔

''حال کے آدمی ضرور ہیں، لیکن اپنے حال سے بے خبر ہیں۔''

بھولا رام نے اپنے بھولے پن کا ثبوت دیا۔

''میں اپنے حال سے باخبر ہوں۔ مجھے اپنے ایک ایک لمحے کا علم ہے!''

''کبھی اپنے آس پاس کے ماحول کو دیکھنے پرکھنے کا وقت بھی ملتا ہے یا نہیں؟''

''میرے آس پاس رکھا ہی کیا ہے، دفتر میں فائلیں، گھر میں گھر ایک دفتر اور ایک گھر اور ایک......''

''اور میں''

''تم ضرور ہو۔ ہمیں ایک دوسرے کا سہارا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت ہے۔''

رانی نے بھاری آواز میں کہا۔

''آپ کے پاس دل ہے لیکن دل کی دھڑکنیں نہیں ہیں...... دماغ ہے لیکن......''

''میرے پاس دل کی دھڑکنیں بھی ہیں، دماغ کی سوچیں بھی ہیں۔ یہ غلط فہمی تمہیں

کیسے ہوئی؟ اس طرح کی باتیں کرنے کی آج ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی۔ میرا دل کسی کے لئے دھڑکتا بھی ہے، اور کسی کے لئے سوچتا بھی ہے، اگر نہ سوچتا تو میں تمہیں......''

''اگر آپ کا دل کسی کے لئے دھڑکتا، دماغ کسی کے لئے سوچتا تو مجھے آج یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت ہی کیوں پڑتی۔''

''تمہیں کاظمی صاحب نے کچھ کہا ہے؟''

''سب ہی کچھ نہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ میں بھی کہہ رہی ہوں۔ لیکن آپ بُت بنے بیٹھے ہیں۔ دوسرے سب کچھ جان گئے۔ آپ بھولے ہی بنے رہے!''

''اصل بات کیا ہے؟''

رانی جیسے رو رہی تھی۔

''مجھے آپ کا سہارا نہ ملتا تو میں نے کب کی نوکری چھوڑ دی ہوتی۔ میں چاہتی ہوں یہ سہارا قائم رہے۔ چاہتی ہوں ہم دونوں۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

میں دروازے پر دم بخود بیٹھا تھا

بھولا بابو نے رُک رُک کر بات شروع کی

''دیکھو رانی! تم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ میں بے سمجھ ہوں۔ کیونکہ میرے لئے یہ سب کچھ نیا ہے۔ میرے ساتھ ایسی کبھی نہیں بیتی۔ تم نے میرے سہارے کو کچھ اور ہی سمجھا۔ میری سمجھ کو کچھ اور ہی رنگ میں لیا جو دوسرے تمہیں سمجھتے ہیں۔ میں نے ویسا تمہیں کبھی نہ سمجھا، جیسے دوسرے تمہیں دیکھتے ہیں، میں نے ویسے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ میں دوسرے ساتھی کلرکوں کی طرح تمہیں بھی ایک کلرک ساتھی ہی سمجھتا ہوں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا، ہنسنا، مسکرانا، سہارا بننا ہم سب کا فرض ہے۔ احسان نہیں جس کا بدلہ ایسی ویسی محبت سے چکایا جائے۔ اگر تم میرے دل کی محبت اور پیار کی بات پوچھتی ہو تو مجھے محبت ہے جنوں کی حد تک۔ اور رانی......''

رانی چیخی۔

''میں بھی تو محبت......''

بھولا بابو نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہاں میں بھی محبت ہی کی بات کر رہا ہوں، مجھے محبت ہے اور آخری حدوں تک......''

رانی نے بھرائی آواز میں کہا

''بھولا بابو''

''ہاں......لیکن وہ محبت صرف اپنی......صرف اپنی بیوی سے ہے!''

''بیوی......؟!''

''ہاں بیوی! جو تمہاری ہی جیسی ایک لڑکی ہے خوبصورت اور معصوم جو کبھی تمہاری ہی طرح بے سہارا تھی اور رانی......! کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے، ایسا ہوتا ہے، حالانکہ ہونا نہیں چاہیئے کہ دو دل......''

دروازہ کھٹاک سے کھلا

میں دیوار سے لگ گیا

رانی بجلی کی طرح سیڑھیوں کی جانب لپکی، گلاب کا پھول ردی کی ٹوکری کے پاس پڑا تھا۔

میں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے اُٹھالیا

دفتر بند کرتے ہوئے میں نے بھولا بابو سے پوچھا

''سب ٹھیک ہے لیکن ایک بات جاننا چاہتا ہوں کیونکہ آج تک، اب تک میں سب کچھ دیکھتا آیا ہوں، سُنتا آیا ہوں۔''

بھولا بابو کے چہرے پر وہی پرانی گھمبیر مسکراہٹ تھی اُس نے مُدھم سُر میں پوچھا

''کیا؟''

''سب ٹھیک ہے لیکن یہ بچارا گلاب کا پھول......؟!''

اس نے پھول میرے ہاتھوں سے لے کر اپنے کوٹ میں لگایا اور سیڑھیاں اُترتے کہنے لگا۔

''اُس میں میرا کیا قصور ہے۔ ہمارے گھر میں جب سے گلاب کے پھول کھلنے لگے ہیں۔ میری بیوی ہر روز صبح میرے کوٹ میں ایک پھول لگا دیتی ہے اگر رانی خود ہی پھول کوٹ سے اُتارے اور اس کی کہانی بنا ڈالے تو اس میں میرا کیا دوش؟''

میں خاموش ہو گیا۔

اور دوسرے دن بڑے صاحب کو سلام کر کے نئے دفتر میں تبادلہ کروالیا آج بہت مدت کے بعد شام بابو کے کوٹ میں گلاب کا پھول دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں بھولا بابو اور رانی یاد آ گئے، حالانکہ نئے دفتر میں شام بابو تو ضرور ہے بالکل بھولا بابو کا گھمبیر روپ۔ لیکن رانی کوئی نہیں......!!!

............●●● ....

●......نور شاہ

ایک لمحے کی جنت

دیکھئے!

لڑکی بے حد حسین ہو، کنول کے پھولوں جیسا گلاب رنگ چہرہ ہو، آنکھوں میں بے حد مستی ہو، آواز میں مٹھاس اور باتیں کرتے سمے پلکیں خود بخود جھک جاتی ہوں۔ تو کیا بے کیف اور بے رنگ زندگی میں محبت کی ایک، ہلکی سی حرارت کا جذبہ پیدا نہ ہوگا......! میں اپنی ہی بات کر رہا ہوں۔

یوں تو میرا نام دینا ناتھ ہے لیکن سب ہی مجھے دینو کہتے ہیں، میری عمر شاید ۳۵ برس کی ہے، شاید اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے خود یاد نہیں کہ میں کب، کہاں اور کس کے یہاں پیدا ہوا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اور میرے ناپختہ شعور میں کچھ سمجھنے اور کچھ پہچاننے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو ماسٹر جی کے گھر میں پایا۔ یہ تو بعد میں مجھے ماسٹر جی سے معلوم ہوا کہ مجھے ایک ایسے گھر میں ایک ایسی عورت نے جنم دیا جس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میری ماں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ میرا باپ کون ہے۔ چار سال کی عمر تک وہ مجھے گھر گھر لے کر گھومتی رہی اور پھر ایک شام فاقوں سے تنگ آ کر اور طعنوں کی تاب نہ سہہ کر مجھے ماسٹر جی کے دروازے پر چھوڑ گئی اور خود نہ جانے کہاں چلی گئی۔ مجھے اپنی ماں کی صورت بھی یاد نہیں۔ پھر ماسٹر جی کی تبدیلی ایک دوسرے دیہات میں ہوگئی، ان کے ساتھ میں بھی چلا آیا، دن کو میں اسکول کے دوسرے بچوں کے ساتھ پڑھتا، لکھتا اور کھیلتا، شام کو گھر میں ماسٹر جی کے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا! اب بھی میں ماسٹر کے ساتھ ہی ہوں، وہ اب شہر کے ایک ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر

بن چکے ہیں اور میں اسی ہائی اسکول کا چپراسی، اب میں فرصت کے لمحات میں صرف ناول پڑھتا ہوں۔ایسے ایسے ناول جن میں پیار ومحبت کا ذکر ہو، عشق کی باتیں ہوں، لڑکیوں کی کہانیاں، ایسی کہانیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ میرے من کو بھاتی ہیں، نہ جانے کیوں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے حقیقی زندگی میں اب تک کسی عورت کو اپنے قریب نہ دیکھا، شاید میری اس حسرت کی کبھی تکمیل نہ ہوتی اگر مالا ہمارے اسکول نہ آتی اور میں اس روز ماسٹر جی کا کھانا بنانے کی بجائے اسکول میں نہ ہوتا، وہ تو دوسرا چپراسی چھٹی پر تھا۔ ماسٹر جی کی بھی اپنی عادتیں ہیں۔ان کے گھر میں کوئی عورت نہیں، جب شادی نہ ہوئی ہو تو عورت کہاں سے آئے گی اور پھر۔ یہ بات ابھی نہیں آگے چل کر بتاؤں گا۔ بڑی نازک سی بات ہے، بڑی راز کی بات ہے،شاید کسی بڑے گھرانے کی خوبصورت سی لڑکی کا ہاتھ بڑی آسانی کے ساتھ تھام سکتے تھے کتنی ہی بار میں نے انہیں اشاروں ہی اشاروں میں کہا بھی لیکن وہ سب کچھ جان کر بھی انجان بنے رہے۔اس کی بھی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔ دیکھئے اب وہ راز کی بات آہی گئی۔ بات دراصل یہ ہے کہ اسکول بند ہونے کے بعد ماسٹر جی کا اکثر وقت گھر میں چند لڑکوں کو پڑھاتے پڑھاتے گزر جاتا ہے۔ اب وہ شادی کریں تو کیسے ان کے پاس وقت ہی کہاں کہ بیوی سے پیار کی دو چار باتیں کریں۔ کچھ اس کی سنے اور کچھ اپنی سنائیں اور ہاں ان لڑکوں کو اس لئے نہیں پڑھاتے کہ بالائی آمدنی ہو اور یہ بھی سچ نہیں کہ وہ گھر میں ہرایرے غیرے لڑکے کو پڑھاتے ہیں۔ بڑے سوچ وچار اور کچھ دیکھ ریکھ کے لڑکوں کا خود انتخاب کرتے ہیں۔ بہت دنوں تک تو میں نے اس بات پر بہت سوچا کچھ ناول بھی پڑھ ڈالے، شاید ان میں ہی کچھ لکھا ہوا مل جائے لیکن مایوسی ہوئی۔ میں نے اسکول کے دو ایک استادوں سے اپنے طور پر پوچھا بھی وہ بس دبے دبے سے لہجے میں مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ آخر ایک شام میں اس راز کی تہہ تک پہنچ ہی گیا۔ ماسٹر جی نے ایک لڑکے کو ٹھہرنے کے لئے کہا اور دوسرے لڑکوں کی چھٹی کر دی۔ میں نے سوچا لڑکا کسی مضمون میں کمزور ہوگا اور ماسٹر جی کچھ دیر کے لئے اور پڑھانا چاہتے ہوں گے لیکن پھر...... کچھ ہی دیر بعد ماسٹر جی کی شادی نہ کرنے کی ساری باتیں میری سمجھ میں آ گئیں!

اپنا تعارف تو میں پہلے ہی کرا چکا ہوں ماسٹر جی کے بارے میں بھی کچھ کچھ بتا چکا ہوں، اب ذرا بے حد حسین لڑکی کی کہانی سن لیجئے۔ مالا کی بات کر رہا ہوں وہ تو دوسرا چپراسی چھٹی پر گیا ہوا تھا اور میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے کے باہر اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ امتحانات ختم ہو چکے تھے اور نئے داخلے بھی قریب قریب ہو چکے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اس سلسلے میں کلاسوں میں خود جا کر کام کا جائزہ لے رہے تھے۔ (شاید نئے سال کے لئے لڑکوں کا انتخاب کر رہے تھے) حسب عادت میں ناول پڑھ رہا تھا ایک لڑکی کی محبت کی کہانی تھی وہ۔

''ہیڈ ماسٹر صاحب ہیں'' مٹھاس سے بھرپور ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا بس ایک لمحے کے لئے مجھے لگا جیسے سارے جہاں کی خوبصورتی ایک لڑکی کی روپ میں میرے سامنے آگئی ہو جیسے دور کسی ویرانے میں گھنگرو بج اٹھے ہوں۔ وہ لڑکی تو ان ناولوں کی لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔

'کیا نام ہے تمہارا؟'' ''میں یہاں دینو کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہوں۔''

''یہاں اپنے بھائی کے لئے آئی ہوں......اس کی ایڈمیشن کا مسئلہ ہے۔'' میں نے مڑ کر دیکھا، بارہ تیرا سال کا لڑکا کھڑا تھا، صاف شفاف قمیض اور نیکر پہنے۔ اپنی بہن کی شکل و صورت کا وہی چہرہ آنکھیں وہی دانت......سب کچھ ویسا ہی۔

''آپ کمرے میں بیٹھیں، ماسٹر جی آ ہی رہے ہوں گے۔''

''میں جاننا چاہتی ہوں کہ میرے بھائی کو اس سکول میں پڑھنے کی اجازت مل سکتی ہے۔''

''داخلہ..........!!۔''

یہ کہہ کر پھر میری آنکھیں اس کے بھائی کی طرف اٹھیں، بڑا پیارا لڑکا تھا، ماسٹر جی کے معیار پر پورا اترتا تھا۔

''داخلہ تو یہاں بھی بند ہو چکا ہے لیکن میرا خیال ہے۔ نہیں میرا تجربہ بتاتا ہے کہ آپ کے بھائی کے لئے کوئی دقت نہ ہوگی۔ لڑکا اسمارٹ ہے خوبصورت ہے، ایسے لڑکوں کو ماسٹر جی پسند کرتے ہیں۔''

''پسند.....کیا مطلب ہے۔''

''ایسے لڑکے اسکول کی شان بڑھاتے ہیں۔''

''ہاں میرا بھائی واقعی ذہین ہے، محنتی ہے۔''

اور ایسے میں ماسٹر جی آ گئے، لڑکے کو دیکھتے ہیں ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی۔ ایک وحشیانہ پن! لڑکی نے فارم بھرا، ماسٹر جی نے اس پر کچھ لکھ دیا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے ''یہ دفتر میں دے آؤ۔''

مجھے اچانک ان کتابوں سے نفرت سے ہونے لگی، یہ سب کتابی باتیں ہیں، کتابی کہانیاں ہیں حقیقی زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے سوچا وقت گزارنے کے لئے کتابیں تو اچھی ہیں لیکن یہی وقت کسی لڑکی، کسی عورت کے قریب بیٹھ کر بھی تو گزار جا سکتا ہے اور پھر میری عمر کا بھی تو یہی تقاضا تھا میں عجیب عجیب سی باتیں سوچنے لگا۔ مالا کتنی سندر ہے، اس کا بھائی بھی سندر ہے، ان کی ماں بھی ایسی ہی رہی ہوگی اور پھر دیکھتے دیکھتے سوچتے سوچتے اسکول میں پڑھنے والے جانے کتنے لڑکوں کی صورتیں میری نظروں کے سامنے پھر گئیں...... یہ اکمل ہے، اس کے گال پر ایک کالا تل ہے، کتنا اچھا لگتا ہے۔ یہ اجیت سنگھ ہے اس کے بال کتنے لمبے ہیں، یہ سلطان ہے، اس کے چلنے کا انداز لڑکیوں جیسا ہے...... شاید میں یہ سب نہ سوچتا اگر میں نے مالا کو نہ دیکھا ہوتا، مالا کو دیکھ کر مجھے زندگی کو اس کے حقیقی روپ میں دیکھنے کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے کئی بار مالا کو دیکھا، کچھ دن تک وہ اپنے بھائی کو اسکول چھوڑنے کے لئے آتی رہی۔ جب بھی ملتی کہتی ''کیسے ہو''۔

اور اس لمحے مجھے محسوس ہوتا جیسے میں اس اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہو گیا ہوں! میں اپنی خوشی کا اندازہ اپنی اداسی سے لگاتا ہوں کہ بہت خوش ہوں، بہت کچھ پا لیا ہے، میں اس دن بھی اپنی اُداسیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ہیڈ ماسٹر نے بُلا کر کہا۔

''دینو، تم ذرا شکتی کے ساتھ اس کے گھر تک جاؤ اور یہ خط اس کی بہن مالا کو دے آؤ۔''

میں نے حکم کی تعمیل کی، مالا گھر میں ہی تھی، میں نے خط دیا۔ اس نے پڑھ کر میری طرف دیکھا اور پھر اپنے بھائی کی طرف۔

''دینو مجھے کوئی اعتراض نہیں''۔

''تم کچھ نہیں جانتے۔''

''کس بارے میں''۔

''ارے بھائی اس خط کے بارے میں''

اتنے میں ایک چھوٹا سا لڑکا چائے لے کر آ گیا۔ ''تم کھڑے کیوں ہو دینو، بیٹھ جاؤ...... یہاں اس کرسی پر۔''

پھر مالا نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھا دی۔ اچانک میری انگلیاں اس کی انگلیوں سے چھو گئیں۔ اُف کیا لمس تھا وہ، کیسی حرارت تھی وہ، مجھے لگا جیسے میرے سارے شریر میں ابھی ابھی ایک بھیانک آگ لگ گئی ہو۔

''اب ہر شام شکتی ہیڈ ماسٹر جی کے گھر پڑھنے کے لئے جایا کرے گا۔ شکتی جنرل نالج میں ذرا کمزور ہے یہی تو لکھا ہے تمہارے ہیڈ ماسٹر جی نے اس خط میں ......اور ہاں چند دنوں کے لئے تمہیں واپسی پر شکتی کے ساتھ آنا پڑے گا۔ میری خاطر...... تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔''

وہ ساری رات میں نے جاگ جاگ کر کاٹی! اور میں بے حد اُداس ہو گیا۔ ماسٹر جی کی آنکھوں کی چمک تو میں نے اسی دن دیکھ لی تھی جب شکتی پہلی بار اسکول آیا تھا اس چمک میں اب شدت آ گئی تھی۔ اس دوران مجھے کئی بار مالا کے گھر جانا پڑا۔ کبھی شکتی کو چھوڑنے کے لئے اور کبھی لانے کے لئے، مالا سے بھی کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی۔ ایک بات بتا دوں مالا کو دیکھتے ہی مجھے ایسا لگتا جیسے میری ریڑھ کی ہڈی میں چونٹیاں سی رینگنے لگی ہوں۔ مجھے ایک دم احساس ہوتا ہے کہ میں چپراسی ہونے کے ساتھ مرد بھی ہوں اور عمر کے اس دہلیز پر کھڑا ہوں جہاں ایک عورت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اپنے شریر کی آگ بجھانے کے لئے، اپنے جلتے ہوئے دل پر ٹھنڈا پھاہا رکھنے کے لئے لیکن پھر میری وردی میری نظروں کے سامنے گھوم جاتی، چپراسی کی خاکی وردی؟

یہ آگ بجھانے کے لئے میں نے اب ہر اس عورت میں دلچسپی لینا شروع کر دیا جو میری نظروں کے سامنے سے گزر جاتی۔ ہاں یہی ہے جو میرے شریر کی پیاس بجھا سکتی ہے لیکن

میں ہمیشہ پیاسا ہی رہا!

میں نے کئی بار محسوس کیا، محسوس کیا کیا بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ شکتی آتے ہی ماسٹر جی کسی کام کے بہانے مجھے گھر سے باہر بھیج دیتے ہیں ایسا تو پہلے بھی ہوتا تھا اور میں ایک دبی دبی سی مسکان بکھیرتا چلا جاتا تھا لیکن شکتی کی بات ہی دوسری تھی وہ مالا کا بھائی تھا اور مالا......؟

اس شام ماسٹر جی کسی میٹنگ میں مشغول تھے، شکتی ان کے کمرے میں انتظار کر رہا تھا اور میں رسوئی گھر میں تپتی آگ کے سامنے کھانا بنا رہا تھا ایک یہ آگ تھی جو میری ظاہری بناوٹ کو جلا رہی تھی لیکن وہ آگ اس سے بھی زیادہ سخت تھی جو میرے من کے اندر تپ رہی تھی!

میں دھیمے دھیمے قدموں سے کمرے میں آ گیا۔

''شکتی۔''

''کیا ہے''۔

''میں..........میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''کہو، کہو، گھبرا کیوں رہے ہو۔''

اور میں خاموش ہو گیا، بے زبان ہو گیا اور اس خاموشی میں میری زندگی میں پہلی بار ایک ایسا لمحہ آیا، جنت ملی، ایک لمحے کی جنت، جب ایک سِسکی اُبھر کر ڈوب جاتی ہے؟ یہ سسکی شکتی کی تھی......!!

اب میرے جسم پر خاکی وردی نہیں، اس لئے کہ میں اب چپراسی نہیں رہا۔ یہ نوکری میں نے خود نہیں چھوڑی، ماسٹر جی نے مجھے نوکری سے برطرف کیا ہے اور گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ شاید مجھے پولیس کے حوالے بھی کرتے لیکن انہوں نے ایسا قدم نہیں اُٹھایا، مجھ پر رحم کھا کر نہیں بلکہ مجھ سے ڈر کر......وہ جانتے ہیں اگر میری بے زبانی کو زبان مل گئی تو ان کی عزت......ان کی زندگی کے کتنے ہی گھناؤنے راز میرے ذہن کی کتاب میں پوشیدہ ہیں...... پر وہ پولیس میں رپورٹ بھی دیتے تو میری بات پر کون یقین کرتا۔
شاید کوئی بھی نہیں..........؟؟

..........●●●..........

●......نور شاہ

ایک لمبی عمر کی تنہائی

وہ خوبصورت تھی اور صحت مند بھی لیکن اپنی خوبصورتی کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے اس کے پاس کوئی وقت نہ تھا۔ اب تو اس کی زندگی گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھار کسی خوبصورت اور صحت مند مرد کو دیکھ کر اس کے دل میں ضرور گدگدی ہوتی، لیکن اس وقت وہ دل کی دھڑکنوں کو سلا کر ذہن کو انجانی راہوں پر بھٹکنے سے روک لیتی۔......اب وہ چالیس سال کی ہو چکی تھی۔ آٹھ برس قبل جب وہ صرف بتیس برس کی تھی، اس نئے شہر میں نئے دفتر میں باس بن کر آئی تھی، لیکن تب بھی اس کیلئے ایسے خوبصورت جذبے مٹ چکے تھے۔ کائنات جیسے تھم گئی تھی اور فضاؤں میں ابھرتا جادو رک گیا تھا۔ اس نے ایسے راستے کو اپنا لیا تھا جس پر نہ کوئی موڑ تھا اور نہ ہی ٹیڑھے میڑھے پڑاؤ، الگ تھلگ راستے پر چلتے چلتے اس کے لئے مڑ کر دیکھنا ناممکن تو نہ تھا لیکن مشکل ضرور تھا۔ وہ جب بھی مڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتی تو اسے زیب کی صورت نظر آتی۔ زیب جو اس کی بڑی بہن تھی، جسے وہ بے تحاشا پیار کرتی تھی، زیب بھی اپنی چھوٹی بہن آمنہ سے اسی انداز سے محبت کرتی تھی، وہ بہنیں بھی تھیں، دوست اور ہم راز بھی، دراصل ان دونوں کی عمروں میں صرف دو سال کا فرق تھا۔ زیب آمنہ سے دو سال بڑی تھی۔ ان کے ابو کالج میں پڑھاتے تھے۔ ان کی امی بھی پڑھی لکھی تھیں اور کسی زمانے میں اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ جب گھر میں دو بیٹیوں کی ذمہ داری بڑھ گئی تو اُنہوں نے اسکول کی نوکری چھوڑ کر گھریلو زندگی کو اپنا لیا۔ اس لحاظ سے گھر میں تعلیم و تربیت، تہذیب و شائستگی کا ماحول تھا۔ زیب

ایم۔اے کرنے کے بعد کالج میں لیکچرر ہوگئی اور آمنہ کو بنک میں ایک سینئر پوزیشن میں کام کرنے کا موقع ملا دونوں بہنیں اپنے گھر، اپنے ماحول اور اپنے رہن سہن سے بے حد مطمئن تھیں۔ پھر ایک دن ان کی امی اور چند ماہ بعد ان کے ابو یہ دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ امی اور ابو کے جانے کے بعد ان کی زندگی جیسے دھندلکوں میں گم ہوگئی۔ کئی دنوں تک وہ دونوں بہنیں گھر کے ایک ایک گوشے مین کچھ تلاش کرتی رہیں لیکن جب انہیں یقین ہوگیا کہ جانے والے نہ کبھی لوٹ کر آئے تھے اور نہ کبھی لوٹ کر آئیں گے تو انہوں نے اپنے آنسوؤں کو روک لیا اور آہستہ آہستہ ایک بار پھر وقت پر لگائے اڑنے لگا......لیکن پھر ایک انہونی بات ہوئی زیب نے ایک عجیب سے انداز میں اپنی بہن آمنہ کے سامنے انکشاف کیا کہ وہ اپنے ہی کالج کے ایک ساتھی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔......!

آمنہ کے لئے یہ بے حد مسرت کی بات تھی۔ آخر اس کی بہن اس کی دوست اور ہم راز اپنی زندگی کی بہار کا پہلا اور مسرت بخش گیت گنگنانے جارہی تھی، لیکن خوشی عارضی تھی۔ یہ گیت بے زباں تھے، زیب اپنا سب کچھ لٹا چکی تھی اور اس کا چاہنے والا سب کچھ حاصل کرنے کے بعد شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا کسی دوسرے شہر میں کسی اور کو اپنانے......؟

''وہ شادی شدہ تھا اور ایک بچے کا باپ بھی مجھے دھوکہ دیتا رہا جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی تو وہ جا چکا تھا لیکن آمنہ میں نے اسے بے تحاشا چاہا ہے بے تحاشا چاہتی ہوں میں تو...... میں تو اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔''

زیب سے یہ سب سن کر آمنہ ٹھٹھک گئی۔ اس کے لئے یہ بات بے حد تلخ تھی، بے حد شدید اور تکلیف دہ۔ اس نے اپنی بہن کی طرف دیکھا وہ اب خاموش تھی۔ اس کی زبان چپ تھی، اس کا چہرہ بے رنگ تھا، اس کی آنکھیں حسرت آلودہ تھیں......وہ شاید اپنے آپ سے ہار چکی تھی اور اپنے آپ بھی جلتے رہنا اس کی فطرت بن چکی تھی اور پھر آہستہ آہستہ اس نے عزت اور لاج کی دیواروں میں اپنے آپ کو محسوس کیا......اور ایک صبح جب دیر تک اس کے کمرے سے کوئی آہٹ سنائی نہیں دی تو آمنہ نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی آواز نہ آئی، اس

نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی، دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ دروازہ کھلا تو سامنے فرش پر زیب کی لاش پڑی تھی۔ اس نے زہر کھا کر اپنی محبت کو ابدی نیند سلا دیا تھا...... کتنے ارمان، کتنے سپنے، کتنے ان چھوئے کنوارے جذبے سجائے تھے اس نے اپنی بہن کے لئے وہ دلہن بنے گی دولہا آئے گا سر پر پھولوں کا سہرا باندھے۔ ہنگامے ہوں گے، روشنی ہوگی، تمتماتے چہرے ہوں گے، خوشیوں اور مسرتوں کے ہجوم ہوں گے۔...... لیکن یہ سب کچھ نہ ہوا......!!

آمنہ اپنے آپ اپنے وجود سے بے خبر ہوگئی۔ اپنی جوانی اور اپنی خوبصورتی سے بے نیاز ہوگئی۔ اس کے لئے اب نہ کوئی پرایا تھا اور نہ ہی اپنا۔ اسے نفرت سی ہوگئی اپنے آپ سے، اپنے ماحول سے اور مرد ذات سے......اور وہ اس شہر سے چلی آئی جہاں اس نے اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا تھا، جہاں اس نے اپنی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ جو اس کی امی اور ابو کا شہر تھا! جہاں ان کا اپنا گھر، گھر ہستی تھی اور جہاں اپنی بہن سے مل جل کر اس نے زندگی کو حسین بنانے کے خواب دیکھے تھے......!!

اب اس نئے شہر میں صبح جلدی اٹھنا، نہا دھو کر بریک فاسٹ لینا اور پھر دفتر کیلئے چل پڑنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ اتوار کے روز وہ معمول سے پہلے ہی جاگتی تھی۔ جاگتے ہی اپنے کمرے کی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیتی۔ ہوا کا جھونکا آتا تو کھڑکی کے نیلے پردے لہرانے لگتے۔ اسے ایک عجیب سی خوشبو کا احساس ہوتا، ناشپاتی کے سپید شگوفوں کی خوشبو۔ کسی زمانے میں یہ اس کی من پسند خوشبو ہوا کرتی تھی۔ حالانکہ اس کے آس پاس نہ تو ناشپاتی کے درخت تھے اور نہ ہی ان کی شاخوں پر پھوٹتے ہوئے سپید سپید شگوفے......اور کبھی کبھار وہ سارا سارا دن بستر پر لیٹی رہتی۔ ان دیکھے سپنوں میں کھوئی رہتی اور ان سپنوں میں ایک آرزو جاگتی کہ کوئی لپٹ لپٹ کر اس کے جسم کو نچوڑ کر رکھ دے تاکہ اس کے اندر سے ابھرنے والی آگ بجھ جائے، لیکن اسے فوراً ہی احساس ہوتا کہ اب اس کے لئے کونپلیں سوکھ چکی ہیں، پھول مرجھا چکے ہیں، پتے جھڑ چکے ہیں اور بہار گزر چکی ہے۔ اب بہار کا ایک گیت بھی باقی نہیں رہا ہے اس کے لئے......!!

وہ ایک معمول کی شام تھی دفتر سے آتے ہی اس نے دن بھر کی تھکاوٹ دور کرنے کے

لئے کافی بار میں گرم گرم کافی پی اور ساتھ والے پرویژن اسٹور سے گھریلو ضروریات کی کچھ چیزیں خرید لیں۔ من ہی من میں گھر تک کا راستہ پیدل طے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ چلتے چلتے اسے لگا جیسے موسم اچانک بگڑ گیا ہو اور پھر دیکھتے دیکھتے تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ اتنی تیز کہ ہر طرف ایک طوفان سا بپا ہو گیا، گاڑیاں رک گئیں۔ ٹریفک جام ہو گیا۔ راہ چلتے لوگ اپنے بچاؤ کے لئے بھاگنے لگے، اس نے بھی بھاگنے کی کوشش کی۔ دوڑتے دوڑتے اس کا پاؤں پھسل گیا وہ بھی بھاگنے والوں میں تھا، آمنہ کو گرتے دیکھ کر رک گیا۔ قریب آیا، آمنہ کا ہاتھ تھاما اور دوبارہ بھاگنے لگا۔ آمنہ بھی ہاتھ تھامے اس کے قدم سے قدم ملائے بھاگے جا رہی تھی۔

ان کی سانسوں کے ریشمی تار الجھنے لگے، لیکن وہ بھاگتے رہے ایک اجنبی منزل کی جانب۔ پھر جب ایک درخت کی ٹوٹتی ہوئی شاخ سے بچنے کے لئے وہ ایک دوسرے سے اچانک لپٹ گئے تو آمنہ کو زندگی میں پہلی بار ایک ایسی لذت ملی جس سے وہ آج تک ناآشنا تھی۔ اس نے پہلی بار اپنے بہت قریب ان سانسوں کو محسوس کیا، جن میں ناشپاتی کے کھلتے ہوئے شگوفوں کی مہک تھی، پہلی بار کسی دوسرے کے گرم گرم ہونٹوں کی تپش کا احساس ہوا۔ اس تپش کے جادو سے وہ اب تک بے خبر تھی اور پھر آہستہ آہستہ ان کے جسموں کا ذرا سا لمس انہیں خوابوں کے ان جزیروں کی جانب لے گیا جہاں خواہشیں ابھرتی ہیں اور جسم ایک دوسرے میں گم ہو کر ٹوٹتے ہیں۔......!

ایک لمبی عمر کی تنہائی میں پہلی بار اس کا من کر رہا تھا کہ یہ طوفان کبھی ختم نہ ہو......شاید پہلی بار اس کے اندر کی عورت اپنے عورت پن کے حسن سے آشنا ہو رہی تھی......اور جیسے......وہ ایک مکمل عورت کا روپ اپنا رہی تھی......!!!

............●●●............

●......نور شاہ

مٹھی بھر افسانچے

●

ڈیوٹی

شہر خاص میں نئے افسر اعلیٰ کے آنے سے بالائی آمدنی کے قریب قریب سارے دروازے بند ہونے لگے، بالائی آمدنی حاصل کرنے والوں کی نیندیں اُڑ کر رہ گئیں اور وہ نئے دروازے تلاش کرنے لگے۔ جہاں چاہ ہے وہاں سوچ بھی ہے، اپنے پولیس سٹیشن کے انچارج غفور صاحب کے ذہن میں ایک نئی سوچ نے جنم لیا، دراصل اس سوچ میں چاہ پوشیدہ تھی۔ اُس نے ایک جیب کترے کو حوالات کی سلاخوں سے باہر نکال کر اپنی سوچوں کا حصہ بنایا۔ تجرباتی طور پر اُس نے جیب کترے کو ایک دن کے لئے اس لئے رہا کیا کہ وہ دن بھر لوگوں کی جیبیں کاٹنے کے بعد ایک بار اپنے گھر والوں سے بھی مل سکتا ہے لیکن شام اُترنے سے پہلے ہی اُسے ہر حالت میں لوٹ کر آنا ہوگا...... دن بھر کی کمائی کے ساتھ۔ جیب کترہ طے شدہ پروگرام کے مطابق پولیس سٹیشن سے باہر آیا اور سڑکوں پر ادھر اُدھر گھومنے پھرنے لگا۔ گھومتے پھرتے اپنے شکار کی تلاش کرتا رہا۔ اب یہ شکار اُس کی نظروں میں آ چکا تھا۔ وہ شخص بنک سے نکل کر میٹاڈار میں سوار ہو گیا۔ وہ بھی اُس کا ہم سفر بن گیا ور نہایت احتیاط لیکن اعتماد کے ساتھ اُس کی جیب سے پرس نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرے بس سٹاپ پر وہ میٹاڈار سے نیچے اُتر آیا، پرس کھول کر دیکھا اُس میں پورے دس ہزار روپے تھے۔ یہ رقم دیکھتے ہی اُسے اپنے گھر کا خیال آیا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ گھر والے اُس کی بے وقت آمد سے حیران رہ گئے اُس نے خاموشی سے پانچ

ہزار کی رقم اُن کے سپرد کر دی اور شام اُترنے سے پہلے ہی پولیس سٹیشن میں حاضر ہو گیا۔ غفور صاحب نے مسکراتے ہوئے پانچ ہزار کی رقم جیب میں ڈال دی اور پرس کو ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ وہ بالائی آمدنی حاصل کرنے کی اپنی اسکیم پر بہت مسرور نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک شخص پولیس سٹیشن میں یہ شکایت درج کرنے کے لئے حاضر ہوا کہ اس کا پرس کسی جیب کترے نے اُڑا لیا اور اُس میں پورے دس ہزار روپے کی رقم تھی۔ غفور صاحب نے پہلے ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کیا لیکن جب اُس شخص نے افسرِ اعلیٰ کے سامنے شکایت کرنیکا اپنا ارادہ ظاہر کیا تو غفور صاحب نے بے دلی سے ایف آئی آر درج کیا اور پورے معاملے کی سنجیدگی کے ساتھ جانچ پڑتال کرنے کا وعدہ بھی کیا، وہ شخص جب چلا گیا تو غفور صاحب اپنے جلال میں آگئے اور جیب کترے کو بُلا کر اُس پر برس پڑے۔

"اتنی بڑی جعلسازی، اتنا بڑا دھوکہ...... میرے ساتھ...... دس ہزار میں سے پانچ ہزار کی رقم اڑا لی...... دیکھ اب میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں۔"

لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کے لہجے میں نرمی آگئی۔

"اب کی بار معاف کرتا ہوں۔ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا...... اب جا کر کھانا کھا لو اور سو جاؤ...... کل پھر تمہیں ڈیوٹی پر جانا ہو گا......!"

......●●●......

●

انتظار

دیکھو نائلہ میں گھر سے باہر جا رہا ہوں۔ دیر ہو سکتی ہے لوٹ کر آنے میں رات بھی لگ سکتی ہے، تم بالکل نہ گھبرانا...... دراصل ایک بہت ضروری کام آن پڑا ہے، دوستی نبھانے کا معاملہ ہے، میں اپنے ایک دوست کے ہاں جا رہا ہوں، میرا وہ دوست محکمہ ایکسائز میں کام کرتا ہے، دوسرے درجے کا ملازم ہے لیکن ہے بڑا شاطر اور چالاک ہے، ہر کام میں ماہر ہے۔ وہ مجھے افیم

سے بھرا ایک پیکٹ دے رہا ہے، وہ پیکٹ میں اس کے افسر کے گھر چھوڑنے جارہا ہوں، کوئی بہانہ بنا کر میں اس کے گھر کے اندر چلا جاؤں گا تم تو جانتی ہو کہ بہانے بنانے مجھے بخوبی آتے ہیں...... سنو تو سہی، اس آفیسر نے میرے دوست کی ترقی روک رکھی ہے، کیونکہ اُنہیں میرے دوست کے خلاف کافی شکایتیں مل چکی ہیں جن کی وہ چھان بین کر رہا ہے...... ہاں ہاں شکایات درست ہیں بڑا چاپلوس قسم کا آدمی ہے میرا دوست...... رشوت لئے بغیر کوئی کام نہیں کرتا...... میری بات تو سنو، آفیسر کے گھر افیم کا پیکٹ ڈالنے کے فوراً بعد میں تو چلا آؤں گا لیکن میرا دوست پولیس کی مدد سے وہ پیکٹ برآمد کر کے اُس آفیسر کو...... باقی کہنے کی ضرورت نہیں، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، تم سمجھ گئی نا ارے ناسمجھ، آفیسر پکڑا جائے گا افیم رکھنے کے جرم میں...... ہاں چلتا ہوں اب...... تم بالکل نہ گھبرانا۔

ابھی وہ اپنے گھر سے دو قدم بھی نہ چلا تھا کہ ایک گلی سے چند سپاہی نمودار ہوئے۔ افیم کا کاروبار کرنے کے جرم میں مزید پوچھ تاچھ کے لئے پولیس سٹیشن لیا گیا...... ادھر اس کا شاطر اور چالاک دوست دوسری گلی سے نمودار ہوا، اپنے ایک ہاتھ میں گل دستہ اور دوسرے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھامے اس کے گھر میں داخل ہونے لگا جہاں حسینہ بے صبری سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔!!!

............●●● ....

●

تجربہ

وہ دونوں خوبصورت تھے بے حد خوبصورت اور ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے اُن دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر محسوس ہوتا کہ ایک دوسرے کے بغیر اُن کا جینا مرنا شاید ناممکن تو نہیں مشکل ضرور ہے۔ عالیہ کے گلابی گلابی، ملائم ملائم گال، کشمیری سیبوں کی مٹھاس سے بھرپور سُرخ سرخ ہونٹ، بڑی بڑی بادامی آنکھیں، کالی کالی زلفیں اور گورا گورا سڈول جسم اُس کی سندرتا میں اضافہ کرتے تھے، اختر علی بھی قد و قامت اور خد و خال سے مالا مال تھا۔ مضبوط توانا

جسم، مخمور آنکھیں اور لمبے گھرے سنہرے بال اُس کی خوبصورتی کا ایک حصہ تھے۔ وہ ایک بڑے سرکاری عہدہ پر فائز تھا، رہنے کے لئے سرکاری گھر، گھومنے پھرنے کے لئے سرکاری کار، گھر اور گھریلو کام کے لئے سرکاری نوکر، ہر شئے میسر تھی اُن کے لئے اُن کے گھر کے لئے۔ عالیہ خود بھی ایک پرڈوکشن کمپنی سے وابستہ تھی۔ اُن کی شادی ہوئے اب دس برس ہو چکے تھے اور اِن دس برسوں میں شاید ہی ایسا کوئی لمحہ گذرا ہوگا جب اُن دونوں کی محبت، اُن کی شفقت اور اُن کے پیار و اعتماد کو کبھی کوئی ٹھیس لگی ہو لیکن اِس بے پناہ پیار و محبت کی دنیا میں وہ کائنات کی سب سے بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت اولاد سے محروم تھا۔

''دیکھو اختر'' ایک شام عالیہ نے کہا۔ ''تم دوسری شادی کرلو، آخر کوئی تو چاہئے اتنی بڑی جائیداد کو سنبھالنے اور سمیٹنے کے لئے۔''

''میں دوسری شادی نہیں کرسکتا، ایسا ممکن بھی نہیں ہے'' اختر نے کہا

''ایسا کیوں ممکن نہیں، میں تمہیں اجازت دے رہی ہوں...... اور یقین کرو اختر میں اسی طرح تم سے پیار کرتی رہوں گی......''

''عالیہ میں اپنی کمزوری سے واقف ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میں بچہ پیدا نہیں کرسکتا لیکن میں کئی روز سے ایک اور بات سوچ رہا ہوں۔''

''کیا سوچ رہے ہو اختر۔''

''تم سے کہتے ہوئے ڈر سا لگ رہا ہے۔''

''ڈر کیوں اور کس بات سے۔''

''تم...... تم گھر کے کسی نوکر یا کسی دوست سے...... کسی کو پتہ نہیں چلے گا اور بدنامی بھی نہ ہوگی؟!'' اور عالیہ من ہی من میں سوچنے لگی...... ''اب میں اختر کو کیسے بتاؤں کہ میں اس تجربے سے پہلے ہی گزر چکی ہوں!

......●●●............

●

فرض شناسی

منی آج بھی رو رہی تھی!

"دیکھو منی"۔ ماں نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا...... "تمہارے ابو جان اِن دِنوں بھونچال سے متاثر لوگوں کی دیکھ بھال کرنے میں مصروف ہیں، بہت سارے لوگ بے گھر ہو چکے ہیں، اُن کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کے بہت سارے اِنتظام کرنے پڑتے ہیں تیرے ابو کو، ریلیف کمیٹی کے صدر ہیں وہ، راحت کے کاموں سے اُنہیں فرصت تو ملنے دو...... اب سو جاؤ میری اچھی منی!"

منی نے روتی ہوئی نگاہوں سے اپنی ماں کی جانب دیکھا اور اپنے معصوم سے لہجے میں کہا۔ "امی میں یہ نہیں مان سکتی ...... کل تو ابو دو کنستر گھی اور ایک بوری آٹا لائے تھے اور آج وہ چھ نئے نئے کمبل لائے ہیں، لیکن میری گڈیا لانا بھول گئے۔!"

......●●● ....

●

پھر کیا ہے؟

"آپ بہت خوبصورت ہیں۔"

"جی شکریہ"

"آپ کو اپنو، غیروں یا اجنبیوں سے ملنے جلنے میں کوئی اعتراض تو نہیں۔"

''بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔''

''رقص وموسیقی سے کوئی لگاؤ۔''

''جی ہاں کسی حد تک۔''

''شعروشاعری......''

''عشق ومحبت کے بہت سارے اشعار یاد ہیں۔''

''پینے پلانے میں کوئی دلچسپی۔''

''انکار نہیں کرتی۔''

''لینے دینے میں کوئی جھجک۔''

''وقت ہی فیصلہ کرے گا۔''

''تو پھر''

''پھر کیا''

''آج سے آپ ہماری کمپنی کی نئی پی آر او ہیں، یعنی پبلک ریلیشن آفیسر...... ہمارے کئی کام مختلف دفتروں میں مختلف لوگوں کے پاس اٹکے ہوئے ہیں، اب آپ کے آنے سے ہماری ساری مشکلیں آسان ہوجائیں گی۔!!!''

............●●●............

●

تیرا میرا کیا رشتہ؟

سینٹرل کراسنگ سے ذرا دوری پر اُس کا سکوٹر موڑ کاٹتے ہوئے ایک اسکولی بس سے ٹکرا گیا ٹکر اتنی زبردست تھی کہ وہ سڑک پر بہت دور جا گرا۔ بس کا ڈرائیور رُکنے کی بجائے گاڑی کی رفتار کو بڑھاتے ہوئے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اِدھر سینٹرل کراسنگ پر خون سے لت پت اُس کی جانب توجہ دیئے بغیر ٹریفک معمول کی طرح بھاگتا رہا، البتہ چند راہ گیر رُک گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ سڑک پر پڑے شخص کے سر سے بے تحاشا خون بہہ رہا ہے۔ دفعتاً ایک آواز

آئی ...... ''ہاسپٹل ...... ہاسپٹل لے جانے سے شاید اس کی جان بچ سکتی ہے۔'' وہ گاڑیوں کو روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ بڑی مشکل سے ایک کار ٹھیک اُن کے سامنے رُک گئی۔ کار کا مالک باہر آیا۔ ایک راہ گیر نے کار مالک سے لفٹ دینے کے لئے استدعا کی تاکہ زخمی شخص کو ہاسپٹل پہنچایا جاسکے۔ کار مالک نے خون سے لت پت نیم مردہ جسم پر ایک نظر ڈالی، پھر اپنی کار کی جانب دیکھا اور خاموشی سے اندر جا بیٹھا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں ایسا نہیں کرسکتا ۔میری یہ کار بالکل نئی ہے، حال ہی میں خریدی ہے پورے چھ لاکھ میں ...... زخمی کے سر سے خون بہہ رہا ہے، میں اپنی کار کی سیٹوں کو اُس کے سر سے بہتے ہوئے خون سے رنگنا نہیں چاہتا ......!!''

.... ●●● ....

●

لمحوں کی زنجیر

یوں تو وہ خوبصورت تھی، سندر تھی اور جوان بھی لیکن اُس کی مقبولیت اور شہرت کا راز اُس کی آواز میں پوشیدہ تھا۔ اُس کی آواز اُس کے گائے ہوئے نغموں کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ وہ جب گاتی تھی تو محفل میں خاموشی طاری ہوجاتی، اُس کے دل کی گہرائیوں سے اُبھر کر جب کسی بھی گیت کے بول اُس کے نرم و نازک لبوں پر مسکرانے لگتے تو سُننے والے ایک لذت بھری دُنیا میں گم ہوجاتے، ایک سُرور کی دُنیا میں کھو جاتے، اُس کی آواز میں پاکیزگی تھی، اُس کی اپنی زندگی بڑی پُرسکون تھی، سادگی اور شرافت سے لبریز تھی۔ کوئی بھی بُری عادت نہ تھی اُس میں ...... نہ تو سگریٹ پیتی تھی اور نہ ہی شراب ...... پان یا زردہ سے ذرا بھر بھی دلچسپی نہ تھی، چائے تک بھی نہ پیتی تھی تاکہ اُس کا گلہ اَن دیکھی کڑواہٹوں سے پاک وصاف رہے۔ اُس کی زندگی خوبیوں سے مالامال تھی۔ اُس کی انمول صفت اُس کی آواز تھی اور اپنی آواز کو زیادہ سے زیادہ پُر درد اور پُرسوز بنانا اُس کی زندگی کی پہلی اور آخری تمنا تھی۔

آج صبح اخباروں میں اُس کی موت کی خبر سن کر لوگ حیران وپریشان ہوگئے۔ اُس کی آواز شیدائیوں کے لئے یہ خبر ناقابل یقین تھی۔ یہ ایک گلوکارہ کی نہیں، ایک آواز کی موت

تھی......ڈاکٹروں نے بتایا وہ گلے کے کینسر میں مبتلا تھی......!!!

.... ●●● ....

●

گھر کی بات

گھر کے دروازے سے باہر قدر رکھتے ہی اُسے محسوس ہوا کہ بٹوہ اس کی جیب میں نہیں ہے اور کل دِن بھر کی ساری بالائی کمائی بٹوے میں ہی رہ گئی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ صبح اپنی پولیس کی وردی پہنتے ہوئے وہ اپنا بٹوہ کل والی پتلون کی جیب سے نکالنا بھو گیا تھا۔ وہ دوبارہ گھر کے اندر لوٹ آیا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کا نوٹوں سے بھرا بٹوہ اس کی بیوی مار چکی ہے اور وہ نئے نئے نوٹ گننے میں مصروف ہے۔

''خبردار اپنی جگہ سے ہلنا نہیں۔ میں چوری کے الزام میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں۔''

''یہ لیجے۔ بیوی نے ہنستے ہوئے سوسو کے پانچ نوٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا مجھے رشوت دے رہی ہو۔؟

''ہاں اور معاملہ رفع دفع کیجئے۔ رشوت لے کر معاملہ رفع دفع کرنا آپ کے لئے کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ تو روز کا معمول ہے۔ آپ ہی کی رشوت کی رقم سے سوسو کے پانچ نوٹ آپ کے ......!''

''اور باقی رقم۔ اچھی خاصی رقم تھی بٹوے میں۔''

''باقی رقم میری...... چور کو بھی اس کا حق ملنا چاہئے......اور......ہم!''

''اور کیا۔''

''اور پھر یہ تو گھر کی بات ہے گھر کی بات باہر نہ جائے تو بہتر ہے۔؟!

.... ●●● ....

ڈراما

●......نور شاہ

سفر زندگی کا

(صبح کا وقت، بانسری کی تان سے خوشگوار ماحول کی عکاسی)

پاپا: آمنہ......کہاں ہو......کہاں ہو تم آمنہ، میں جا رہا ہوں۔

آمنہ: (دور سے) آرہی ہوں (قریب آکر) پاپا کچھ چاہیئے آپ کو

پاپا: نہیں تو؟ تم وہاں کیا کر رہی ہو کچھ خاص

آمنہ: نہیں تو پاپا......شکیل بھیا کے کپڑے وارڈ روب میں رکھ رہی تھی (خوش ہو کر) چار سال بعد آیا ہے میر بھائی انگلینڈ سے

پاپا: میر بھی تو بیٹا ہے وہ...... پورے چار سال بعد گھر لوٹ آیا ہے، میں خوش ہوں کہ تم گھر میں ہر فرد کا خیال رکھتی ہو، آمنہ سوچتا ہوں جب تم سسرال چلی جاؤ گی تو میری دیکھ بھال کون کرے گا۔

آمنہ: پاپا میں نہیں جانے والی، میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گی، ہر پلِ ہر گھڑی، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

پاپا: Oh-No یہ کیسے ممکن ہے، اچھا چھوڑ دو Let you relax۔ اَب تمہارا بھائی شکیل بھی آیا ہے مل بیٹھ کر سارے معاملات نپٹا دیں گے اور ہاں......تمہارے بھائی کے لئے میں بھٹ صاحب کو زبان دے چکا ہوں......آمنہ......میری سویٹ بیٹی کاش آج تمہاری ماں زندہ ہوتی۔

آمنہ: پاپا...... ہاں آج ممی زندہ ہوتی تو......(اُداس ہو کر) تو آپ اپنا دُکھ سُکھ اس کے ساتھ بانٹ لیا کرتے، کتنے بد قسمت ہیں، ہم، آپ کو اکیلے اکیلے سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے (جذباتی ہوتی

ہے، گلہ رُندھ جاتا ہے)

پاپا: نا...... نا بیٹی، یہ موتی نہ بہاؤ اِن آنکھوں سے

آمنہ: پاپا: اِن آنسوؤں پر میرا کوئی اختیار نہیں

پاپا: چُپ ہو جاؤ بیٹا...... دیکھو تمہارا بھائی آیا ہوا ہے، لمبا سفر طے کر کے آیا ہے، تمہیں روتا ہوا دیکھ کر پریشان ہوگا...... کیا وہ ابھی سو رہا ہے...... سونے دو...... اچھا میں چلتا ہوں...... I am getting late

(MUSIC BAR)

(قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے)

آمنہ: (اپنے آپ سے) کاش آج ہماری ماں ہمارے درمیان ہوتی...... ارے یہ کیا شکیل بھیا بستر چھوڑنے کا نام ہی نہیں...... ایک بار پھر دیکھتی ہوں اُسے

(کھڑکی کے پٹ کھولنے کی آواز)

آمنہ: بہت سو چکے...... اب اُٹھو بھی

شکیل: (خواب ناک آواز میں) کھڑکی بند ہی رکھو...... Please don't disturb me

آمنہ: (ہنستے ہوئے) شکر ہے کہ نیند سے جاگ تو پڑے...... دیکھو تو دھوپ کمرے کے اندر تک آ گئی ہے۔

شکیل: لیکن یہ چبھ رہی ہے میری آنکھوں کو

آمنہ: بھیا روشنی زندگی کا نام ہے اور زندگی کا دوسرا نام

شکیل: (بات کاٹ کر) روشنی؟ ہے نا

(دونوں ہنستے ہیں)

شکیل: (انگڑائی لیتے ہوئے) یہاں کتنا کچھ بدل گیا ہے آمنہ، وہ آس پاس کے مکان اور اِن میں رہنے والے...... اچھا وہ صابر چاچا ہے نا

آمنہ: نہیں تو پچھلے سال اُن کا انتقال ہو گیا

شکیل: اور وہ اپنی دلاری آنٹی ہے نا

آمنہ: تم اُسے بھولے نہیں

شکیل: کیسے بھول سکتا ہوں...... اپنوں کو کوئی کیسے بھول سکتا ہے

آمنہ: وہ یہیں ہے، اُس نے جانے سے انکار کیا اور کسی ایک کی بھی نہ سُنی

شکیل: انکار کیا...... That is great

آمنہ: ہاں بھیا! وہ کہتی ہے اپنوں سے اور اپنی مٹی سے جو رشتہ ہے وہی سچا ہے باقی سب جھوٹ ہے۔ ہمارے لان کے اُس پار جو چھوٹا سا مکان ہے نا دلاری آنٹی ہی کا تو ہے۔

شکیل: میں خوش ہوں کہ وہ سلامت ہے، کتنی پُرخلوص تھی اور کس قدر لاڈ و پیار سے مجھے پالا ہے اُس نے

آمنہ: یہ سب باتیں بعد میں ہوں گی، چل کر نہا لو، پاپا نے تمہارے لئے نئے کپڑے بھی لائے ہیں

شکیل: میں سمجھا نہیں

آمنہ: I Mean منگوائے ہیں، تمہاری پسند کے Jeans، میں نے وارڈ روب میں رکھے ہیں

شکیل: Imported ہوں گے مگر ایسی کیا مجبوری تھی میں خود بھی اپنے ساتھ Jeans لایا ہوں۔

آمنہ: معلوم ہے جب تم نے اپنے آنے کی خبر دی پاپا نے سب کو الرٹ کر دیا، یہ ٹھیک کرو، وہ ٹھیک کرو۔

شکیل: کیا سچ مچ

آمنہ: اور نہیں تو کیا، کب سے تمہاری راہ دیکھ رہے تھے، تمہارے کمرے کی دیواروں کا پینٹ تک بدل دیا کمرے کا قالین بدل دیا، پردے بدل دیئے۔

شکیل: (آہ بھر کر) مگر اس سے کیا ہوتا ہے...... یہاں آ کر سیدھے منہ بات تک نہ کی، ایئر پورٹ پر میں جیسے ہی گلے ملنے کے لئے آگے بڑھا اُنھوں نے اپنی بانہیں کھولنا بھی گوارہ نہ کیا بس مجھے دیکھتے ہی رہ گئے جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

آمنہ: نہیں یہ بات نہیں، آج کل سوچتے زیادہ ہیں، کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں، رات میں نے انہیں ممی کی تصویر سے باتیں کرتے دیکھا، آنکھوں میں آنسو تھے۔

شکیل: (آہ بھر کر) یہ سچ ہے کہ پاپا مام (Mom) کے بغیر تنہا اکیلا محسوس کرتے ہوں گے مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ To be honest صرف پاپا کے لئے یہاں چلا آیا ورنہ ایک بہت بڑی کمپنی کی آفر تھی جاب کے لئے

آمنہ: اچھا اور سناؤ لندن کی

شکیل: (ہنستے ہوئے) تین چیزیں وہاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، چھتری، برساتی اور آدمی

آمنہ: ہاں ہاں سنا ہے کہ لندن کے موسم کا کوئی بھروسہ نہیں

شکیل: Exactly...... ایک وسیع اور پھیلی ہوئی دنیا ہے، لیکن، سچی بات یہ ہے کہ سب کچھ میسر ہونے کے باوجود مجھے آپ لوگوں کی یاد ستاتی رہی، اپنی مٹی کی خوشبو بلاتی رہی

آمنہ: اچھا بیڈ ٹی لے آؤں

شکیل: بیڈ ٹی نہیں پیتا، بریک فاسٹ لوں گا نیچے پاپا کے ساتھ، وہ ابھی تک سوئے ہوئے ہیں کیا

آمنہ: نہیں تو، وہ تو کب کے نکل گئے کام اس قدر پھیلا رکھے ہیں کہ اب سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے، میں نے کتنی بار اُن سے کہا کہ آخر یہ دوڑ دھوپ کیوں، اُن کے پاس ہر بات کا ایک ہی جواب ہے۔

شکیل: وہ کیا

آمنہ: کہتے ہیں میرا شکیل شہزادوں کی طرح جئے میں یہی چاہتا ہوں

شکیل: (ہنستے ہوئے) شہزادے بگڑتے بھی ہیں نا

آمنہ: سچ بھیا، اتنا بڑا بزنس سنبھالنا اُن ہی کا دل گردہ ہے، حالانکہ اب صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی Hypertension کی شکایت ہے، وہ پہلی سی Patience نہیں رہی، ذرا ذرا سی بات پر مزاج میں تلخی آجاتی ہے۔

شکیل: پاپا دولت اور جائیداد اکٹھا کرنے میں تو لگے ہیں، میرے ساتھ بات کرنے کے لئے

وقت نہیں ہے اُن کے پاس......؟

آمنہ: یہ زندگی کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے بھیا، پاپا ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں

شکیل: یعنی اُن کے عدمِ تحفظ کا احساس ابھی تک نہیں گیا، Sense of insecurity ان کو اندر ہی اندر کھائی جا رہی ہے......اچھا چھوڑ دو......مجھے یہ اٹیچی کھولنے دو

(چابی لگانے اور پھر اٹیچی کھولنے کی تاثرات)

شکیل: دیکھ میں تیرے لئے کیا لایا ہوں......میری بہن کو دولہنیا جو بننا ہے

آمنہ: آپ بھی مجھے گھر سے بھگانا چاہتے ہیں

شکیل: نہیں فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں، لیکن میری تھوڑی ہی چلے گی

آمنہ: پاپا نے سب کچھ طے کیا ہوا ہے

شکیل: آمنہ ہر باپ چاہتا ہے کہ بچے آباد ہوں......مگر ہوگا سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق

آمنہ: کاش ایسا ہو سکتا......لیکن میرا کس قدر خیال رکھتے ہیں، مجھے صبح کالج چھوڑ جاتے ہیں، شام کو Pick up کرنے آتے ہیں اور اپنے ساتھ گھر لاتے ہیں

شکیل: حالانکہ گھر میں دو عدد ڈرائیور اور دو عدد کاریں بھی ہیں، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمہاری آزادی سلب کرنا چاہتے ہیں

آمنہ: No No میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ He is actually carning too much اور یہ کوئی غلط بات تو نہیں۔

............وقفہ............

Music Bar

(کار کے آنے اور پھر رُکنے کی آواز)

پاپا: ارے تم لوگ ابھی تک تیار نہیں ہوئے......آمنہ تم نے کالج نہیں جانا ہے کیا......چلو آج تمہارا بھائی تمہیں کالج چھوڑ آئے گا۔

شکیل: پاپا ذرا دیکھو میں آپ کے لئے کیا لایا ہوں۔ Full Length Suit

پاپا: ذرا دیکھوں تو......ارے جب لانا ہی تھا تو میرے رُتبے کا بھی کچھ خیال کرتے، لاکھوں میں کھیلتے ہوئے باپ کے اکلوتے بیٹے ہو۔

شکیل (قدرے اونچے لہجے میں) پاپا

پاپا: اچھا نہیں بولتا، میں نے بزنس کو کہاں کہاں تک پھیلا دیا ہے یہ جان کر تو بہت خوش ہو گا

شکیل: (سنجیدگی سے) کچھ کچھ جان گیا ہوں

پاپا: جاننے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔

شکیل: مگر آپ کی صحت، پاپا آپ کو اپنی صحت کی ذرا بھر بھی فکر نہیں

پاپا: تم لوگ خوش رہو، آباد رہو، پھر میری صحت بھی ٹھیک رہے گی......دیکھو میں نے بہت کچھ کھویا، بہت کچھ پایا......سکون کی موت مروں گا جب تمہیں زندگی میں Settle ہوتے دیکھ لوں گا......اپنی بہن کو کالج چھوڑ آنا۔

شکیل: ڈرائیور سے کہہ دیں گے وہ چھوڑ آئے گا۔

پاپا: مگر میں جو کہتا ہوں تم وہی کرو۔ مجھے کسی پر بھروسہ نہیں

شکیل: پاپا معاف کرنا، جنہیں اپنے آپ پر بھروسہ نہیں ہوتا وہ دوسروں پر بھی بھروسہ نہیں کرتے

پاپا: No Discussions Please......آمنہ کو کالج چھوڑ کر بھٹ صاحب کے ہاں چلے جانا

شکیل: بھٹ صاحب کے ہاں......مگر کیوں؟

پاپا: بھٹ صاحب کے ورک شاپ کے ساتھ کول صاحب کا جو ورکشاپ ہوا کرتا تھا وہ میں نے اور بھٹ صاحب نے خرید لیا ہے۔

شکیل: اور کول صاحب

پاپا: وادی چھوڑ کر چلے گئے

شکیل: اتنا بڑا بزنس چھوڑ کر......آپ نے اُنہیں روکا نہیں، آپ نے انہیں کیسے جانے دیا؟

پاپا: میرے پاس ایسی باتوں کے لئے وقت نہیں، میں جو کہتا ہوں تم وہی کرو اور مجھے کیا کرنا ہے میں اچھی طرح سے جانتا ہوں اور ہاں میں نے تمہارے واپس آنے کی خوشی میں ایک پارٹی

دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ بھٹ صاحب کو ذرا یا دلانا...... میں چلتا ہوں، آمنہ جلدی سے تیار ہو کر
کالج چلی جاؤ...... اپنے بھائی کے ساتھ۔

(.........قدموں کی چاپ..........)

.....A Long Music Bar ....Change Over..........

شکیل: (جذباتی انداز) دلاری آنٹی، یہاں میرے سب ہیں پھر بھی میں اپنے آپ کو غیر سا اور اجنبی سا محسوس کرتا ہوں اور تم...... تم یہاں تنہا اکیلی رہتی ہو، دور دور تک تمہارا کوئی اپنا نہیں تمہیں ڈر نہیں لگتا۔

آنٹی: شکیل بیٹا...... ڈر...... خوف...... کیوں اور کس سے، کوئی اپنی دھرتی ماں کو بھی چھوڑ کر چلا جاتا ہے ماں کی گود کو خالی چھوڑ کے جانا اچھا ہے کیا...... جو چلے گئے، انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ اپنی پہچان کھو دی...... پرائی مٹی میں، آب وہوا میں پودا بھی ٹھیک سے نہیں پنپتا، سوکھ کر مر جاتا ہے۔

شکیل: آنٹی سوچتا ہوں اِس کا ذمہ دار کون ہے...... وہ جو اپنی جائیدادیں چھوڑ کر چلے گئے یا وہ جو اُن کا سودا کرنے میں جٹ گئے۔

آنٹی: شکیل بیٹا اِس کا فیصلہ تو وقت ہی کرے گا۔

شکیل: آنٹی تم ملنے نہیں آئیں مجھ سے

آنٹی: آنا چاہتی تھی سوچا تم لوگ ایک دوسرے سے مل کر جی بھر کر باتیں کر لو تو پھر......

شکیل: (بات کاٹ کر) پاپا نے ابھی تک ٹھیک سے دیکھا تک نہیں، باتیں کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، وہ صرف حکم چلانا جانتے ہیں۔

آنٹی: یہ تو اُن کی پرانی عادت ہے بیٹا (آہ بھر کر) تمہاری ماں کو بھی کتنے دُکھ سہنا پڑے

شکیل: (حیران ہو کر) دُکھ سہنا پڑے

آنٹی: اور نہیں تو کیا، اب پرانی باتوں کو دہرانے سے کیا حاصل بیٹا، من ہی من میں سلگتی رہی، ترستی رہی

شکیل: آنٹی یہ تم کیا کہہ رہی ہو

آنٹی: ہائے وہ بے چاری کچھ بھی نہ دیکھ سکی، اُس کی ساری آشائیں ادھوری رہیں

شکیل: مگر کیوں؟

آنٹی: تو کیا تم سچ مچ کچھ نہیں جانتے؟

شکیل: بالکل نہیں (جذباتی ہوکر) کیسے مرگئی وہ......آنٹی مجھے فوراً بتاؤ ابھی بتاؤ

آنٹی: تمہیں کسی نے کچھ نہیں بتایا

شکیل: آنٹی آپ کی قسم، میں کچھ بھی نہیں جانتا

آنٹی: اب اُس بات کو پردے میں رہنے دو بیٹا......تمہاری زباں سے بات نکلی تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔

شکیل: آپ کی قسم آنٹی، اپنی قسم، میں زباں تک نہیں کھولوں گا

آنٹی: کہنا آسان ہے بیٹے، تمہاری زباں سے اگر ایک لفظ بھی نکلا تو میرے لئے مصیبت کھڑی ہوجائے گی، وہ بے حد شریف اور پردہ کرنے والی تھی......نماز کی پابند......لوگوں کو شک ہے کہ اُس نے زہر کھا کر اپنی جان لے لی۔

......Sad Music Bar......

شکیل: (جذباتی ہوکر) زہر......I can't believe this

آنٹی: بیٹے اپنی آنکھوں سے تو میں نے نہیں دیکھا لیکن وہ مرنے سے پہلے اچانک بے ہوش ہوگئی اور پھر اُنہیں کبھی ہوش نہ آیا۔ مرتے وقت اُس کے ناخن تک نیلے ہوگئے تھے۔

شکیل: آج تک......ابھی تک مجھے اِن باتوں سے بے خبر کیوں رکھا گیا۔ کیوں آنٹی کیوں۔

آنٹی: (جذباتی انداز) اب اِن باتوں کی تہہ میں جانے سے کچھ نہیں حاصل ہونے والا......دیکھ بیٹے میری لاج رکھنا، میں خود گھٹ گھٹ کر جیتی رہی ہوں اتنے سارے دن۔

شکیل: چلتا ہوں آنٹی

......(Music-Scene Change)......

پاپا: (دور سے) شکیل......(قریب آکر) شکیل آمنہ کہاں ہے۔

شکیل: کالج گئی ہے پاپا

پاپا: اور تم نے اُسے Drop نہیں کیا کالج

شکیل: وہ ڈرائیور کے ساتھ چلی گئی اور میں آپ کے سامنے ہوں

پاپا: بھٹ صاحب کے ہاں گئے تھے۔

شکیل: نہیں، میں نے ضروری نہیں سمجھا اُن کے ہاں جانا

پاپا: ضروری کیا ہے اور کیا نہیں ہے، یہ دیکھنا میرا کام ہے، زندگی ڈھنگ سے گزارنے کے لئے ڈگری کی نہیں بلکہ تجربے کی ضرورت ہوتی ہے اور تمہارے پاس ڈگری تو ہے تجربہ صفر کے برابر ہے۔

شکیل: میں جانتا ہوں کہ آپ کے پاس کیا ہے اور میرے پاس کیا

پاپا: نہیں تم کچھ نہیں جانتے، کچھ جانتے تو میری ساتھ اس طرح باتیں نہیں کرتے، میں تمہیں ایک رئیس کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں لیکن اس کے لئے تمہیں بھی کچھ کرنا ہوگا، کل کی پارٹی اسی لئے arrage کی ہے تمہارے جان پہچان بڑھے، تمہارے اثر ورسوخ میں اضافہ ہو اور سنو بھٹ صاحب کو موڑ میں رکھنا...... میں جارہا ہوں۔

(قدموں کی چاپ)

شکیل: (اپنے آپ سے) چلے گئے...... اب شام کو لوٹ آئیں گے کچھ اور سنانے کے لئے...... میرا یہاں دل کیوں نہیں لگتا، کہیں کچھ ٹوٹ گیا ہے میرے اندر، ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ میری بے قراری بڑھتی جارہی ہے۔

(موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہوجاتی ہے)

آمنہ: کیا سوچ رہے ہو

شکیل: کچھ بھی تو نہیں

آمنہ: کچھ تو ہے

شکیل: سوچنے کے لئے بہت کچھ ہے، انسان سوچے گا نہیں تو پھر اُس کی زندگی میں ترتیب کیسے آئے گی، توازن کیسے پیدا ہوگا لیکن تمہارے لئے یہ سب باتیں بے معنی ہیں تم نے اپنی زندگی کو

کالج اور کچن تک محدود کر رکھا ہے، ہاں یاد آیا، تیاریاں مکمل ہیں نا۔

آمنہ: وہ میں دیکھ لوں گی تم فکر نہ کرو، پارٹیاں دینا پاپا کے لئے کوئی نئی بات نہیں، سب چکنے چکنے نوٹوں کا کمال ہے......وہ دیکھو دلاری آنٹی بھی ہماری طرف آ رہی ہے......آؤ......آؤ......آنٹی

آنٹی: (آتے ہوئے) آج صبح سے ہی تم کو مصروف دیکھ رہی ہوں، کہیں شادی کی تیاریاں تو نہیں ہو رہی ہیں۔

شکیل: نہیں یہ بات نہیں، میرے لوٹ آنے کی خوشی میں پاپا کے یار دوست، اُن کے بزنس پارٹنر اور کچھ بڑے لوگ آ رہے ہیں، پارٹی ہونے والی ہے۔

آنٹی: بھگوان کرے تمہارے آنے سے تمہارے پاپا کو سُکھ شانتی نصیب ہو، دُکھ اِس بات کا ہے کہ تمہاری ماں یہ آن بان نہ دیکھ سکی، تم چھوٹے تھے، اتنے سے تو تھے جب وہ اِس دنیا سے چل دی تھیں۔

(رونے لگتی ہے)

آمنہ: آنٹی آپ کی آنکھوں میں آنسو

آنٹی: کچھ نہیں بیٹا، یونہی بیتے دنوں کی یاد آ گئی، تمہاری ماں یاد آئی، اچھا میں چلتی ہوں۔

آمنہ: جی آنٹی

آنٹی: سنو تو آمنہ بیٹی، اپنے بھائی کا خیال رکھنا، دیکھو تو کتنا کمزور نظر آ رہا ہے۔

شکیل: نہیں ایسی کوئی بات نہیں، پہلے سے ذرا slim ہو گیا ہوں آنٹی

آمنہ: (چلتے چلتے) میں ذرا کچن سے ہو آتی ہوں

شکیل: O.K

....

(پس منظر میں باتیں، ہنسی، قہقہے، موسیقی) CHANGE OVER

آواز ا: That is really fasinating

آواز ۲: Lovely food

آواز ۱: اِن کی پارٹی میں ہر چیز قرینے سے ہوتی ہے، اِن کی بزنس Sense کا جواب نہیں۔

آواز ۲: کون مقابلہ کرسکتا ہے اِن کا، مٹی سے سونا نکالتے ہیں

آواز ۱: آج تو خود بھی جوبن پر ہیں، بیٹے کا رشتہ بھٹ صاحب کی لڑکی سے طے کرنے جارہے ہیں۔

آواز ۲: دیکھ نہیں رہے ہو کہ بھٹ صاحب کا کتنا خیال رکھا جارہا ہے۔

(موسیقی کا ایک خوشگوار ریلا)

شکیل: (آہستہ سے) پاپا میں اب چلوں

پاپا: (آہستہ سے) نہیں نہیں یہ کیا سوچیں گے، کیا کہیں گے۔ تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے

شکیل: (اپنے آپ سے) Suffocating بے سر پیر کی پارٹی ہے

بھٹ انکل: شکیل بیٹے، یہ کیا tune ہے، کوئی ڈھنگ کی موسیقی سنا دو

پاپا: انگلینڈ میں رہ کے آیا ہے نا، وہ لوگ شور کو ہی سنگیت کہتے ہیں

بھٹ: (ہنستے ہوئے) ٹھیک کہا آپ نے، ہم لوگ......

شکیل: (بات کاٹتے ہوئے) اور ہم ہیں کہ شور اور سنگیت میں بھی فرق نہیں کرسکتے۔

بھٹ: Is it really so

شکیل: دیکھئے انکل، سنگیت کی کوئی زبان نہیں ہوتی، کوئی مذہب نہیں ہوتا، اس کا تعلق ہمارے جذبات واحساسات سے ہے، ہماری موسیقی ہو یا ویسٹرن میوزک، دونوں کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔

بھٹ: مجھے نا بیٹے ولایتی چیزوں سے وحشت ہوتی ہے، چاہے وہ میوزک ہو یا کلچر

شکیل: (ہنستے ہوئے) مگر وسکی تو آپ foreign ہی پسند کرتے ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا

پاپا: شکیل (ڈانٹتے ہوئے) شکیل

شکیل: میں چلتا ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے

بھٹ: کیوں ہماری کمپنی آپ کو پسند نہیں بیٹے

شکیل: میری پسند یا ناپسند سے کیا فرق پڑتا ہے

بھٹ: فرق پڑتا ہے، میں ایک خاص مقصد سے یہاں آیا ہوں

شکیل: پاپا ایک منٹ

پاپا: کیا ہے

شکیل: (آہستہ سے) میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں

پاپا: بات بعد میں بھی ہو سکتی ہے، دیکھتے نہیں کتنے ذی عزت لوگ ہیں یہاں

بھٹ: شکیل جانا چاہتا ہے تو جانے دیجئے

شکیل: ہاں میں چلتا ہوں

...... A Short Music Bar......

پاپا: شکیل کا اس طرح جانا آپ کو بُرا تو نہیں لگا

بھٹ: بالکل نہیں، اُس کی رگوں میں خون ہے، ابھی ابھی ولایت سے لوٹا ہے وہاں کے بیک گراونڈ کا کچھ تو اثر ہوگا، ہمارے یہاں کا ماحول، رہن سہن، ہمارا برتس، یہ سب سمجھنے کے لئے کچھ وقت لگے گا ہی......ارے ہاں آپ نے اِن دنوں کتنے اور مکان خریدے۔

پاپا: بھٹ صاحب، اب تو قریب قریب سارے مکان بِک چکے ہیں اور جو باقی بچے ہیں ان کی خرید و فروخت میں کافی جھنجٹ ہیں۔

بھٹ: لیکن وہ لان کے اُس پار والا مکان......وہ عورت اب بھی وہاں رہتی ہے۔

پاپا: آپ دلاری کی بات کر رہے ہیں، وہ اپنے گھر میں ہی رہتی ہے۔ اکیلی تنہا ضرور ہے لیکن ہے دل گردے والی، کہتی ہے جو چلے گئے انہوں نے اپنی جنم بھومی سے وفا نہیں کی۔

بھٹ: (ہنستے ہوئے) سچ تو یہ ہے کہ وہ لوگ یہاں سے چلے نہ جاتے تو آپ کے وارے نیارے کیسے ہوتے (قہقہہ لگاتا ہے) اچھا اب چلتا ہوں، بے حد لذیز کھانا تھا۔

پاپا: جانے سے پہلے One for the road

بھٹ: انکار کرنا میری عادت نہیں

(دونوں ہنستے ہیں)

............موسیقی اور فیڈ اوٹ............

پاپا: تم پارٹی سے اس طرح کیوں چلے آئے۔These are bad manners

شکیل: میری طبیعت ٹھیک نہ تھی

پاپا: مجھ بہانہ بازی سے چڑ ہے

شکیل: آپ کچھ بھی سمجھیں، میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ بٹ صاحب بڑے آدمی ہوں گے روپے پیسے کے لحاظ سے، مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔

پاپا: فرق پڑتا ہے، اِن کے ساتھ تعلقات بڑھانے میں ہمارا فائدہ ہے۔

شکیل: فائدہ...... کیسا فائدہ، آپ ہر بات اپنے فائدے کے لئے ہی کیوں سوچتے ہیں۔ صرف اپنے فائدے کے لئے۔ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں آپ

پاپا: ہاں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے بھٹ صاحب کی بیٹی کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

شکیل: واہ پاپا واہ۔ میری زندگی کا فیصلہ آپ کر رہے ہیں اور وہ بھی مجھے Confidence میں لئے بغیر۔

پاپا: (تحکمانہ لہجے میں) اِس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا (آہستہ سے) بیٹا میں تمہارا باپ ہوں، دشمن نہیں، ہر باپ کو اپنے بچوں کے دُکھ سُکھ میں شامل ہونے کا حق ہے۔

شکیل: کیسے باپ ہیں آپ، اپنے ہی بچوں کا حق چھین رہے ہیں۔

پاپا: (چلاتے ہوئے) شکیل...... مجھے اونچی آواز میں بات سننے کی عادت نہیں

(زور سے دارواز ہ کھولنے کی آواز)

آمنہ: (آتے ہوئے) کیا ہوا پاپا، کیا بات ہے شکیل...... آپ لوگ کیوں چلا رہے ہیں پار سے دلاری آنٹی آئی ہے۔

پاپا: تمہاری دلاری آنٹی آئی ہے تو میں کیا کروں، اپنے ہونٹ سی لوں، وہ بار بار یہاں آنے لگی ہے۔ آخر کیوں۔

شکیل: Hold it papa۔ آنٹی کے بارے میں کچھ نہ کہیے، آپ شاید بھول رہے ہیں کہ انہوں نے آمنہ اور میری کافی دیکھ بھال کی ہے، پالا پوسا ہے، ایک ماں کی طرح

آمنہ: ہاں پاپا دلاری آنٹی نے ایک ماں کی طرح ہماری پرورش کی ہے، انسانی رشتوں کی عظمت کا احساس دلایا ہے اور کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ہماری ماں ہم سے بچھڑ چکی ہے۔

پاپا: میں جا رہا ہوں اور جاتے جاتے تم سے کہہ دینا چاہتا ہوں شکیل کہ میرا فیصلہ اٹل ہے۔

آمنہ: آپ زیادتی کر رہے ہیں پاپا۔ یہ شکیل بھیا کی زندگی کا سوال ہے، اُسے سوچنے کے لئے وقت دیجئے، شریک حیات چُننے کا آخری فیصلہ اُس کا ہی ہونا چاہئے۔

پاپا: I don't know

(موسیقی اور فیڈ اوٹ)

......دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز بھرتی ہے......

دلاری: کون......دروازہ کھلا ہی ہے اندر آ جاؤ

(دروازہ کھولنے کی صدا)

دلاری: شکیل تم۔ کیسے آنا ہوا بہت دنوں بعد نظر آئے۔

شکیل: تم بھی تو بہت دنوں سے ہمارے یہاں نہیں آئیں

دلاری: تمہارے پاپا نے منع جو کیا ہے

شکیل: منع کیا ہے۔ Strange، مجھے کچھ نہیں معلوم

دلاری: جا رہی ہوں یہاں سے، یہ گھر چھوڑ کر...... یہ مکان......

شکیل: تم ٹھیک ہو نا آنٹی......کیا بات ہے۔

دلاری: میں وہی کہہ رہی ہوں جو گھما پھرا کر مجھ سے کہلوایا گیا ہے۔

شکیل: (مضطرب لہجہ) کیا کہا گیا ہے۔

دلاری: مکان خالی کرنے کو کہا گیا ہے......تمہارے پاپا یہاں ایک حویلی نما مکان بنانا چاہتے ہیں، شاید فیکٹری لگانا چاہتے ہیں۔

شکیل: یہ کیسے ہوسکتا ہے......رہائشی علاقے میں فیکٹری کھل نہیں سکتی، یہ قانون کے خلاف ہے۔

دلاری: قاعدے قانون ہم جیسے لوگوں کے لئے بنتے ہیں۔

شکیل: نہیں، ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے، تم یہیں رہو گی، اِسی گھر میں، اِسی مکان میں۔

دلاری: نہیں بیٹے نہیں، تمہارے پتا کے احسان کا بوجھ اب میں نہیں اٹھا سکتی۔

(رونے لگتی ہے)

شکیل: رومت آنٹی...... تم رولو گی تو میں کمزور محسوس کروں گا۔ کمزور اور بے بس (اعتماد کے ساتھ تم یہیں رہو گی۔ اِس گھر میں...... اِسی مکان میں...... اسے کوئی نہیں خرید سکتا، کوئی نہیں گرا سکتا، یہاں تک کہ میرا باپ بھی نہیں، یہ میرا وعدہ ہے تم سے

(قدموں کی چاپ)

شکیل: تم آگئیں آمنہ...... اچھا ہوا دیکھ لو آنٹی نے رو رو کر اپنی آنکھیں لال کر دی ہیں، انہیں چپ کراؤ۔ چپ کراؤ انہیں آمنہ

............موسیقی............

...... Scene Change ......

آمنہ: شکیل بھیا

شکیل: تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو

آمنہ: تم نے دیر کر دی پاپا بہت غصے میں ہیں، تم نے اُن کا غصہ نہیں دیکھا ہے۔

شکیل: جو نہیں دیکھا ہے وہ اب دیکھ لوں گا۔

آمنہ: تمہاری باتیں سُن کر ڈر محسوس ہو رہا ہے...... وہ آرہے ہیں۔

پاپا: (زور سے) شکیل...... تم کہاں گئے تھے

شکیل: آنٹی کے ہاں گیا تھا

پاپا: دلاری کے ہاں...... اب وہاں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی، وہ یہاں سے جا رہی ہے

شکیل: جا رہی تھیں مگر میں نے روک لیا

پاپا: روک لیا...... ان معاملات میں دخل دینے والے تم کون ہوتے ہو...... آمنہ تم باہر جاؤ

آمنہ: جی پاپا

شکیل: نہیں آمنہ تم یہیں رہوگی...... پاپا آمنہ کوئی دودھ پیتی بچی نہیں، پوسٹ گریجویشن کر رہی ہے۔

آمنہ: بھیا میرے لئے پاپا سے کیوں بحث کر رہے ہو، میں ہی چلی جاتی ہوں۔

شکیل: نہیں تم نہیں جاؤ گی، بلکہ میں ہی کمرے سے باہر چلا جاتا ہوں۔

(موسیقی کا ایک تیز ریلا)

آمنہ: بھیا رُک جاؤ، کہاں جا رہے ہو...... (وقفہ) چلا گیا...... آپ بھی پاپا ہر بات کو ego کا مسئلہ بنا دیتے ہیں، ہر بات پر ناراض ہوتے ہیں، جو بات آپ غصہ میں آکر کرتے ہیں وہی بات پیار سے بھی سمجھائی جاسکتی ہے۔

پاپا: ارے اب تم ناراض ہونے لگیں (نرمی سے) میں جو بات کرتا ہوں، تم لوگوں کی بھلائی کے لئے کرتا ہوں، میرا جو بھی ہے سب تمہارا ہے...... اچھا بند کردو اب یہ رونا دھونا اور بھائی کو دیکھ لو ...... جانے کہاں چلا گیا...... جاؤ اُسے منا کرلے آؤ۔

(......موسیقی اور فیڈ اوٹ..........)

(فون کی گھنٹی بجتی ہے، ریسور اٹھانے کی آواز)

پاپا: ہیلو...... ہاں بول رہا ہوں، بھٹ صاحب آپ...... اچھا تو ٹنڈر کھول دیئے گئے، کیا کیا ہمارا ٹنڈر O.K ہوگیا ہے (وقفہ) ظاہر ہے کام شروع کرنا پڑے گا، میں چاہتا ہوں کہ آپ کا ہونے والا داماد میرا مطلب میرے بیٹے شکیل سے ہے یہ کام خود سنبھالے (وقفہ) آپ آرہے ہیں نا، ضرور آیئے...... کُھل کر بات ہوگی...... اچھا...... خدا حافظ

..........(ریسورر کھنے کی آواز..........)

شکیل: یہاں آکر مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں اپاہج ہوگیا ہوں۔

پاپا: نہیں بیٹا، ایسا نہیں کہتے۔ آج بھٹ صاحب آرہے ہیں، یہ اُن کا ہی فون تھا، شادی کی تاریخ بھی تو طے کرنی ہے۔

شکیل: مجھے رشتوں کی یہی سودا بازی ذرا بھی اچھی نہیں لگتی...... میں جا رہا ہوں۔

پاپا: کہاں

شکیل: کہیں بھی

پاپا: کیا مطلب ...... یہاں کس چیز کی کمی ہے آخر...... دو کاریں ایک بڑی کوٹھی، نوکر چاکر اس قدر پھیلا ہوا بزنس، اب تو ورک شاپ کے لئے مشینیں آنا شروع ہوگئی ہیں بھٹ صاحب کی خواہش ہے کہ بزنس کی وہ سائڈ تم ہینڈل کرلو۔

شکیل: پاپا میں بھٹ انکل کے ساتھ کوئی بات کرنے کے لئے تیار نہیں، نہ تو شادی کی اور نہ ہی بزنس کی۔

پاپا: دراصل تم کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے...... آخر تم نے سوچا کیا ہے۔

شکیل: کس بارے میں

پاپا: اپنے بارے میں

شکیل: مجھے اپنے بارے میں سوچنے کی فکر کیوں ہونے لگی، پڑھا لکھا ہوں، اپنی روٹی روزی کما سکتا ہوں۔

پاپا: زندگی صرف روزی روٹی نہیں ہوتی...... تمہاری ماں بھی تو......

شکیل: (بات کاٹ کر) ماں کا ذکر آپ نے صحیح وقت پر کیا، میں آپ سے جاننا چاہتا ہوں کہ اُن کی موت کن پُر اسرار حالات میں ہوئی ہے، سنا ہے کہ انہوں نے مجبور ہوکر اپنی جان لے لی۔

پاپا: شکیل یہ جھوٹ ہے سراسر جھوٹ

شکیل: تو پھر سچ کیا ہے

پاپا: تم اس طرح باتیں کروگے تو پھر لوگ کیا کہیں گے

شکیل: وہ بھی ایسا ہی کہتے ہیں اُن کے منہ آپ نے بند کررکھے ہیں

پاپا: کیا مطلب

شکیل: آپ کی ہر بات کے پیچھے آپ کا بزنس Interest ہوتا ہے۔

پاپا: میں وہی کروں گا جسے میں اپنے لئے ٹھیک سمجھوں گا

(آمنہ آتی ہے)

آمنہ: (دور سے) شکیل (قریب آ کر) بھیا تم سے بھی خاموش نہیں رہا جاتا، تم جانتے ہو کہ پاپا کو Hypertension ہے۔

پاپا: (بات کاٹتے ہوئے) یہاں کس کو میری فکر ہے اور رہی تمہاری دلچسپی کی بات تو تمہاری دلچسپی صرف ایک چیز میں ہے جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے تم اُسے تباہ کرنا چاہتے ہو، میری خریدی ہوئی عمارتوں کو Bulldoze کرنا چاہتے ہو، یہی نا۔ گھر کیسے بنتا ہے تم کیا جانو۔

شکیل: ہم جہاں رہ رہے ہیں، اِسے آپ گھر کہتے ہیں۔

پاپا: تو پھر یہاں آئے ہی کیوں۔

شکیل: آپ کی زنجیروں سے آزاد ہونے کے لئے، افسوس اس بات کا ہے کہ آپ اپنے بچوں کے جذبات واحساسات بھی نہیں سمجھتے، انسانی قدروں کی پرواتو دور کی بات ہے۔

آمنہ: پاپا کا دل دُکھانا کیا اچھی بات ہے۔

پاپا: بیس سال سے تم لوگوں کی دیکھ بھال کررہا ہوں، ماں اور باپ دونوں کا فرض ادا کررہا ہوں، تم کو پال رہا ہوں، اُس کا صِلہ یہ مل رہا ہے، آخر تم لوگوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے، میں محنت کرتا ہوں، اپنا خون پسینہ بہاتا ہوں، آخر کس لئے، کس کے لئے؟ اور تم ہو کہ تمہیں ذرا بھر فکر نہیں۔

آمنہ: خدا کے لئے اب خاموش ہو جائے...... ہمیں احساس ہے کہ آپ یہ سب کچھ ہمارے لئے کررہے ہیں۔

شکیل: آمنہ مجھے تمہارے حال پر رحم آتا ہے، تم پنجرے میں بند ایک پنچھی کی طرح ہو جس کی چابی تمہارے پاپا کے پاس ہے، یہاں تک کہ تم اپنے گھر میں رہ کر اپنی ماں کو بھی یاد نہیں کرسکتیں ......ماں کی یاد میں آنسو بہانے کے لئے تمہیں آنٹی کے گھر جانا پڑتا ہے۔

پاپا: دیکھا آمنہ کیا بول رہا ہے تمہارا بھائی

شکیل: جب سے میں یہاں آیا ہوں دیکھ رہا ہوں اور محسوس کررہا ہوں کہ آپ مجھے استعمال کرنا چاہتے ہیں، اپنی انگلیوں پر نچانا چاہتے ہیں، You don't allow me to live, My own individual life ?

پاپا: تم ایسی باتیں اس لئے کرتے ہو کہ تم ابھی جوان ہو، میری طرح بوڑھاپے کی دہلیز تک نہیں آئے ہو باتیں کرنا آسان ہے اور زندگی کے راستے تلاش کرنا ایک کٹھن کام۔

شکیل: آپ مجھے بھی اپنی مٹھی میں بند کرنا چاہتے ہیں تاکہ میں چل پھر نہ سکوں، میں اس ماحول سے ناخوش ہوں، اِس طرح کے ماحول میں میں اپنے آپ کو تلاش کرسکتا، اپنی شخصیت، اپنے وجود سے واقف نہیں ہوسکتا، آخر مال و جائیداد اور دولت ہی سب کچھ تو نہیں ہیں۔ زندگی کے کچھ اور بھی تقاضے ہیں۔

پاپا: تم جھوٹ بول رہے ہو، میری دولت کے وارث تو تم ہی ہو۔

شکیل: دولت...... دولت...... دولت...... آپ اپنے آپ سے ہی پوچھ لیجئے، اتنی دولت حاصل کر کے آپ خوش ہیں۔ پاپا آپ اپنے کو دھوکہ دے رہے ہیں، سچائی کچھ اور ہے۔

پاپا: میں نہیں جانتا کہ تمہارے لئے سچائی کیا ہے، میرے لئے سچائی بس یہی ہے کہ آدمی گھٹ گھٹ کر نہ جیئے، دوسروں کے سامنے اُسے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔

آمنہ: (چلا کر) Will you stop it now...... آپ لوگوں سے خاموش نہیں رہا جاسکتا۔

شکیل: میری پیاری سی معصوم سی بہنا، آج مجھے بولنے دو...... پاپا میں جانتا ہوں کہ آپ خوش ہوں گے۔ بہت خوش ہوں گے اگر میں آپ ہی کی طرح سوچنے لگوں آپ جو چاہتے ہیں وہی میں بھی چاہنے لگوں

آمنہ: شکیل

پاپا: شکیل تم اپنی حد سے بڑھ رہے ہو

شکیل: It is very suffocating here...... میں جیسے انسانی وجود میں ایک پرچھائیں ہوں، ہر سمت تاریکی ہے، اندھیرا ہے اور اندھیرے میں پرچھائیں کا وجود ختم ہوجاتا ہے۔ جارہا ہوں، And let me tell you papa، آمنہ بھی میرے ساتھ جائے گی۔

آمنہ: بھیا ہم پاپا کو اِس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔

پاپا: تو کیا تم دونوں مجھے چھوڑ کر جاؤ گے۔

آمنہ: نہیں پاپا ہم آپ کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے، کہیں نہیں جائیں گے، کبھی نہیں جائیں گے (رونے لگتی ہے)

......Scene Change......

آمنہ: اب آپ آرام سے لیٹے رہے اور کسی بھی چیز کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچئے، ڈاکٹر صاحب چار بجے دوبارہ دیکھنے آرہے ہیں۔

پاپا: (نقاہت بھرے لہجے میں) شکیل

آمنہ: وہ اپنے کمرے میں ہے، رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھا ہوا شاید خط کے ذریعہ آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔

پاپا: وہ مجھ سے بات بھی تو کر سکتا ہے۔

آمنہ: Papa relax، آپ کے ٹھیک ہونے پر سب کچھ ٹھیک ہوگا۔

......Scene Change......

(صبح کا وقت، پرندوں کی چہچہاہٹ)

پاپا: (اپنے آپ سے) آج میری طبیعت بہتر ہے، مجھے کچھ دیر کے لئے لان میں ٹہلنا چاہئے۔
(بستر سے اٹھنے اور کھڑکی کھولنے کے تاثرات)

پاپا: (اپنے آپ سے) آج موسم بھی تو بہت نکھرا ہوا ہے (حیران کُن لہجہ) لیکن یہ لفافہ...... یہ لفافہ کیسا ہے، میرے سرہانے کس نے رکھا ہے...... دیکھوں تو (لفافہ کھولنے کی آواز) شکیل کی ہینڈ رائٹنگ ہے، دیکھ تو لوں...... پڑھ تو لوں......
(پاپا کی آواز میں)

پاپا، آپ جانتے ہیں کہ یہاں کے حالات نے پچھلے چند برسوں میں کیسا رُخ اختیار کیا۔ (پاپا کی آواز کی شکیل کی آواز میں بدل جاتی ہے) خوف کی تلوار سروں پر لٹکی رہی، کچھ لوگ گھروں سے بے گھر ہوئے تو کچھ اپنے ہی گھروں میں قیدیوں کی سی زندگی بسر کرتے رہے، کتنے ہی بچے یتیم ہو گئے اور کتنی ہماری مائیں اور بہنیں بیوہ ہو گئیں، روزگار کے راستے مسدود ہو گئے، تعلیمی شعبوں کو ناقابل تلافی نقصان ہوا، کچھ غرض کے دیوانوں نے اس صورتحال کا ناجائزہ فائدہ اٹھایا، اپنی

چالاکی اور شاطرانہ چالوں سے لوٹ مچائی اور اپنی تجوریاں میں بے حساب دولت بھردی۔ پاپا میری بات کا بُرا نہ مانیے، آپ کے پاس بھی بے حساب دولت ہے، زمین جائیدادیں ہیں اور میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مجھے اور آمنہ کو آپ کی زمینوں سے اور مکانوں سے کچھ لینا نہیں۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات نہ ہو تو ایک نیک مشورہ دینا چاہتا ہوں، آپ یوں کیجئے، ایک ٹرسٹ قائم کیجئے (پس منظر میں ایک مکان کے بیرون گیٹ پر ایک بڑا بورڈ نظر آتا، کشمیر ٹرسٹ) ایک آدھ فیکٹری لگائے جس میں بے کار اور بے روزگار عزت و آبرو سے اپنی روٹی کمانے کے قابل ہوں (پس منظر میں ایک بورڈ لٹکا ہوا نظر آرہا ہے جس پر لکھا ہے Khan's cement factory) تو ایک یتیم خانہ کھلوایئے (پس منظر میں ایک بورڈ بے سہارا اور لاوارث بچوں کے لئے ٹرسٹ)، ایک اچھا خاصا معیاری اسکول شروع کیجئے جس میں بے سہارا اور بے بس بچوں کو تعلیم مل سکے (پس منظر میں ایک بورڈ (Valley Educational Institute) میری باتوں سے یہ نہ اخذ کیجئے کہ میں آپ کو کچھ سکھانے یا کچھ سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں، جانتا ہوں کہ آپ کا تجربہ بے حد وسیع ہے لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ زندگی کا قافلہ کہیں نہ کہیں آکے ٹھہر جاتا ہے، واقت کا دریا ہمیشہ ایک ہی رفتار سے نہیں بہتا...... یہ قانونِ قدرت بھی ہے، پاپا میں آپ کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ آپ میری بات مان لیں...... آمنہ میری ذمہ داری ہے ہمیں اُسے اپنے طور سے grow ہونے کا موقعہ دینا چاہئے۔ ایک آخری مگر اہم بات یہ ہے کہ دلاری آنٹی کہیں نہیں جائے گی وہ اپنی جگہ اپنے گھر میں ہمیشہ کی طرح رہے گی، آنٹی نے ہمیں ماں کا پیار بھی تو دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِس پورے ماحول میں اُس کی حیثیت ایک پُل کی سی ہے، ایک ایسے پُل کی جو دو کناروں کو آپس میں ملاتا ہے، ایک کردیتا ہے...... ہاں پاپا......

(پاپا کی آواز)

آپ کا بیٹا...... شکیل

(موسیقی اور فیڈ اوٹ)

...........●●● ....

● ......نور شاہ

قفس اُداس ہے

(ناولٹ)

پھول پیاسا تھا!

پھول نے اپنی شاخ کو دیکھا اور ہوا کے جھونکے میں جھوم کر سوچا کہ کتنے سرسبز پتے پھوٹ آئے ہیں آرزوؤں کے، جنہیں اس نے پہلے محسوس نہیں کیا تھا۔ دل کی اس کروٹ کے کتنے عنوان تھے جو سلونی نے پہلے محسوس نہیں کئے تھے۔ اس کی ماں میریا اسے اسکول اور گھر کے کاموں میں اس طرح مصروف رکھتی کہ اپنے دل کے نہاں خانوں میں جھانکنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ کبھی یہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا تھا کہ اس میں کتنی تصویریں مبہم جذبات کے رنگ بھرے جانے کی منتظر ہیں۔ لیکن آج کی تنہائی کیسی تنہائی تھی کہ وہ چاہتی تھی کہ دل سے وہ تہیں اُتار دے جو ماہ سال کے گزرے ہوئے کارواں نے گرد کی صورت جما دی تھیں۔ آج وہ خود اپنے آپ کو پہچاننا چاہتی تھی۔ اپنے گھر کے در و دیوار کو جاننا چاہتی تھی اور اس بند کمرے کو کھولنا چاہتی تھی جو اس نے سن رکھا تھا اس کی آنٹی کا ہے۔ شاید اپنے دل کی بے نام آرزوؤں کا کوئی سراغ یہاں مل جائے۔ شاید یہ اس کا وہم تھا، شاید یہ اس کے دل کی آواز تھی کیونکہ اس بند کمرے کو کھولنے کی خواہش کو وہ محض تجسس کا نام دے سکتی تھی!

اس کی ممی باہر تھی، اسکول میں چھٹی تھی اور سلونی تنہا۔ بند کمرے کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اسے ڈر سا لگا جیسے وہ کوئی چوری کرنے جا رہی ہو، جیسے ایک ان دیکھا سایہ اُس کا تعاقب

کر رہا ہو صحن میں ممی نے بند کمرے کو کھولنے کیلئے منع کر رکھا تھا جیسے وہ بند کمرہ الف لیلوی داستان کا ایک ورق ہو جسے الٹنے کیلئے مجنون کا جگر چاہیئے۔

دل نے کہا...... کسی طرح، جیسے بھی ہو، اس کی جھلک دیکھ لینی چاہیئے۔

کمرے کے دروازے پر تالا لگا تھا، اس لئے اس نے سب سے پہلے ممی کے کمرے میں جا کر چابیاں تلاش کیں اور ان میں سے اس نے اندازہ کر لیا کہ کون سی چابی ٹھیک لگ سکتی ہے۔ یہ اندازہ اس کی ایک نگاہ کر گئی کیونکہ اس کی آنکھیں ہمیشہ کمرے کے تالے کو دیکھنے اور سوچتے رہنے کی عادی بن چکی تھیں۔ پھر چابیاں اپنی ہتھیلی میں چھپائے بے آواز قدموں سے آہستہ آہستہ وہ کمرے کے دروازے تک آئی اور جلدی سے اسے کھول لیا۔ تالے کو آہستہ سے فرش پر رکھ کر اس نے دروازہ کھولا اور کمرے کی ایک ایک چیز اس کے سامنے تھی۔ فرش کا قالین، سنگار میز اور وارڈ روب۔ اس قالین پر کتنے عرصے کے بعد کسی کے پاؤں پڑے ہیں۔ یہاں آنٹی سوتی ہوں گی۔ یہاں بیٹھ کر آئینے میں سنگار کرتی ہوں گی۔ وہ سنگار میز کی طرف بڑھی لیکن آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے سے رُک گئی اس نے وارڈ روب کھولا۔ آنٹی کتنے قیمتی کپڑے پہنا کرتی تھی؟ اس نے اپنی انگلیاں آہستہ سے ان پر رکھ دیں اور اس ریشمی لباس کی ملائمت میں ایک ان جانی لذت کا احساس ہوا اور اسے محسوس ہوا جیسے دل کے نہاں خانے میں کوئی آرزو مچل اٹھی ہو اور شاید اسی آرزو کی تکمیل کیلئے کسی اندرونی طاقت کے سہارے، اس نے لباس ہینگر سے اُتار کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا......!

''میں بھی......!'' خیال آیا اسے پہن کر دیکھ لوں۔ میں اس خوبصورت لباس میں کیسی لگوں گی۔ کس طرح یہ میرے جسم پر سجے گا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور اپنے کپڑے اُتار دیئے۔ پھر آنٹی کے چمکتے ہوئے لباس کو پہن کر اور سنگار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے سراپا پر نظر ڈالی!

کیا آئینے میں وہ خود تھی!

کیا وہ اتنی خوبصورت بھی لگ سکتی ہے!!

کیسے اس لباس میں اس کے جسم کا ایک ایک عضو، ایک ایک انگ نمایاں ہو سکتا ہے!!!

اسے یاد آیا آنٹی ان ہی کپڑوں کو پہن کر اپنے کمرے کو اسی طرح بند کر کے یہیں اسی قالین پر رقص کیا کرتی تھیں اور اس کی ماں کتنی بری طرح ڈانٹا کرتی تھی ...... تب وہ بالکل چھوٹی تھی، اس کے سوچنے سمجھنے کا شعور نا پختہ تھا، اتنی چھوٹی، اس قدر نا پختہ کہ اسے اپنی آنٹی کی صورت بھی یاد نہ تھی اور گھر میں آنٹی کی کوئی تصویر بھی نہیں لٹک رہی تھی اور جو آنٹی کی تصویریں تھیں ......

وہ آہستہ سے غالیچے پر آئی اور نہ جانے کس طرح بے قراری کے عالم میں دوسرے ہی لمحے اس کے پاؤں تھرک اُٹھے۔

اس کے من میں کون فنکار چھپا بیٹھا تھا جو اس کے پاؤں کو، اس کے جسم کو تھرکنے کیلئے تحریک بخش رہا تھا ورنہ وہ تو رقص کی الف بے سے ناواقف تھی۔

اس کے ہونٹوں پر یکایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''ہائے میں رقص کر سکتی ہوں۔ میں بھی ناچ سکتی ہوں۔ میرے پاؤں کی جنبش پازیب کو جھنکار دے سکتی ہے۔ میرے بازوؤں کی محرابیں زندگی کے ان تصورات پر جھک سکتی ہیں۔ لیکن ماں آجائے گی، ماں آجائے گی۔ کوئی دیکھ لے گا اور پھر ......؟

سلونی نے جلدی سے کپڑے اُتار دیئے اور کمرے کو بند کر کے باہر آگئی۔ چابیاں جہاں سے اُٹھائیں وہیں رکھ دیں۔ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا جیسے سچ مچ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

اور جب ماں آئی تو سلونی نے پوچھا

''ممی، آنٹی کہاں ہے؟''

''آنٹی ......'' میریا کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آگیا، ایک ایسا رنگ جو بیک وقت پیار اور نفرت کا اظہار تھا۔

''ہاں ممی، آنٹی''، سلونی نے پھر کہا۔

ایک لمحے کیلئے خاموشی چھا گئی۔

سلونی کو محسوس ہوا جیسے یہ خاموشی ممی کو دور، بہت دور ماضی کی طرف دھکیل کر لے گئی ہو جہاں اس کے دل کی ہر دھڑکن ایک کہانی ہے اور اس کہانی کا عنوان ہے......آنٹی کہاں ہے۔

آنٹی!

صنوبر!!

میری بہن!!!

دوسرے لمحے اس کہانی میں جیسے جان آگئی اور ممی کی نظروں کے سامنے ایک عورت کا سراپا گھوم گیا...... مستی میں ڈوبی ہوئی دو بڑی بڑی بادامی آنکھیں، بادام کے شگوفوں سے بھی زیادہ خوبصورت۔ چہرے پر بکھرا ہوا زرد زرد رنگ اور اس کے ساتھ جیسے کچھ سرخ رنگ گھل مل گیا ہو ایسے ہی جیسے خزاں کے شروع شروع میں چنار کے پتوں کا رنگ ہو جاتا ہے۔ موہنی موہنی سی اُبھری اُبھری سی مسکراہٹ جیسے پتھروں کے درمیان میں سے کوئی پیاسا پہاڑی چشمہ چھپتا چھپاتا چلا آ رہا ہو۔ آواز میں نگین جھیل کا سا سکون اور قد......قد جیسے شالیمار باغ کے سرو بھی شرما جائیں۔

صنوبر......میری بہن!

پیار نفرت پر غالب آچکا تھا۔ سلونی نے دیکھا کہ اس کی ممی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

''ممی تم رو کیوں رہی ہو'' سلونی نے پوچھا۔

اچانک پیار نفرت کی تاریکیوں میں گم ہو گیا۔

''میں کہاں رو رہی ہوں، کیوں روؤں، کس کیلئے روؤں......'' ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ممی نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ خود بخود اس کے چہرے کی جانب بڑھ گیا۔ جہاں اب بھی نہ جانے کتنے قطرے کانپ رہے تھے۔

وہ ماضی سے نکل کر حال میں آگئی۔

''آؤ سلونی......دیر ہو رہی ہے۔ تمہارے ڈیڈی آتے ہی ہوں گے۔''

لیکن ممی''

''کیا ہے؟'' اس نے سختی سے کہا۔

''سلونی کی زبان بند ہوگئی۔ اس کا ذہن بھٹک گیا۔ وہ ممی سے بہت ڈرتی تھی۔ کیونکہ اس کی ممی کی طبیعت میں نہ جانے کہاں سے چڑچڑاپن آگیا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے بالکل ہمت نہ ہاری، شاید اسے اپنی دل کی کروٹ کا عنوان مل چکا تھا۔

''ممی آنٹی کہاں ہے۔''

ممی کے قدم اندر جاتے جاتے خود بخود رُک گئے۔ اس نے مڑ کر سلونی کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں جھانکا، اس کے دل میں اُترنے کی کوشش کی۔ اسے ڈر سا لگا۔ اس نے جھرجھری سی محسوس کی۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے سلونی کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی۔

ممی کا سر چکرا گیا۔

آج تک وہ بے خبر کیوں تھی بے حس تھی۔ اب تک اس نے اس بارے میں سوچا کیوں نہ تھا۔ آخر کیوں نہیں...... وہی مستی میں ڈوبی دو بڑی بڑی آنکھیں، وہی روپ، وہی آواز، وہی تمکنت...... سلونی...... صنوبر؟

میریا کو سلونی کی آنکھوں میں وہی تمنائیں، وہی آرزوئیں انگڑائیاں لیتی نظر آئیں جو ...... جو آج سے بہت پہلے صنوبر کی آنکھوں میں نظر آئی تھیں۔

اگر صنوبر کی طرح سلونی بھی...... اس نے من ہی من میں سوچا...... ''نہیں نہیں، ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ کبھی ہونے نہیں دوں گی۔''

''کیا نہیں ہونے دو گی ممی''

''کچھ بھی نہیں میری بیٹی، کچھ نہیں......''

''اس نے سلونی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

''آؤ اندر چلیں۔ تمہارے ڈیڈی آتے ہی ہوں گے۔''

''لیکن ممی تم نے کہا نہیں کہ آنٹی صنوبر کہاں ہے۔''

''وہ مرگئی۔'' میریا نے چلا کر کہا۔

''ممی''

''ہاں سلونی وہ مرگئی میرے لئے، تیرے لئے ...... سب کیلئے۔ دیکھ اب صنوبر کا نام میرے سامنے کبھی نہ لینا......''

میریا اندر چلی گئی۔

سلونی خاموش ہوگئی۔ وہ چاہتی تھی کہ دوبارہ آنٹی کے کمرے میں جا کر روئے ...... خوب روئے ......!!

دل کی کیسی بے قراری ہے یہ!

سلونی نے سوچا ...... ''یہ کیا ہے جو آہستہ آہستہ میرے من میں جاگ رہا ہے۔ کچھ تلخ بھی اور کچھ شیریں بھی ...... نہ جانے یہ تلخ تلخ شیریں شیریں سا درد مجھے کن ان دیکھے میدانوں اور پہاڑوں میں سے لئے جا رہا ہے جو میں نے کبھی نہ دیکھے جن کے بارے میں، میں نے کبھی بھی نہ سوچا۔ ہوا کا یہ کیسا جھونکا میرے دل کے تاروں کو چھو گیا کہ کمرے میں لٹکے ہوئے ان رنگدار پردوں کی ہر سرسراہٹ پر میرے پاؤں تھرکنے لگتے ہیں۔ باورچی خانے سے کسی برتن کے ٹکرانے کی آواز کانوں میں سنائی دیتی ہے تو جسم کا ہر حصہ اس آواز کی موسیقی پر جھومنے لگتا ہے۔ میں کیوں چاہتی ہوں کہ ہر لمحہ ہر گھڑی اور ہر وقت آنٹی کا خوبصورت لباس پہن کر رقص کروں ناچوں ...... اتنا ناچوں کہ سفیدے کے اونچے اونچے پیڑ، چنار کے یہ سرسبز پتے میرے ساتھ رقص کریں ...... سامنے ٹیبل پر پڑی میری یہ کتابیں ...... اُف یہ کتابیں ان میں اب دلچسپی نہیں رہی ہے اور ...... ''سلونی'' ماں کی آواز تھی جو اپنے کمرے سے بلا رہی تھی۔ سلونی جیسے سپنے سے جاگی ...... کس قدر پُر کیف سپنا تھا۔ اس نے پھر سوچا ...... کاش وہ اسی سپنے میں کھوئی رہتی ...... کاش!

''سلونی کھڑکی میں کھڑی ہو کر ان برف آلود پہاڑوں میں کیا تلاش کر رہی ہو'' اس کی ممی نے کمرے میں آ کر کہا

''ممی......سپنا۔''

''سپنا......کیا سپنا۔''

''ممی میں ابھی ابھی ایک سپنا دیکھ رہی تھی کہ میں......

ممی نے بات کاٹ دی......''ارے لڑکی تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ چل اسکول جانے کا وقت ہو گیا۔ تمہارے ڈیڈی تو کب کے چلے گئے۔''

اسکول میں بھی سلونی کا دل نہ لگا۔ اس نے کتابیں کھولیں تو اسے محسوس ہوا جیسے الفاظ ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کر ایک ہی بات دہرا رہے ہوں۔

زندگی رقص ہے!

زندگی محبت ہے۔

اس نے اپنی آنکھیں مل لیں اور سامنے کی طرف دیکھا جہاں اس کے ٹیچر ''موسمِ بہار کے رقص کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا......

''رقص گانے کی تکمیل سے شروع ہوتا ہے اور اس کے ارتقاء کا اظہار اس قوت سے ہوتا ہے جو ہاتھوں کو ایک دوسرے سے بجانے سے شروع ہو کر جسم کی حرکتوں تک جا پہنچتا ہے۔ کبھی آگے کو جھکتے ہوئے اور کبھی پیچھے کی طرف جاتے ہوئے۔ رقاص کے اعضا اتنی تیزی سے حرکت کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ بجلی کوندر ہی ہے اور جیسے اس میں زندگی کی آگ دہک رہی ہے۔''

سلونی کی نگاہوں میں بے ساختہ وہ منظر گھوم گیا جب اس نے آنٹی کا لباس پہن کر آئینے کے سامنے بیٹھ کر ایسی حرکتیں کی تھیں۔

اسکول سے واپسی پر اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر خدا سے دعا مانگی کہ اس کی ممی گھر پر نہ ہوتا کہ وہ آنٹی کے کمرے میں جا کر دوبارہ اس کا وہ قیمتی لباس پہن لے اور آئینے کے سامنے رقص کرے مگر گھر میں داخل ہوتے ہی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ممی اور ڈیڈی چائے کی میز پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"اے خدایا، تو نے میری اتنی سی بات مان لی ہوتی تو تیرا کیا بگڑتا......"

کئی دن اور کئی راتیں بیت گئیں مگر پھول پیاسا ہی رہا۔ من کی آرزوئیں تشنہ ہی رہ گئیں۔ نہ جانے کتنی بار اس کے قدم آنٹی کے کمرے کی طرف اُٹھے ہر بار اسے پلٹ کر آنا پڑا۔ کمرہ بند تھا اور اس پر لٹکا تالا اس کی تشنگی کا مذاق اُڑا رہا تھا۔

دونوں کے درمیان دروازہ حائل تھا۔

ایک طرف آنٹی کا خوبصورت لباس اور دوسری جانب اس لباس کو پہننے کی تمنا۔ ایک طرف قالین کے نقش ونگار اور دوسری طرف پاؤں ان پر تھرکنے کی آواز۔ ایک طرف وہ قدآدم آئینہ اور دوسری طرف اس میں ظاہر ہونے کے لئے بے تاب عکس......دروازے کے اُدھر وہ دنیا تھی جو سلونی اپنانا چاہتی تھی اور اِدھر وہ دنیا جس میں اس کے لئے کوئی حسن نہ تھا!!

یہ کیسا دروازہ ہے؟ کس قدر مضبوط......!

دروازہ بند ہی رہا سلونی نے کئی بار کھولنے کی کوشش کی مگر ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لئے کہ اس کی ممی سارا دن گھر میں ہی رہنا پسند کرتی تھی۔ وہ ممی سے اکثر کہتی رہتی۔

"ممی تم آج کل آنٹی مونیکا کے یہاں کیوں نہیں جاتی۔"

"کیوں کیا ہوا۔" وہ جواب دیتی۔

"کچھ بھی نہیں۔ تم بہت دنوں سے نہیں گئی نا اس لئے کہہ رہی ہوں"

لیکن ایک دن اس کی آرزو پوری ہوگئی، کسی رشتہ دار کے ہاں سالگرہ کی پارٹی تھی۔ ڈیڈی اور ممی چلے گئے سلونی نے سر درد کا بہانہ کر کے جانے سے انکار کیا۔

یہ لمحہ کتنا خوبصورت تھا!

ایک بار دروازہ پھر کھل گیا۔ ایک بار پھر وارڈ روب کھل گیا اور آئینے نے اس لباس کو سلونی کے جسم پر دیکھا۔ وہ دیر تک رقص کرتی رہی ناچتی رہی، مسکراتی رہی......!

لباس اُتار کر اسے دوبارہ وارڈ روب میں رکھا۔ وہ مایوس ہوگئی اس کے ذہن میں ایک نیا خیال اُبھرا...... "کیا وہ یہ لباس پہن کر اپنی ممی ڈیڈی کے سامنے رقص کر سکے گی۔"

''نہیں نہیں ایسا ناممکن ہے۔'' اس کے دل سے آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ چند ماہ پہلے اسکول میں ناٹک پیش کیا جانے والا تھا۔ اسکول کا سالانہ فنکشن تھا۔ سلونی کو بھی اس ناٹک میں کام کرنے کے لئے کہا گیا تھا...... سلونی کو ایک رقص میں حصہ لینا تھا یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئی تھی مگر جب یہی بات ممی نے سنی تو اس نے خود پرنسپل کے پاس جا کر سلونی کی جانب سے انکار کیا تھا۔ اسکول میں ڈانس ٹیچر نے کہا تھا...... میڈم سلونی بہت اچھا رقص کرسکتی ہے۔''

''مجھے رقص سے نفرت ہے'' ممی نے جواب دیا تھا۔

ٹیچر حیران رہ گیا تھا...... اس روز سلونی مایوس ہوگئی تھی۔

اس نے کمرے کا بھرپور جائزہ لیا۔ ایک ایک چیز کو دیکھا۔ ایک ایک چیز کو چوما۔ اچانک ایک بریف کیس میں کاغذ کا ایک پلندہ دیکھا۔ جلدی جلدی دیکھنے لگی۔ اس کی حیرت میں اضافہ ہوا جب اسے ایک ڈائری اور کچھ تصویریں مل گئیں۔ اس نے ڈائری کو چھپالیا اور تصویریں دیکھنے لگی۔ اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے سے ایک مدہم سی صورت اُبھری اور دوسرے ہی لمحے وہ اپنی آنٹی کو پہچان گئی...... یہ سب صنوبر کی تصویریں تھیں...... وہ سوچتی رہی من ہی من میں جانے کیا کرتی رہی۔ اس نے تصویریں دوبارہ بریف کیس میں ڈال دیں۔ کمرہ بند کیا اور اپنے کمرے میں آکر بستر میں گھس گئی شاید اپنی ممی کو یہ بتانے کیلئے کہ وہ دردسر میں مبتلا ہے......

وقت گزرتا رہا لیکن وہ آنٹی کی ڈائری سکون سے پڑھ نہ سکی۔ یہاں تک کہ اسے چھپانا بھی مشکل ہو رہا تھا......!

اب اسکول کا امتحاں پاس کر کے اس نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔!

کالج کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ اپنا رنگ روپ اپنا حسن۔ یہاں سلونی کے نئے دوست بنے۔ نئے ماحول میں وہ گھل مل گئی۔ ممی کی نگرانی بھی کسی حد تک کم ہوگئی تھی...... وہ اب صنوبر کی ڈائری پڑھ سکتی تھی۔

۱۱ر مارچ

موسمِ بہار کے شگوفوں کو میرا سلام!

چناروں کی آگ بجھ چکی ہے۔ چاروں جانب رونق نظر آ رہی ہے۔ لگتا ہے زندگی جیسے تمام نگاہوں کے ساتھ گہری نیند سے بیدار ہو چکی ہے۔ جشنِ بہار منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میں بھی ایک محفلِ رقص میں حصہ لے رہی ہوں۔ حالانکہ ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ اپنے کمرے میں کتنی بار رقص کیا ہے۔ اسکول اور کالج کے سٹیج پر بھی کئی بار رقص و موسیقی کے پروگراموں میں حصہ لیا لیکن وہ اور ہی بات تھی۔ محفل میں سب کے سامنے آؤں گی تو کیا پاؤں بھی اسی انداز سے متحرک ہو سکیں گے۔ سنا ہے سٹیج پر آنے کے بعد فنکار کو ہر دیکھنے والے کے وجود کو بھلا دینا چاہیئے۔ میں بھی یہی سوچ لوں گی کہ یہاں میرے علاوہ کوئی بھی نہیں ہے۔ جانے کیا ہوگا؟ کیا لوگ میرے رقص کو پسند کریں گے۔ تالیوں کی گونج مجھے کتنا سرشار کرے گی۔ میں اپنے لباس کو آراستہ کرلوں۔ ہر شکن مٹا دوں کہ زندگی کی راہ میرے تصورات کی طرح ملائم اور ریشمی دکھائی دے۔

۲۰/ مارچ

آج میں بہت خوش۔ ہوں میرے سینے کے اندر جو آواز نہ جانے کب سے تکمیل کیلئے انگڑائی لے رہی تھی، وہ پوری ہو گئی۔ میں نے محفلِ رقص میں حصہ لیا۔ میری ہر ادا، ہر حرکت پر حاضرین نے داد دی۔ جھوم جھوم اُٹھے اور تو اور مجھے دوسری بار رقص کرنا پڑا۔ کتنی بڑی بات ہے۔ میرا مہمانوں سے تعارف کرایا گیا۔ حاضرین نے جی کھول کر تالیاں بجائیں۔ مجھے تو اپنی خوش نصیبی پر رشک آ گیا۔ دوسرے فنکار ساتھیوں کے ساتھ کافی پی رہی تھی کہ کوئی صاحب ملنے آئے۔ میرے دوسرے ساتھی انہیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ مجبوراً مجھے بھی اُٹھنا پڑا۔ انہوں نے آتے ہی میرے رقص کی تعریف کی۔ نرملا نے کہا یہ کمل کپور صاحب ہیں۔ ان کے کئی ہوٹل ہیں۔ کہنے لگے۔

"دیوی جی آپ سراپا فنکار ہیں۔ آپ کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔"

"لیکن کہاں اور کیسے" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

انہوں نے کہا...... "میرے ہوٹل حاضر ہیں۔ ہر شام آپ ایک گھنٹے کا پروگرام دے

کرا پنے اندر پوشیدہ فنکارانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرسکتی ہیں۔'' میری زبان جیسے بند ہوگئی۔

''آپ گھبرائیے مت۔آپ کو معقول معاوضہ دینے کے لئے تیار ہوں......سوچیے اور مجھے جواب دیجیے''

یہ کہتے ہوئے وہ چلے گئے......کیا یہ آفر مجھے قبول کرلینی چاہیئے؟ کہیں مار یا دیدی اور پاپا......؟؟

ابھی جلدی کیا ہے۔میں سوچ لوں گی، ان کو منالوں گی۔اگر میں نے یہ آفر قبول کرلی تو......؟!!!

۲۵/مارچ

کئی دِنوں سے سوچ رہی ہوں کہ مجھے کمل پور صاحب کی آفر قبول کرلینی چاہیئے یا نہیں ......اُدھر انہوں نے تین چار بار پیغام بھجوائے۔میر یا دیدی اور پاپا کا خوف ہے۔ان سے بات کرنے کو من تو کرتا ہے لیکن ڈر محسوس ہو رہا ہے! وہ میری بات سن کر شاید ناراض ہوں گے...... ہاں ناراض تو ہوں گے ہی؟ لیکن میں کیا کروں، میرے سینے میں ایک ہوک سی اُٹھ رہی ہے اور مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی آواز میرے دل کی گہرائیوں سے اُبھر رہی ہو......صنوبر ایسے موقعے بار بار نہیں آتے......تم سراپا فنکار ہو۔اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرو...... یہ کیسی آواز ہے جو مجھے مجبور کر رہی ہے۔کیا میرے من میں کوئی فنکار چھپا بیٹھا ہے......!

۲۷/مارچ

میں نے کمل کپور صاحب کے ہوٹل مرنیا میں ہر شام رقص وموسیقی کے پروگرام میں حصہ لینے کا فیصلہ کرلیا ہے اور کپور صاحب کو بھی اس کی اطلاع دے چکی ہوں۔میں کل سے باقاعدہ وہاں جارہی ہوں۔ پاپا اور میر یا دیدی کو ابھی کہنے کی ضرورت نہیں۔وہ خود ہی جان جائیں گے۔میں انہیں سب بتادوں گی۔

۲۸/مارچ

آج پھر ایک بار مجھے یقین ہوگیا کہ میں رقص کرسکتی ہوں، ناچ سکتی ہوں۔آج ہوٹل

مرنیا بھرا پڑا تھا۔اس سے پہلے بھی میں کئی بار اپنی سہیلیوں کے ساتھ یہاں چائے یا کافی پینے کے لئے آتی رہی ہوں لیکن آج میں یہاں ایک نئے روپ میں آئی، اچھی خاصی تعداد تھی۔ مرد ......عورتیں اور بچے......آرکسٹرا کی دھنوں پر جب میں نے رقص کرنا شروع کیا تو مجھے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ میں ناچتی رہی۔ ہوش تو مجھے اس وقت آ گیا جب ہال میں بیٹھا ہر فرد تالیاں بجا بجا کر مجھے آفریں کہہ رہا تھا۔ ہر نظر ہر نگاہ مجھ پر تھی۔ جانے لگی تو کپور صاحب نے کہا۔

''صنوبر جی......آپ نے تو کمال کر دیا......''

۳۰/مارچ

میریا دیدی اور پاپا کو پتہ چل گیا ہے کہ میں ہوٹل جاتی ہوں۔ پاپا نے شاید کسی اخبار میں اشتہار دیکھا تھا۔انہوں نے کل رات مجھے خوب ڈانٹا۔ میں خاموش رہی......وہ میرے درد کو نہیں پہچان سکتے!

۱۷/اپریل

ایک طرف ہوٹل کا ماحول، یہ لوگ اور دوسری طرف گھر اور اس گھر میں دیدی......نہ ہوٹل چھوڑ سکتی ہوں اور نہ ہی گھر۔اس ماحول سے مجھے پیار ہے کہ اس نے مجھے وہ دیا جس کی میں متلاشی تھی۔ اس ماحول کو میں اب چھوڑ نہیں سکتی......اور گھر کا ماحول......آج میں جو کچھ بھی ہوں میریا دیدی اور پاپا کی بدولت ہوں۔ وہ مجھے سہارا نہ دیتے تو آج صنوبر کا نام کوئی نہ جانتا۔صنوبر کی ہر حرکت، ہر ادا پر سینکڑوں ہاتھوں میں جنبش نہ ہوتی۔ میریا نے ماں بن کر اور پاپا نے باپ بن کر میری پرورش کی۔ پڑھایا لکھایا رقص کی تعلیم دلائی۔ پاپا کہتے ہیں کہ انہوں نے مجھے رقص کی تعلیم و تربیت اس لئے نہیں دلائی کہ میں ہوٹلوں میں اجنبی نظروں کے سامنے ناچوں......اور میں سوچ رہی ہوں کہ یہ تو ایک آرٹ ہے فن ہے جسے بند کمرے میں قید نہیں کیا جا سکتا......!!

۲۸/اپریل

مجھے یہاں کام کرتے ہوئے ایک ماہ ہو چکا ہے۔ آج ایک اچھی خاصی رقم بھی مل گئی۔ میں نے یہ رقم میریا دیدی کو دینے کی کوشش کی، پاپا بھی تھے۔انہوں نے لینے سے انکار

کیا۔اب میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں اب اپنے پاؤں پر کھڑی ہونا چاہتی ہوں۔ان کا بھی سہارا بننا چاہتی ہوں۔

میرا یا دیدی سلونی کو بھی اب مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔نہ جانے کیوں؟!

ار مئی

پریتم کو میں پندرہ دنوں سے یہاں دیکھ رہی ہوں۔ ہر شام آتا ہے اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر کافی پیتا ہے۔ایک بات میں نے نوٹ کی ہے میرا رقص ختم ہونے پر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آجاتی ہے۔ وہ میری طرف کچھ ایسے دیکھتا رہتا ہے کہ میری پلکیں خود بخود جھک جاتی ہیں اور نہ جانے کس جذبے کے تحت شرمانے کو جی کرتا ہے۔

۵ر مئی

میں نے پریتم کے ساتھ بیٹھ کر کافی پی۔ وہ کس قدر دلچسپ شخص ہے اور کیسی مدھر مدھر باتیں کرتا ہے......فوج میں کیپٹن ہے۔

۹ر مئی

کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ محبت شبنم کے موتیوں سے زیادہ نازک ہوتی ہے اور جب یہ دل کے پھول پر گرتی ہے تو سارے وجود میں ایک اَن دیکھی سی کیفیت چھا جاتی ہے...... میرے لئے پریتم نے کوئی ایسا ہی روپ تو نہیں اپنالیا ہے؟ میں اسے چاہنے تو نہیں لگی ہوں...... نہیں تو؟!لیکن......پھر اس کیفیت کو کیا نام دوں؟!

۱۵ر مئی

پریتم ...... پریتم ۔ ہر لمحہ، ہر گھڑی اور ہر پل اس کی صورت نظروں کے سامنے رہتی ہے۔اس کی میٹھی میٹھی باتیں دل کو لبھاتی ہیں۔ وہ جب بھی میری تعریفیں کرنے لگتا ہے تو میں شرما جاتی ہوں......!

اس کے بعد ڈائری کے کچھ اوراق ضائع ہوئے ہیں یا ضائع کئے گئے ہیں......!!

۱۲ر اگست

پریتم اور میں نے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میر یا دیدی اور پاپا اس شادی سے ناخوش ہیں......

لیکن میں پریتم کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میں اپنے اندر کے فنکار کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سلا سکتی ہوں۔ اپنے فن کا گلا گھونٹ سکتی ہوں مگر پریتم کے بغیر رہ نہیں سکتی...... پریتم کی چھٹیاں ختم ہورہی ہیں اور ہم دونوں یہاں سے جا رہے ہے...... پاپا...... میر یا دیدی...... سلونی...... سب کو چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ میرے خدا مجھے یہ کیا ہوگیا ہے......!

۳۰ راگست

یہ رات اس کمرے میں میری آخری رات ہے۔ کیسی عجیب رات ہے۔ یہ رات اپنے ساتھ خوشی لائی ہے اور غم بھی...... دکھ سکھ ایک دوسرے میں تحلیل ہورہے ہیں۔ پریتم کو ہمیشہ کے لئے پانے کا خیال اور میر یا دیدی اپنی بہن کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ جانے کا ڈر...... اس شفقت کو چھوڑ دوں جو مجھے میری بہن سے۔ پریتم کو چھوڑ دوں جو مجھ سے والہانہ پیار کرتا ہے......؟

(آگے کی تحریر صاف پڑھی نہیں جاتی...... سلونی مشکل سے کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہے)

میرا قلم کانپ رہا ہے۔ انڈین ایئر لائنز سے سیٹ بک...... نیلا آسمان...... اوپر ہی اوپر...... خاندانی عزت...... سلونی کا خیال رکھنا دیدی...... آخری سلام میری پیاری بہن......؟!!

کالج کی فضاؤں نے سلونی کے خیالات میں ایک نیا رنگ بھر دیا۔ اس نے موسیقی اور رقص کو ایک مضمون کی حیثیت سے لے لیا اور اپنی تمام تر توجہ اسی طرف دینے لگتی۔ اپنی فرصت کا ہر لمحہ اس نے رقص اور موسیقی کے کمرے میں گزارنا شروع کیا۔ میوزک ٹیچر نے جب سلونی میں ان چیزوں کیلئے اتنی دلچسپی دیکھ لی تو وہ سلونی پر زیادہ توجہ دینے لگا۔ نئی نئی باتیں بتا تا رہا، سکھاتا رہا۔ سلونی بڑی خاموشی سے اس کی باتیں سنتی اور ان پر عمل کرتی۔ اکثر میوزک پیریڈ میں میوزک ٹیچر ہارمونیم بجاتا اور سلونی اس کی تان پر تھرک اُٹھتی۔ سوز وساز میں جب اس کے جسم کی لرزش اور تھرتھراہٹ شامل ہو جاتی تو ان کا ملاپ بے حد خوبصورت ہو جاتا۔ کبھی کبھار کوئی گیت بھی اس

کے نرم نرم ہونٹوں پر تھر کنے لگتا......اب اسے آنٹی کے کمرے میں جانے کی ضرورت کم ہی محسوس ہوتی ۔ جب کبھی دل یا ذہن کے کسی گوشے سے آنٹی صنوبر کی تصویر اُبھرتی محسوس ہوتی تو فوراً اس کی ڈائری نکال کر پڑھنا شروع کرتی اور خوب روتی ،صنوبر کیلئے صنوبر کے اَن دیکھے پیار کیلئے......!!

وہ من ہی من سوچتی ۔ ''ممی، آنٹی صنوبر کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کرتی ہے۔ڈیڈی نے بھی خاموشی اختیار کی ہے......کیاان کے دل میں صنوبر کیلئے ذرا بھی شفقت نہیں ......'' یہ سوچتے سوچتے اس کے من میں نفرت کا ایک جذبہ اُمڈ آتا۔اپنے ڈیڈی کے لئے۔اپنی ممی کے لئے ،اپنے ماحول کے لئے جہاں فن کی کوئی قدر نہیں۔ جہان فن کو پرکھنے والی نگاہ نہیں۔اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے...... '' کاش کوئی ان آنسوؤں کی قدر کرتا۔کوئی ان آنسوؤں کی کہانی سنتا......''!!

اور کبھی کبھار اسے آنٹی صنوبر کے لئے بھی نفرت کا ایک ہلکا سا احساس ہوتا۔وہ سوچتی اس نے کیوں پریتم کو اپنا لیا۔کیوں اپنے اندر کے فنکار کو ہمیشہ کے لئے سلا دیا۔عجب شئے ہے یہ محبت۔آنٹی کو رقص سے محبت تھی۔موسیقی سے لگاؤ تھا تو......کسی اور سے محبت کیوں کی...... پریتم سے پیار کیوں کیا......!

وقت کا پہیہ گھومتا رہا!

کالج کے ہر لڑکے اور لڑکی کی زبان پر اب سلونی کا نام تھا۔کالج میں جب بھی رقص یا موسیقی کا کوئی پروگرام ہوتا ،کوئی فنکشن ہوتا سلونی کا نام اس میں پیش پیش ہوتا ۔ کچھ شرارتی لڑکوں نے اسے کالج کی رقاصہ کا نام دے رکھا تھا۔

ادھر ماریا ان سب باتوں سے بے خبر تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ لڑکی کالج میں پڑھتی ہے اس لئے اس کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز میں زیادہ پختگی آئی ہے۔ وہ خود اپنا برا بھلا سوچ اور سمجھ سکتی ہے۔اس لئے سلونی کی زندگی میں اب اس کا زیادہ دخل نہ تھا۔خاص طور پر کالج کی زندگی کا۔ اسے اس بات کا بھی اندازہ نہ تھا کہ سلونی اپنی آنٹی کے نقشِ قدم کو اپنا رہی ہے۔!

سلونی کے ڈیڈی اور ممی چند دنوں کے لئے باہر گئے تھے لیکن یہ چند دِن سلونی کی زندگی میں ایک نیا پیغام، ایک نیا ولولہ اور ایک نیا حسن لے کر آ گئے۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ دونوں وقت کا کھانا آنٹی مونیکا کے گھر سے آتا تھا۔ کالج سے آنے کے بعد وہ آنٹی کے کمرے میں جاتی۔ ہر شام آنٹی کے کمرے کا دروازہ کھلتا۔ وارڈ روب میں لٹکا آنٹی کا خوبصورت لباس سلونی کے تن پر سجنے سنورنے لگتا...... وہ معمول کی ایک شام تھی، سلونی آنٹی صنوبر کے کمرے میں اس کا قیمتی لباس زیبِ تن کئے باہر کی دنیا سے بے خبر اپنی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ آنٹی مونیکا چلی آئی اور سلونی کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے پاؤں ساکت ہو گئے۔ جیسے اس کے جسم میں جان نہ ہو بلکہ وہ پتھر کی ایک مورتی ہو۔ خاموش بے حس مورتی......!

سلونی نے اسے دیکھا ایک لمحے کے لئے وہ گھبرا گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ بگڑ گیا لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

''آؤ......آؤ آنٹی مونیکا''

مونیکا جیسے کسی گہرے سپنے سے جاگ اُٹھی!

وہ اندر آئی......سلونی کے قریب اور قریب۔ اس نے سلونی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

آنٹی مونیکا'' سلونی نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا''

''میری طرف دیکھ......میری طرف''

''کیا ہے آنٹی''

وہی آنکھیں، وہی چہرہ، وہی بال، وہی رنگ وروپ، وہی لباس۔ سب کچھ وہی...... سب کچھ صنوبر جیسا''

''آنٹی......آنٹی میں سلونی ہوں......صنوبر نہیں''

''ہاں جانتی ہوں کہ تم صنوبر نہیں، سلونی ہو لیکن نام میں کیا رکھا ہے، بیٹی سلونی''

آنٹی مونیکا روتی ہوئی واپس چلی گئی۔ یہ لمحہ کیسا تھا جس نے سلونی کو صنوبر کا روپ دیا

تھا۔سلونی کی آنکھوں میں یہ کیسا پیغام تھا جس نے آنٹی مونیکا کو رونے پر مجبور کیا۔یہ کیسی دھڑکن تھی جو رفتہ رفتہ اس کے دل اور ذہن پر ایک نقش بنا رہی تھی۔

رات کے کھانے پر سلونی نے آنٹی مونیکا کے ساتھ صنوبر کا ذکر چھیڑا۔سلونی نے کتنی ہی باتیں کہیں لیکن مونیکا نے کوئی جواب نہ دیا۔وہ خاموشی سے مونیکا کو دیکھے جا رہی تھی۔

اچانک جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا۔سلونی نے کہا

''کاش آنٹی صنوبر زندہ ہوتی''

''کون کہتا ہے کہ صنوبر مر چکی ہے وہ زندہ ہے اور......''

''ہاں''

''لیکن ممی''

''تمہاری ممی جھوٹ کہتی ہے۔تمہاری آنٹی ممبئی میں ہے اور اپنے خاوند کے ساتھ رہتی ہے۔ان کے دو بچے بھی ہیں۔''

''لیکن آنٹی مونیکا تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہے''

''میں سب جانتی ہوں، سب کچھ......تمہاری ممی بھی جانتی ہے تمہارا ڈیڈی بھی واقف ہے......''

سلونی ایک ہی سانس میں صنوبر کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتی تھی۔

''اب بھی اس کے خط تمہاری ممی کے نام آتے ہیں۔میں نے خود خط پڑھے ہیں۔ تمہاری ممی اپنی بہن سے شدید نفرت کرتی ہے۔وہ اس کا منہ تک دیکھنا نہیں چاہتی۔''

''میرا بس چلے تو میں......'' اس کے آگے سلونی کچھ بھی نہ بول سکی اور اس کا گلا بھر آیا اور روتے روتے کہا۔

''آنٹی مونیکا، مجھے صنوبر کا ایڈرس بتاؤ۔ میں اسے خط لکھوں گی، اسے اپنے پاس بلاؤں گی۔وہ نہیں آئے گی تو خود چلی جاؤں گی......آنٹی......پلیز آنٹی''

مونیکا خاموش ہو گئی۔

''تم جانتی ہو کہ میں آنٹی سے کس قدر پیار کرتی ہوں''

مونیکا چونک پڑی...... ''سلونی، میری بات سنو''

''تم اس کا ایڈرس نہیں بتاؤ گی تو میں خود اس کی تلاش میں ممبئی جاؤں گی۔''

''میری بات سنو''

''میں اب کچھ بھی سننا نہیں چاہتی...... میری آنٹی زندہ ہے۔''

''میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا کہ تمہاری آنٹی زندہ ہے۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ تم اسے کس قدر محبت کرتی ہو...... تمہاری آنکھیں، تمہارے بال، تمہارا چہرہ اور رنگ ولباس دیکھ کر اچانک صنوبر کی صورت نظروں کے سامنے پھر گئی اور میں نے اس کا ذکر چھیڑ دیا۔

''تم نے بھی میری ماں کی طرح جھوٹ بولنا شروع کردیا ہے...... میری آنٹی صنوبر زندہ ہے میں اس کے پاس جاؤں گی۔ اس کے سامنے رقص کروں گی اور بتاؤں گی کہ اس نے میرے روپ میں ایک بار پھر جنم لیا ہے۔''

مونیکا سٹپٹا گئی، لیکن وہ مجبور تھی۔ بات اس کے منہ سے نکل چکی تھی۔

''میرے پاس تمہاری آنٹی کا ایڈرس نہیں البتہ تمہاری ممی یا ڈیڈی کے پاس ضرور اس کا کوئی نہ کوئی خط ہوگا...... میں نے کہا کہ کبھی کبھار اس کے لیٹر آتے رہتے ہیں۔ وہ خط تلاش کرو...... شاید صنوبر کا ایڈرس مل جائے۔''

اس رات سلونی نے اپنے گھر کی ایک ایک چیز دیکھ ڈالی مگر اسے صنوبر کا کوئی خط نہ ملا۔ اس رات وہ سو نہ سکی......!!

اس روز کالج کی سالانہ تقریب تھی۔ شہر کے ذی عزت اور صاحبِ اقتدار لوگوں کے علاوہ طلباء اور طالبات کے والدین کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ سالانہ تقریب کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ باہر کے گیٹ سے لے کر کالج کی بلڈنگ تک سب خوب سجایا گیا تھا۔ ہر طرف پھولوں کے رنگ برنگی گیٹ بنے تھے۔ رات کے اندھیرے میں بجلی کے رنگ برنگے قمقمے جھلملا رہے تھے۔ پھول ہنس رہے تھے اور زندگی مسکرا رہی تھی۔ دوسرے والدین کے ساتھ ساتھ سلونی کی ممی اور

ڈیڈی بھی ہال میں موجود تھے۔

پروگرام کا آغاز پرنسپل کے ایڈرس سے ہوا۔ انہوں نے کالج کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد ایک ڈرامہ کھیلا گیا۔ ایک محفل رقص وموسیقی کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ جب سٹیج سیکرٹری نے مس سلونی کا نام لیا تو ایک لمحے کے لئے جیسے سلونی کی ممی کی دل کی دھڑکنیں بند ہوگئیں۔ اس کا بس چلتا تو سارے ہال کو آگ لگا دیتی۔ ہاں آگ جو اس کے من میں لگ چکی تھی اور جس نے اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سٹیج سیکرٹری نے ابھی اعلان کیا تھا......

"حاضرین اب کالج کی سکنڈ ائیر کی طالبہ مس سلونی آپ کے سامنے رقص پیش کر رہی ہیں۔
مس سلونی

اس کے بعد سٹیج سیکرٹری نے کیا کہا۔ ممی نے کچھ بھی نہ سنا۔ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس دیں۔ اسی دوران ہال کی روشنی گل ہوگئی، پردہ اُٹھ گیا، رنگ برنگی روشنی کے درمیان سلونی نے اپنا رقص شروع کیا......

لگ رہا تھا جیسے سٹیج پر کنول کا پھول کھل اُٹھا ہوا اور مسکرا رہا ہو......اور ممی اس سوچ میں پڑ گئی کہ یہ سلونی ہے یا صنوبر۔ سلونی نے جو لباس پہن رکھا تھا وہ صنوبر کے لباس سے مختلف نہ تھا۔

ساز بجتے رہے۔ شاخ جھکتی رہی۔ پاؤں تھرکتے رہے، باز و لہراتے رہے اور رقص ہوتا رہا......!

سلونی کی ہر ادا، ہر حرکت پر حاضرین کی تالیوں سے ہال گونجتا رہا۔

اس کے بعد انعامات کی تقسیم تھی۔ ممی سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ وہ اس آگ پر قابو نہ پاسکی جو اس کے من اور تن کو لپیٹ میں لے چکی تھی۔

گھر آتے ہی وہ سب سے پہلے صنوبر کے کمرے میں گئی۔ اندر قدم رکھتے ہی اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ آج وہ اتنی مدت کے بعد اس کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کمرے کی ایک ایک چیز اسے بھولی بسری کہانی یاد دلا رہی تھی۔ جس کا ہر نقش ہر خیال وہ اپنے

ذہن سے مٹا چکی تھی لیکن اب اس کمرے میں آ کر وہ کہانی ایک بار پھر زندہ ہو گئی تھی۔ اس کہانی کا ہر نقش قالین کے نقش و نگار کے روپ میں مسکرا رہا تھا۔ ہر خیال قد آدم آئینے میں جگمگا رہا تھا۔ میریا نے اپنے آپ کو سنبھالا اور لرزتے ہاتھوں سے وارڈ روب کا دروازہ کھولا۔ سب چیزیں ایسی ہی تھیں جیسے صنوبر چھوڑ کر چلی گئی تھی مگر صنوبر کا وہ لباس غائب تھا جو وہ اکثر رقص کرتے وقت استعمال میں لاتی تھی۔

وہ باہر آ کر سلونی کا انتظار کرنے لگی۔

سلونی کافی دیر سے گھر لوٹ آئی!

''سلونی'' میریا نے چلاتے ہوئے کیا

''کیا ہے ممی!

''تم نے کس کی اجازت سے رقص کی محفل میں حصہ لیا''۔

سلونی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک ہاتھ ہوا میں لہرایا اور سلونی کے نرم و نازک گال پر ایک نشان پڑ گیا۔

سلونی پھر بھی خاموش رہی۔

''تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتی''

''ممی'' سلونی نے کہا...... ''تم اس سوال کا جواب اپنے من سے بھی پوچھ سکتی ہو۔''

اور پھر نہ جانے کیا ہوا۔ ہاتھ ہوا میں ایک بار پھر لہرایا اور لہراتا ہی رہا۔ ''ممی'' سلونی نے کہا ''تم اپنے من سے، اپنے آپ سے اس سوال کا جواب نہیں پوچھ سکتی۔ کیونکہ تمہارے دل میں نفرت ہے اپنی بہن کیلئے اور جس کا انتقام اب تم مجھ سے لینا چاہتی ہو۔ رقص کرنا کوئی گناہ نہیں۔ یہ تو آرٹ ہے اور اسے دیکھنے کے لئے آنکھ چاہیئے۔ سمجھنے کے لئے شعور چاہیئے جو تم میں نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو تم اپنی زندگی میں اس بہن کو گھر سے بے گھر نہ کرتی جس کی تم نے ماں بن کر پرورش کی...... تم کہتی تھی کہ آنٹی صنوبر مر چکی ہے لیکن آج ممی تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ میری آنٹی اور آپ کی بہن زندہ ہے۔ ممبئی میں رہتی ہے اور اس کے دو بچے ہیں۔''

''تمہیں یہ سب کچھ کس نے بتایا۔''

''ممی تم میری آنکھوں میں جھانکو، اپنے دل میں ڈوب کر بتاد، کیا آنٹی صنوبر زندہ نہیں ہے۔''

''وہ میرے لئے مر چکی ہے۔''

''لیکن میرے لئے نہیں۔ میں نے آنٹی صنوبر کے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھا ہے۔ اُس کمرے کے در و دیواروں نے کئی بار میرے گھنگروں کی آواز کو اپنے اندر چھپالیا ہے اور ...... میں نے خود آنٹی کی ڈائری کو پڑھا ہے۔ ایک بار نہیں کئی بار، سینکڑوں بار۔ اس ڈائری کا ایک ایک لفظ میرے دل کی کتاب پر لکھا ہوا ہے۔ میں سب جانتی ہوں۔''

کمرے میں سلونی کے ڈیڈی بھی آ گئے اور وہ اپنی بیوی کو کمرے سے باہر لے گئے۔

ممی کے جانے کے بعد سلونی کو محسوس ہوا کہ اس کے دل کے جہلم میں جو سیلاب آ گیا تھا وہ اب اُتر چکا ہے، شانت ہو گیا ہے۔

اندر کمرے میں ڈیڈی اپنی بیوی میریا سے کہہ رہا تھا۔

''لڑکی بالغ ہو چکی ہے اور بالغ لڑکی پر ہاتھ اُٹھانا زیب نہیں دیتا۔''

چند دنوں کے بعد سلونی کا کالج جانا بند کر دیا گیا۔ صنوبر کے کمرے کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ اسی دوران سلونی کو صنوبر کا ایک خط ملا گو کہ یہ خط بہت پرانا تھا لیکن خط کے ایک حصے میں صنوبر کا ایڈرس صاف صاف لکھا تھا......!

سلونی نے یہ خط چھپالیا......!!

سلونی کئی راتیں سو نہ سکی۔ وہ ایک عجیب سی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو چکی تھی۔ دل پر بوجھ تھا اور نگاہوں کے سامنے مختلف تصویریں ابھر رہی تھیں۔ ایک طرف پاپا اور ممی دوسری طرف آنٹی صنوبر اور اندر چھپا فنکار...... کئی دن اور کئی راتیں وہ زندگی کے ایک ترازو سے دوسرے ترازو میں لٹکتی رہی اور پھر ایک دن اس نے ایک فیصلہ کر لیا...... اس فیصلے پر وہ اداس ہوئی اور خوش بھی۔ اس کی آنکھوں نے آنسو بھی بہائے اور لبوں نے مسکراہٹ کے پھول بھی بکھیر دیئے......!

سلونی نے اپنی ممی کو ایک خط لکھا۔

ممی!

یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری ہے جو میں تمہیں لکھ رہی ہوں۔ آج یہ خط لکھتے ہوئے میں اُداس بھی ہوں اور خوش بھی۔ اداس اس لئے کہ میں تم کو چھوڑ کر جا رہی ہوں اور خوش اس لئے کہ میں اپنی آنٹی کو پانے کے لئے جا رہی ہوں میں۔ جانتی ہوں کہ تمہارے دل میں میرے لئے کتنے ارمان ہوں گے۔ تم نے کتنی بار سپنوں میں مجھے دلہن بنتے دیکھا ہوگا۔ تم نے کتنی بار ڈھولک اور بابل کے گیت سنے ہوں گے، کتنی بار تمہارے گھر کے دروازے پر شہنائیاں بجی ہوں گی۔ نہ جانے کتنی بار تم نے نیند میرے ہاتھوں کو چوما ہوگا۔ جانتی ہوں کہ تم نے صنوبر کیلئے بھی ایسے ہی سپنے دیکھے ہوں گے۔ ایسے ہی سوچا ہوگا۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ممی لیکن صنوبر کی دنیا وہ تھی جو تم نے سپنے میں دیکھی تھی یا جس کا تصور تم نے جاگتے میں کیا تھا۔ صنوبر کی دنیا میں فن اپنی بلندیوں کو چھو رہا تھا، وہی میری دنیا بھی ہے۔ ہماری اس دنیا سے تمہیں نفرت ہے۔ مجھے جس روشنی کی تلاش ہے وہ تمہاری دنیا میں میسر نہیں!

میں صنوبر آنٹی کے پاس جا رہی ہوں۔ میں جان گئی ہوں کہ وہ کہاں رہتی ہے، اس لئے میرے لئے فکر مند نہ ہونا۔ ہو سکے تو میری غلطیوں کو معاف کرنا۔ ڈیڈی کا خیال رکھنا اور اپنا بھی!

اچھا ممی میں جا رہی ہوں اپنی منزل پانے کے لئے، اپنی آرزوؤں کی تکمیل کیلئے یسوع مسیح سے میرے لئے دعا مانگنا، میری اپنی ممی......!!

سلونی

میریا کو جب سلونی کا یہ خط ملا تو وہ کب کی جا چکی تھی۔

میریا کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی......ایک بھیانک اور طویل تاریکی......!!

نیا شہر، نئے لوگ، نیا ماحول......سلونی کے خوابوں کی دنیا ممبئی!

ٹرین سے اُترتے ہی سلونی کو احساس ہوا کہ وہ اکیلی ہے، تنہا ہے اور زندگی کا طویل

سفر اب شروع ہو رہا ہے۔ اسے دور بہت دور جانا ہے۔ اُسے آنٹی صنوبر یاد آئی اور بے ساختہ اس کا ہاتھ اس جیب کی طرف بڑھ گیا جہاں صنوبر کا ایڈرس موجود تھا۔

''میم صاحب'' آپ کا سامان''

وہ چونک پڑی۔

''یہ اٹیچی''

سٹیشن سے باہر آئی۔ باہر آکر اس کی نظروں کے سامنے واقعی ایک نیا شہر تھا۔ ایک ہی لمحے میں کتنے لوگ، کتنے چہرے سب کے سب اجنبی۔

''میم صاحب، ہوٹل''

''میم صاحب، کدھر جانا مانگتا''

''میم صاحب، ہمارا ہوٹل اچھا ہے اور سستا بھی''

''میم صاحب، تاج لے چلوں آپ کو''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے پاس جواب دینے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ اپنی آنٹی سے ملنے آئی تھی۔ ایک نئی دنیا بسانے کیلئے، ایک نئے خواب کی تعبیر کی تلاش میں!

''ٹیکسی''

ٹیکسی آئی اور قلی نے سامان رکھا، وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

اچانک ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی ...... لگتا ہے سالی ممبئی ایکٹرس بننے کیلئے آئی ہے۔''

''پر بل تو دیکھو۔ چار دنوں میں پتہ چل جائے گا۔'' کسی نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک موٹی سی گالی دی جو سلونی نے پہلی بار زندگی میں سنی تھی۔ اس کا جی کر رہا ہے کہ اس لفنگے کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مار دے اور......!

''کہاں چلنا ہے میم صاحب: اس کے خیالات کا رخ بدل گیا۔

''کھار''

''کون سی سڑک''

''بارہویں''

ٹیکسی خراٹے بھرتی رہی۔ سلونی اُدھر ادھر دیکھتی رہی۔ بڑے بڑے مکان اونچے اونچے مکان، بڑی بڑی دکانیں۔ مشینوں کی طرح چلتے پھرتے لوگ۔ ایک دوسرے سے بے خبر اپنی دینا میں گم......!

ٹیکسی رک گئی۔

سلونی کا ہاتھ ایک بار پھر جیب کی طرف بڑھ گیا، اس نے کاغذ کا پرزہ نکالا اور اسے پڑھنے لگی......!

کیپٹن پرتیم پال

شانتی نِواس ۱۲/ویں سڑک، کھار ممبئی ۵۲۔

''ذرا دیکھو تو شانتی نِواس کہاں ہے۔''

ڈرائیور دیکھنے چلا گیا تو سلونی کے من میں خیال آیا...... ''مجھے آنٹی کو پہلے لیٹر لکھ لینا چاہیئے تھا تاکہ وہ میرا انتظار کرتی۔ کیا وہ مجھے پہچان سکے گی۔ ارے کیوں نہیں۔ سب ہی تو کہتے ہیں کہ ہم دونوں کی صورت ملتی ہے۔ وہ مجھے دیکھے گی تو کس قدر خوش ہوگی۔ اس کے بچے اور کیپٹن صاحب بھی......!

''میم صاحب، شانتی نواس سامنے ہے''

ٹیکسی سے سامان اُترا اور قلی نے اسے شانتی نِواس تک پہنچا دیا۔ سلونی نے اپنے مختصر سے سامان کو لان میں رکھا اور اوپر جا کر اپنی آنٹی کا پتہ کرنے گئی۔

ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک۔ ایک سیٹ سے دوسرے سیٹ تک۔ ایک چہرے سے دوسرے چہرے تک۔ کوئی بھی کیپٹن پرتیم پال کو جانتا نہ تھا۔ سلونی گھبرا گئی۔

''کیا یہ شانتی نواس نہیں ہے۔''

جواب ملتا ہے شانتی نِواس تو یہی ہے۔

''کیپٹن پرتیم پال، اس کی بیوی صنوبر اور دو بچے''

گردن نفی میں ہل جاتی۔

شانتی کہیں نہ تھی، صرف نواس رہا گیا تھا۔

''یہ کیسے لوگ ہیں جو ایک ہی بلڈنگ میں رہتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ ایک بلڈنگ، ایک مکان، ایک گھر لیکن ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں کوئی سمبندھ نہیں......''

سلونی جس سہارے یہاں آئی تھی وہ سہارا چھوٹ گیا تھا۔ جو سفر اس نے امنگوں اور حوصلوں سے شروع کیا تھا وہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی محرومیوں اور مایوسیوں میں بدل گیا تھا۔ زندگی کو روشن دیکھنے کی جو تمنا اس کے دل میں ابھر آئی تھی وہ دھیرے دھیرے تاریکی میں گم ہوگئی تھی اس نے اپنی آنٹی کے سہارے، اپنے فن کے سہارے کائنات کو حسین بنانے کا جو خواب دیکھا تھا وہ خواب وہ سپنا آنکھ کھلنے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا تھا............!

وہ مایوس ہو کر پھر لان میں لوٹ آئی۔ اس کا ہاتھ ایک بار پھر جیب کی طرف بڑھ گیا۔ چھوٹے سے کاغذ پر لکھا ہوا ایڈرس اب بھی موجود تھا اور مسکرا مسکرا کر اس کا مذاق اُڑا رہا تھا......

اس نے ایڈرس کو جیب میں رکھا اور اس کا ہاتھ ان چکنے چکنے نوٹوں سے ٹکرا گیا جو اس نے بچپن سے لے کر اب تک سنبھال کر جمع کئے تھے۔

اب یہی چند نوٹ اس کا سہارا تھے۔ کاغذ کے یہی رنگدار پُرزے اس کی کائنات تھے۔

سامان پھر ٹیکسی میں رکھا گیا

''کہاں لے چلوں، میم صاحب''

''کوئی اچھا اور سستا ہوٹل''

ٹیکسی پھر ان ہی سڑکوں پر دوڑنے لگی جن پر ابھی چند لمحے پہلے سلونی نے ایک اُمنگ، ایک خواہش لے کر سفر شروع کیا تھا۔ اس لمحے وہ سڑک کتنی خوبصورت تھی کہ وہ سلونی کو اپنی آنٹی سے ملانے جا رہی تھی سڑک وہی تھی لیکن کس قدر بدصورت کہ آنٹی ملنے سے پہلے ہی بچھڑ گئی تھی۔

ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا، چھوٹے سے کمرے تھے اور شاید چھوٹے سے لوگ بھی تھے۔

ایک چھوٹے سے کمرے میں سلونی نے اپنا اٹیچی رکھا، اسے کھولا، منہ ہاتھ دھویا اور چائے پی۔

شام کے طویل سائے رات کی تاریکیوں میں بدل گئے۔

سلونی سو نہ سکی۔ نیند جیسے آنٹی صنوبر کی طرح کہیں دور چلی گئی تھی۔

دل سے آواز آئی...... ''واپس جاؤ...... واپس جاؤ...... یہ ممبئی ہے۔

یہاں کے لوگ ایک دوسرے کو نہیں جانتے نہیں پہنچانتے...... تمہیں کیا پہنچانیں گے۔

ذہن نے سرگوشی کی۔

''تم آنٹی سے ملنے آئی تھی، اپنے فن کو جلا بخشنے کے لئے آنٹی نہ ملی تو کیا ہوا؟ فن تمہارے پاس ہے۔ آرٹ تمہارے پاؤں کی تھرک میں پوشیدہ ہے۔ اگر تم میں ہمت ہے تو یہ لوگ خود ایک دن تمہیں پہنچاننے کیلئے مجبور ہوں گے۔''

دل سے پھر آواز آئی۔

''تنہا ہو، خوبصورت ہو، جوان ہو۔ مردوں کی نگاہیں فوراً تمہاری خوبصورتی اور جوانی کو پہچان سکتی ہیں۔ اب بھی وقت ہے، لوٹ جاؤ۔''

''کہاں''

''اپنے گھر''

''گھر...... کون سا گھر، کس کا گھر۔ جو میرا گھر تھا وہ اب میرے لئے اجنبی بن چکا ہے اس گھر کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے ہیں۔ ایسے ہی جیسے صنوبر کیلئے ہوئے تھے......''

''تو میں کیا کروں''، سلونی جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی اور ایک بار پھر اسے احساس ہوا کہ وہ تنہا ہے لیکن تب بھی تو وہ تنہا تھی جب ہوا کے ایک جھونکے سے آرزوؤں کے کتنے سرسبز پتے چھوٹ آئے تھے۔ دل کی کہانی کو عنوان مل گیا تھا۔ تب اور اب میں فرق ہے...... پھول پیاسا ہے۔

دوسری صبح وہ پھر شانتی نواس گئی۔ ایک بار اور اس سڑک نے اس کے قدموں کی آہٹ کو چوما۔

شانتی نواس ایسے ہی کھڑا تھا...... وہی کمرے...... وہی لوگ...... وہی چہرے لیکن کیپٹن پریتم پال کا کوئی کمرہ نہ تھا، کوئی گھر نہ تھا۔ ایک بڈھیا جس کے چہرے کے کھنڈر اس کے بنگالی ہونے کی نمائندگی کر رہے تھے، سلونی کی پریشانی اور گھبراہٹ کو سمجھ گئی۔

''بیٹا، تم کس کیپٹن پریتم پال کو ملنا مانگتا۔''

اب وہ کیا جواب دیتی کہ وہ کس کیپٹن پریتم پال کو ملنا چاہتی ہے۔ اس نے پریتم کو دیکھا ہی کہاں تھا۔ اس کی صورت تک نہ دیکھی تھی اور آنٹی......؟!

بڈھیا نے اپنی بات جاری رکھی

''ایک فوجی آفیسر ادھر ضرور رہتا تھا، اس کا وائف...... کیا نام تھا اس کا...... یاد نہیں آرہا ہے...... ہاں...... ہاں......''

''صنوبر''، سلونی نے اس کی بات پوری کی۔

''صنوبر...... ہاں صنوبر اس کا دو بچہ''

''ہاں میں اسی کیپٹن پریتم پال کو تلاشی کر رہی ہوں جس کی بیوی صنوبر ہے اور جن کے دو بچے ہیں۔ وہ لوگ اب کہاں ہیں''

''تم ان لوگوں کو تلاش کرتا ہے وہ تو کب کا آسام چلا گیا۔''

''آسام''

''ہاں ان کا پرموشن ہوا تھا اور ٹرانسفر بھی...... تم اس کا کیا لگتا''

اس سوال کا سلونی کے پاس کوئی جواب نہ تھا...... وہ نامراد واپس آئی......!!!

کئی دن بیت گئے، وہ واپس جانے کی کشمکش میں ڈوب گئی۔ یہاں تک کہ اس کے پاس جو پیسہ تھا ختم ہو گیا اور اب ہوٹل میں ٹھہرنا ناممکن بنتا جا رہا تھا...... وہ اب کہاں جائے کیا کرے......؟!

ہوٹل کے مالک رحمان دادا کو یہ جانکاری مل چکی تھی کہ سلونی کے پاس اب کوئی پیسہ نہیں، اس نے کمرے سے باہر نکلنا بھی بند کر دیا ہے۔

وہ اس کے کمرے میں آیا......

''تم نے کئی دنوں سے ہوٹل کا بل نہیں چکایا۔''

سلونی گھبرا گئی، خدا جانے اب کیا ہوگا اس کا ہاتھ سینے کی طرف اٹھ گیا۔

''ہاں سلونی نے گھبراتے ہوئے کہا

''کیوں نہیں چکایا''

''اس لئے کہ اب میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔''

''میم صاحب، میں نے یہ ہوٹل اُدھار دینے کے لئے نہیں کھولا ہے۔''

'' میں جانتی ہوں''

''پھر ہمارا پیسہ......؟

''خاموشی......طویل خاموشی!

''تم ادھر کیسے آیا''

''اپنی آنٹی سے ملنے''

''تمہارا آنٹی کدھر ہے''

''وہ وہاں چلی گئی ہے جہاں میں نہیں جاسکتی'' سلونی رونے لگی''

رحمان دادا کی صورت بڑی ڈراوٗنی تھی اس نے اپنی زندگی میں کتنی پستیاں اور بلندیاں دیکھی تھیں۔ سلونی کو روتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوگئی۔ اس کے ہاتھ کئی بار سلونی کی جانب بڑھے لیکن نہ جانے کیا سوچ کر پلٹ آئے۔ آخر ایک بار بڑھ ہی گئے......

''بیٹی تم کیا چاہتی ہو'' رحمان داد کا اندر کے انسان جاگ اُٹھا،

سلونی نے اپنی پلکیں اُٹھا کر دیکھا۔ رحمان دادا کی آنکھوں کی وہ تیز چمک نہ جانے

کہاں غائب ہو چکی تھی!

سلونی نے اپنی ساری کہانی سنادی!

رحمان دادا نے کہا...... "یہ ممبئی ہے۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں۔ کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ کوئی کسی کو نہیں پہچانتا...... تم خوبصورت ہو جوان ہو، زمانہ خراب ہے۔ لوگ بُرے ہیں۔ گھر واپس لوٹ جاؤ"

"لیکن میں گھر واپس نہیں جاسکتی"

"گھر نہیں جاسکتی تو نوکری کرو"

"کہاں"

"وہ میرے ذمہ ہے تم فنکار ہو رقص کر سکتی ہو۔ میں تمہیں نوکری دلوادوں گا......"

سلونی سوچنے لگی کہ رحمان دادا کی صورت میں یہ فرشتہ کہاں سے آ گیا۔ رحمان دادا کئی دن نہ ملا۔ اس نے اپنے کمرے کے ویٹر سے پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ سلونی کو وقت پر چائے ملتی کھانا ملتا۔ ضرورت کی ہر چیز مل جاتی اور پھر ایک دن رحمان دادا اس کے کمرے میں آ گیا اور دوسرے دن سلونی کو ہوٹل انورادھا لے گیا۔

ہوٹل انورادھا......!

اس ہوٹل میں ہر شام رقص کا پروگرام...... دو گھنٹے کی نوکری معقول معاوضہ......

اس رات سلونی بہت جلد سو گئی۔ ایک فرشتہ اس کے سرہانے کھڑا اس کی خوبصورتی اور جوانی کی نگرانی کر رہا تھا......!

سلونی نے جس آرزو کی تکمیل کے لئے یہ اجنبی گھر اپنا لیا تھا وہ آرزو شاید اپنے گھر میں آنٹی صنوبر کے کمرے میں کہیں رہ گئی تھی۔ جس قالین کے نقش و نگار پر اس کے پاؤں تھرک اٹھتے تھے ان میں اور ہوٹل انورادھا کے چکنے سپید فرش میں ایک طویل فاصلہ تھا...... ایسا فاصلہ جو ایک گھر سے بے گھر ہونے تک ہوتا ہے!

وہی سلونی تھی۔

وہی رقص تھا......لیکن فاصلہ کس قدر طویل تھا۔

ہر شام جب آرکسٹر کی دھنیں ہوٹل انورادھا کی فضا میں بکھر جاتیں اور سپید چکنے چکنے فرش پر سلونی کا رقص شروع ہو جاتا تو کتنی ہی نگاہیں سلونی کو گھورتیں ۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتیں۔ ان نگاہوں میں کتنے اشارے ہوتے ۔ جب اس کا رقص ختم ہو جاتا، آرکسٹرا کی دھنیں خاموش ہو جاتیں اور سارا ہال تالیوں کی گونج سے کانپ اُٹھتا۔ لوگ مسکرا مسکر کر سلونی کا سواگت کرتے ۔ ان مسکراہٹوں میں کتنے پیغام ہوتے ، کتنے اشارے ہوتے، سلونی اب بخوبی جان گئی تھی۔

کلی اب بھی تنہا تھی

پھول اب بھی پیاسا تھا

سلونی نے رحمان دادا کا ہوٹل چھوڑ کر دو کمروں کا یک فلیٹ لے لیا۔ اب اسے لینے کے لئے ہر شام انورادھا ہوٹل کے مالک کھنہ کی کار آجاتی اور پروگرام دینے کے بعد وہی کار چھوڑنے جاتی ۔ سلونی اب اس قدر مقبول ہو چکی تھی کہ شام ہوتے ہی انورادھا ہوٹل میں تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی ۔ سلونی کے رقص (رقص ایک بہانہ تھا) جسم میں دلچسپی رکھنے والے وقت سے پہلے ہی چلے آتے یا ریزرویشن کراتے......! سلونی کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ ہوٹل انورادھا کا مالک بھی یہ بات جانتا تھا، اسی لئے وہ سلونی کی کوئی بھی بات ٹالنا نہیں چاہتا تھا۔

جب سلونی تھکن سے چور اپنے فلیٹ میں آتی تو اسے یکدم اپنی تنہائی کا احساس ہوتا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں اور اس کی نظروں کے سامنے کبھی آنٹی صنوبر کی صورت پھر جاتی اور کبھی اپنے پاپا اپنی ممی کی......!!

''یہاں آکر مجھے کیا ملا۔ گھورتی ہوئی نگاہیں جن میں اشارے پوشیدہ ہیں۔ مسکراتے ہوئے لب جن میں پیغام بکھرتے ہیں۔ ان اشاروں اور ان پیغاموں میں میرے فن کی کوئی قدر نہیں ۔ یہ اشارے اور یہ پیغام میرے جسم کے لئے ہیں۔ میری جوانی کے لئے ہیں......کاش کوئی میری روح میں اترنے کی کوشش کرتا......''

اور وہ رونے لگتی!

اُسے لگتا جیسے اس کے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی چھا گئی ہو اور اس تاریکی میں رحمان دادا کی صورت میں ایک فرشتہ کھڑا ہے۔

''کاش میں نے رحمان دادا کی بات مان لی ہوتی۔ اس وقت کچھ بھی نہ بگڑا تھا۔''

کبھی کبھی وہ سوچتی ''کیا ہوٹل انورادھا میں رقص کرنا ہی وہ فن ہے جس کی میں متلاشی تھی۔ کیا یہی وہ فن ہے جس کی شمع بچپن سے میرے دل کے مندر میں جل رہی ہے......''

جب اُسے کوئی جواب نہ ملتا تو وہ تاریکی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتی......!!

وقت گزرتا رہا!!

سلونی اب بہ خوبی ماحول سے واقف ہو چکی تھی۔ وہ تو ہوٹل انورادھا کے کھنہ کو بھی پہچان گئی تھی جو بظاہر انسان صورت تھا لیکن اس کے اندر ایک شیطان چھپا بیٹھا تھا۔ دراصل انورادھا میں آنے والے سب لوگوں کے اندر کوئی نہ کوئی شیطان پوشیدہ تھا۔ یہ سب چہرے نقلی تھے۔ یہ سب لباس نقلی تھے۔ یہ خوبصورت چہرے والے، خوبصورت لباس والے، کاروں اور موٹروں میں گھومنے والے دراصل انسان نہ تھے، انسان کے خریدار تھے۔ انسانیت کو فروخت کر کے انسانی عظمت کو نیلام کر کے یہ کاریں اور یہ عورتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انورادھا میں آنے والے اکثر لوگ کالے بازار کے جنم داتا تھے۔ بلیک مارکیٹ کے پیرو کار تھے۔ سلونی ایک ایک کو پہچانتی تھی، ایک ایک سے واقف تھی۔

وہ جانتی تھی کہ سیٹھ ٹنڈن جو ہر شام ایک نئی لڑکی کو لے کر انورادھا آجاتا ہے، دن میں نقلی دوائیاں بنواتا ہے اور یہ دوائیاں بازار میں فروخت کرتا ہے۔ وہ سینکڑوں انسانوں کی موت کا ذمہ دار ہے۔ احمد الدین فقیر والا شراب کا دھندہ کرتا ہے۔ اس کے پاس شراب کی درجنوں بھٹیاں ہیں جہاں ہر روز دیسی شراب کی سینکڑوں بوتلیں تیار ہوتی ہیں اور خود شام کو انورادھا آکر کافی پیتا ہے۔ امن گھوش کو بھی وہ اچھی طرح سے جانتی تھی۔ درجنوں لڑکیاں فلموں میں کام کرنے کا خواب لے کر اپنے اپنے گھروں سے بھاگ آتی ہیں۔ اس کے ایجنٹ ہیں جو ممبئی میں

ہر جگہ موجود ہیں۔ پھر فلم زدہ لڑکیاں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک پہنچ جاتی ہیں اور فلموں میں کام کرنے کا خواب بس خواب ہی رہ جاتا ہے۔ وہ اس لیڈر سے بھی واقف تھی جو دن میں بیواؤں کے لئے کام کرتا ہے اور رات کو کسی نہ کسی بیوہ کے ساتھ انورادھا کے ایک کمرے میں گم ہو جاتا ہے۔

سلونی کو اب اس ماحول، اس سوسائٹی اور اس زندگی سے نفرت ہو چکی تھی۔ وہ یہ سب کچھ چھوڑنا چاہتی تھی لیکن ایک منوہر کے لئے مجبور تھی کیونکہ ابھی اس کے پاس کائی کام نہ تھا۔ منوہر اس کی زندگی میں ایک بھونرے کی طرح آیا جس کی آمد سے پھول کی تنہائی مٹ گئی تھی۔

پھول اب تنہا نہ تھا۔

منوہر ایک گیت کار تھا اور ممبئی ایک فلم میں گیت لکھنے کے لئے آیا تھا۔ وہ فلم اس کا کوئی دوست بنا رہا تھا۔ دوست نے دوستی کا حق ادا کرنا چاہا اور منوہر کو ممبئی بلایا۔ منوہر نے گیت لکھے، فلم بنی ریلیز ہوئی مگر بُری طرح پٹ گئی۔ منوہر بیکار ہو گیا۔ دوست کے پاس جو سرمایہ تھا وہ فلم کی نذر ہو گیا۔ وہ اپنے دیس لوٹ آیا۔ منوہر چالاک تھا۔ اس نے کم ہی عرصہ میں فلمی دنیا کی نبض پہچان لی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ اس شام انورادھا میں ایک پارٹی تھی۔

منوہر بھی تھا۔

آرا کسٹر کی دھنیں فضا میں بکھر گئیں۔ سپید چکنے فرش پر سلونی کے پاؤں تھرکنے لگے۔ اس کے بازوؤں کی محرابیں مچلنے لگیں اور آخر میں کسی نے منوہر سے گیت سنانے کی فرمائش کی۔ اس نے ایک درد بھرا گیت چھیڑا......

میں تنہا تنہا جیتا تھا

میں تنہا تنہا مرتا تھا

گیت کا ایک ایک بول سلونی کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا۔ گیت ختم ہوا۔ سلونی نے بھی کسی گیت کی فرمائش کی۔ منوہر نے فرمائش پوری کی اور اس کے بعد فرمائش پر فرمائش ہوئی۔

جب پارٹی ختم ہوئی اور منوہر چلا گیا تو سلونی کو محسوس ہوا کہ اس کے دل پر ایک پھول

اُگ آیا ہے جس کا نام محبت ہے......؟!

منوہر وہاں روز آنے لگا۔ اس کے من میں بھی شاید ایسا ہی پھول اُگ آیا تھا جو اسے اپنی خوشبو بکھیرنے کیلئے انورادھا ہوٹل لے آیا۔ پہلے شعروشاعری ہوتی پھر کافی کا دور چلتا اور پھر پھر اس پھول کی باتیں شروع ہو جاتیں جس کا نام محبت ہے......!

منوہر اور سلونی نے ممبئی سے باہر چند دن گزارنے کا فیصلہ کرلیا اور وہ دونوں لوناوالا چلے گئے......منوہر کو پاکر سلونی اپنے آپ کو بھول گئی۔

''سلونی، سوچتا ہوں آخر کب تک تمہارے سہارے جیوں گا'' وہ اکثر کہتا۔ سلونی بات کا رخ پھیر دیتی اور کہتی۔

''تمہیں یہ موسم کیسا لگ رہا ہے...... بارش نے موسم میں جو شوخی پیدا کی ہے اس پر قربان ہونے کو جی کرتا ہے۔ من کرتا ہے کہ اس بارش میں، بادلوں کی گرج میں، آندھی کے شور میں گھومتی پھرتی رہوں۔''

''سردی...... جب بارش کی ننھی ننھی بوندیں بادلوں کی گرج میں رقص کرتی ہیں تو میرا من جھوم جھوم اُٹھتا ہے......''

لمحے بھیگتے رہے، وقت بہتا رہا......اور ایک رات ......وہ رات بڑی بھیانک تھی۔ سلونی کا جسم منوہر کی بانہوں میں لرز رہا تھا......اور پھر رات بھیانک سے بھیانک تر ہوتی گئی اور اس بھیانک رات میں سلونی نے اپنے آپ کو لٹا دیا۔ اس خیال کے سہارے کہ منوہر اس کا ہے اور وہ منوہر کی ہے۔ اس رات سلونی نے ایک سپنا دیکھا کہ اس نے ایک خوبصورت سا، سندر سرخ جوڑا پہن رکھا ہے۔ بابل کے گیت گائے جا رہے ہیں، ڈھولک بج رہی ہے اور اس کی ممی اس کے ہاتھوں میں مہندی رچا رہی ہے اور......!!

''ممی''

منوہر جاگ گیا۔ ''کیا بات ہے سلونی''

سلونی نے منوہر کو اپنی بات سنا دی اور کہا...... منوہر تم مجھے دھوکہ تو نہ دو گے...... مجھے

چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو سلونی...... تمہیں دھوکہ دوں......

تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں...... یہ خیال تمہارے ذہن میں آیا کیسے؟''

سلونی اپنا سر منوہر کے سینے پر رکھ کر سو گئی!

دوسرے دن وہ ممبئی آئے۔ اب منوہر سلونی کے فلیٹ میں ہی رہنے لگا...... گیت اور گیت کار ایک ہو گئے......!!

ایک دن منوہر مسکراتا ہوا آیا اور سلونی سے کہنے لگا......'' ایک نئی فلم میں گیت لکھ رہا ہوں...... آج ہی کنٹریک سائن کیا ہے اور سائنگ اماونٹ بھی لیا ہے......''

سلونی کو جیسے اسی بات کا انتظار تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آئے'' ارے تم رو رہی ہو'' منوہر نے اُسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا'' یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ منوہر میں آج بہت خوش ہوں۔ میں اس دنیا کو چھوڑ کر ایک نئی دنیا بسانا چاہتی ہوں جس میں صرف تم ہو تمہارا پیار ہو۔ ان نقلی چہروں، اس مصنوعی زندگی سے نفرت ہو چکی ہے۔ ''لیکن تمہارا فن...... تمہارا رقص کرنے کا وہ جذبہ۔''

''وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا...... میں رقص کروں گی ناچوں گی، گاؤں گی لیکن تمہارے سامنے اور اپنے گھر میں...... کسی ہوٹل کے سپید فرش پر نہیں۔ منوہر نے اس کی بات کاٹ دی......'' پرڈیوسر کے یہاں جانا ہے۔''

''کہاں''

''سٹوڈیو...... تم بھی میرے ساتھ چل رہی ہو......''

''لیکن...... میں......''

''تمہیں آنا ہی ہوگا سلونی...... میرے ساتھ، میرے لئے......''

منوہر سلونی کو سٹوڈیو لے گیا۔ اس نے اپنے آنے کی اطلاع پرڈیوسر کو بھجوا دی۔ وہ فوراً اندر بلایا گیا۔ سلونی نے اندر جانے سے انکار کیا۔ وہ باہر ہی اس کا انتظار کرنے لگی۔

چند لمحوں کے بعد اس نے سنا۔ اندر منوہر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

''آیئے''

''ہاں''

''کنٹریکٹ پر دستخط ہوئے''

جی ہاں...... شکریہ''

''تم چاہو تو ایڈوانس بھی لے سکتے ہو''

''بہت اچھا''

اور وہ لڑکی''

''لیکن صاحب''

''میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ وہ لڑکی مجھے پسند ہے۔''

''لیکن وہ میری......''

پرڈیوسر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''تمہاری دوست ہے، محبوبہ ہے یہی کہنا چاہتے ہو...... میری بات سنو...... زندگی میں کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو دولت، شہرت، عزت...... تو یہ دوستی اور محبوبانہ انداز ترک کردو...... تم نے نیا نیا قدم رکھا ہے اس دنیا میں...... تمہیں کچھ حاصل کرنے کے لئے ایک سہارے کی ضرورت ہے...... وہ سہارا تمہارے پاس ہے...... اس لڑکی کے روپ میں......''

''آپ نہیں جانتے، وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے''

''میں سب کچھ نہیں جانتا اور نہ جاننا چاہتا ہوں۔ تم کام چاہتے ہو، شہرت اور پیسہ چاہتے ہو تو اس لڑکی کے ساتھ میری کوٹھی میں آجاؤ، آج شام''۔

منوہر خاموش رہا۔''

''ہاں یا نا......؟''

پھر وہی خاموشی چھائی رہی جیسے منوہر کسی عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہو۔

''جواب دو''

''ٹھیک ہے''

''منیجر سے مل کر ایڈوانس لے لو...... میں نے اسے کہہ دیا ہے۔''

سلونی باہر سب کچھ سن رہی تھی...... منوہر کے دل پر اُگنے والے پھول مصنوعی تھے۔ وہ پھول بھی مصنوعی تھا خوشبو کہاں سے آتی۔ تقدس کا ملمع اُتر چکا تھا۔ چند سکوں کے لئے منوہر اپنی زندگی اپنی محبت اور اپنے گیتوں کو فروخت کرنے پر تیار ہو گیا تھا...... منوہر جب کمرے سے باہر آیا تو سلونی جا چکی تھی۔

گھر کے باہر اس کو ہوٹل لے جانے کیلئے ڈرائیور آچکا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہہ دیا کہ اس کی صحت ٹھیک نہیں۔ اسلئے وہ آج کے پروگرام میں حصہ نہ لے سکے گی!

روتے روتے جانے وہ کب سوگئی۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی کیونکہ کھنہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''مس سلونی، مجھے خود ہی آنا پڑا۔ کیسی طبیعت ہے اب۔ آج ہوٹل میں ایک بڑی پارٹی ہے تم کو آنا پڑے گا۔ چند لمحوں کے لئے ہی سہی...... میرے لئے مس سلونی، پلیز......''

''لیکن میری طبیعت......''

''میری عزت کا سوال ہے......''

آخر مجبور ہو کر سلونی کو جانا پڑا!

ایک مختصر سا رقص ہوا۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اچانک سلونی مائیک کے سامنے آئی...... اس نے منوہر کا گیت چھیڑا۔

میں تنہا تنہا جیتا تھا میں تنہا تنہا مرتا تھا

یہ ایک نئی بات تھی آج پہلی بار سلونی نے مائیک کے سامنے آکر ایک گیت گایا تھا۔ اس کی سریلی آواز نے سارے ماحول کو، ساری فضا کو مسحور کر دیا۔ گیت گاتے گاتے وہ بے تحاشا رونے لگی اور دوسرے ہی لمحے فرش پر گر گئی!

ایک کہرام سا مچ گیا۔

سلونی کو کمرے میں لے جایا گیا۔ڈاکٹر آیا۔اس نے سلونی کا بغور معائنہ کیا اور کہا کہ یہ ماں بننے والی ہے۔''

کھنہ بے ساختہ چیخ اُٹھا......سلونی مجھے معاف کردو...... مجھے معاف کردو'' ڈاکٹر نے کھنہ کی طرف دیکھا اور کہا۔''تو یہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہے'' کھنہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں......''نہیں ڈاکٹر'' ایسی کوئی بات نہیں ہے'' مگر ابھی تو آپ''

کھنہ نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا......

''دراصل آج سلونی کی طبیعت ناساز تھی۔ ہوٹل میں ایک بڑی پارٹی تھی اس لئے سلونی کو میں مجبور کر کے یہاں لے آیا۔ڈاکٹر نے اپنی بات دہرائی ''دیکھئے، یہ لڑکی ماں بننے والی ہے۔میرا خیال ہے کہ فی الحال یہ رقص نہ کر سکے گی۔اگر آپ اسے مجبور کریں گے تو......فی الحال تو میں اس کے ہسبنڈ سے ملنا چاہوں گا۔''

''دیکھئے ڈاکٹر...... مجھے سلونی اور منوہر کے تعلقات کی کوئی جانکاری نہیں۔ ہاں میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ دونوں ایک ہی فلیٹ میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ دوست ہیں یا میاں بیوی، میں نہیں جانتا......''

''ٹھیک ہے'' ڈاکٹر نے کہا'' میں نے انجکشن دیا ہے۔ یہ دوائی آپ بازار سے منگوا لیجئے۔ ہاں انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے ذہن کو کوئی صدمہ پہنچا ہے۔ وہ ذہنی طور پر پریشان رہی ہوں گی جس کی وجہ سے وہ فرش پر گر گئیں'' اور یہ کہہ کر ڈاکٹر چلا گیا۔

ادھر پرڈیوسر کے کمرے سے جب منوہر آیا تو سلونی کو نہ دیکھ کر کچھ حیران سا ہوا۔ ''گھر چلی گئی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ سٹوڈیو سے باہر نکل آیا۔راستے میں وہ سلونی کے بارے میں سوچتا رہا......''کیا وہ سلونی کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے......نہیں، شاید نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم شادی کے بندھن میں بندھ گئے ہوتے اور اگر میں واقعی سلونی سے محبت کرتا تو میں نے

پرڈیوسر کی بات سننے سے پہلے ہی اس کا سر پھوڑ دیا ہوتا...... میں تو ممبئی آیا ہوں نام اور شہرت حاصل کرنے کیلئے، روپیہ کمانے کیلئے...... سلونی...... یہ سلونی نہ ہی کوئی اور سلونی مل جائے گی لیکن آج شام سلونی کا میرے ساتھ پرڈیوسر کی کوٹھی پر جانا...... وہ تو اہم ہے......"

سلونی گھر میں نہ تھی۔ منوہر نے سوچا ہوٹل میں ہوگی۔ سلونی کا انتظار کرتے کرتے وہ سو گیا...... رات کو منوہر نے کروٹ بدلی تو سلونی کا بستر خالی پایا۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا، رات کے دس بج چکے تھے وہ کچھ گھبرا سا گیا...... پو پھٹ گئی سورج نکلا لیکن سلونی نہیں آئی۔ اس نے انورادھا ہوٹل فون کیا......

"میں منوہر بول رہا ہوں"

"منیجر کی آواز سنائی دی......" منوہر صاحب، آپ اب تک کہاں تھے۔ ہم تو کل شام سے آپ کو تلاش کر رہے ہیں...... سلونی......"

"کیا ہوا سلونی کو۔"

"سلونی کل اچانک گاتے گاتے بے ہوش ہوگئی۔ ڈاکٹر نے معائینہ کیا دوائی دی لیکن رات کو اس کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی اور کھنہ صاحب نے انہیں نرسنگ ہوم میں ایڈمٹ کروالیا......"

"ایک اور بات...... ان کا abortion ہوگیا۔ وہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی تھی...... آپ کے خلاف FIR درج کیا گیا ہے......"

منوہر کے پاؤں سے جیسے زمین سرک گئی......!

"اب کیا ہوگا؟"

گھبراتے ہوئے قدموں سے منوہر نرسنگ ہوم جا پہنچا۔ آہستہ سے سلونی کے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا...... سلونی نے منوہر کو دیکھا تو کمبل سے اپنے سارا جسم چھپا لیا...... منوہر کو ایک بار پھر زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی!

"سلونی" اس نے آہستہ سے کہا

سلونی خاموش رہی۔

''میری جان، سلونی''منوہر کی آواز ابھری

''منوہر تم''سلونی نے کمبل کو اپنے چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا''منوہر، تم چلے جاؤ یہاں سے...... دور ہو جاؤ میری نظروں سے...... میں نے سب کو کہہ دیا ہے کہ منوہر صرف میرا دوست ہے...... بچہ...... بچہ تمہارا نہیں تھا۔''

منوہر نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔

''مگر سلونی''

''تمہارا کوئی قصور نہیں''وہ رونے لگی اور روتے روتے کہا''ہاں تمہارا کوئی قصور نہیں، قصور صرف میرا ہے۔ میں نے تم سے محبت کی تم پر اپنی زندگی لٹا دی۔ تمہیں سکون دیا گھر دیا...... ہر سہولیت دی اور تم...... تم تو صرف چوری کرنا جانتے ہو ڈاکہ ڈالنا جانتے ہو لیکن چور یا ڈاکو کا بھی ایمان ہوتا ہے۔ ایک منزل ہوتی ہے تمہارا کوئی ایمان نہیں۔ کوئی منزل نہیں۔ تم تو ایک چور ایک ڈاکو سے بھی بدتر ہو...... خود تو مجھے لوٹ لیا اور اب میر سودا کرنا چاہتے ہو......''

''سلونی، تم یہ سب کیا کہہ رہی ہو۔ ہاں شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے...... پھر بھی......''

''پھر بھی کیا''

''اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی تو مجھے معاف کردو''

''تمہیں معاف کردوں...... ایک بردہ فروش کو...... عورتوں کے بیوپاری کو...... تمہیں شاید کسی ماں نے جنم نہیں دیا ہے...... تمہارے گھر میں شاید کوئی بہن نہیں ہے...... اس لئے عورت کی عزت کرنا تم نے سیکھا ہی نہیں ہے...... تم ذلیل ہو...... جاؤ......''

منوہر کمرے سے باہر چلا آیا......!!!

رات کو کھنہ اور ڈاکٹر ایک ساتھ سلونی کو دیکھنے نرسنگ ہوم آگئے۔

''کیا حال ہے''ڈاکٹر نے پوچھا

''جی رہی ہوں''سلونی نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تم تو زندگی سے بے زار نظر آ رہی ہو...... ادھر کھنہ صاحب ابھی تک پولیس سٹیشن میں تھے......''

''مگر کیوں......''

''ڈاکٹر رہنے دیجیے۔ پولیس سٹیشن جانا تو ہم ہوٹل والوں کا معمول ہے...... یہ بتایئے سلونی کو کب تک یہاں رہنا پڑے گا۔''

''یہ تو سلونی پر depend کرتا ہے۔ اگر اس رات میرے جانے کے بعد سلونی بیڈ سے اترنے کی کوشش نہ کرتی......تو......آپ کہہ رہے تھے کہ یہ ہوش میں آتے ہی بھاگنے لگی۔'' سلونی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپالیا۔

''OK......جو کچھ ہونا تھا۔ ہو چکا ہے......لیکن شاید رقص نہ کر سکے گی۔''

''مگر ڈاکٹر''

''دیکھئے یہ میرا ذاتی خیال ہے۔ ابھی کچھ دن اور یہاں رہنے کے بعد اور کچھ X-rays لینے کے بعد اصلیت کا پتہ چلا جائے گا......''

ڈاکٹر پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

''آپ پولیس سٹیشن کیوں گئے تھے''

''یونہی''

''پھر بھی''

''تم نے منوہر کو صاف بچالیا لیکن اس کے نتیجے میں تم پر illegal abortion کا کیس بنا۔''

''پھر''

''میں نے وہ کیس Close کروالیا......''

''آپ نے ایسا کیوں کیا......''

''اپنے مطلب کے لئے......تا کہ تم پھر سے میرے ہوٹل میں رقص کر سکو گی، گا سکو

گی، ناچ سکو گی۔''

''میں رقص کر بھی سکوں گی کہ نہیں یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ آپ نے شاید ڈاکٹر کی بات غور سے نہیں سنی۔''

''سن بھی چکا ہوں اور جانتا ہوں......''

''لیکن پولیس سٹیشن......کیس

''تم خوامخواہ گھبرا رہی ہو...... پیسہ کام آتا ہے، ہر جگہ ہر وقت......اور پھر سلونی...... میں کوئی دیوتا نہیں......میں بہت برا آدمی ہوں......ہاں سلونی......''

سلونی کے کان کھڑے ہوگئے۔ ایک دبے دبے ڈر نے سر اُبھارنا شروع کیا......کہیں کھنہ منوہر کا دوسرا روپ تو نہیں......''

''سنو سلونی......تم منوہر کے بچے کی ماں بننے والی تھی لیکن تم نے اُسے صاف بچالیا۔ تم میرے ہوٹل میں کام کرتی ہو...... پولیس کو منوہر میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو ان کے لئے ایک چھوٹی سی مچھلی تھی......نہ پیسہ نہ روپیہ، نہ گھر نہ ٹھکانہ...... پولیس کو ضرورت تھی ایک بڑی مچھلی کی......اور وہ مچھلی انہیں میری صورت میں نظر آئی...... پولیس کو خاموش کرانا میں بخوبی جانتا ہوں......''

''اور ڈاکٹر''

''وہ اپنا دوست ہے نرسنگ ہوم کے ریکارڈ میں معدے کی بیماری دکھائی گئی۔''

''لیکن آپ نے یہ سب کیوں کیا......کس لئے کیا''

''تمہیں پانے کے لئے، سلونی......''

یہ کہتے ہوئے کھنہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

کئی دن ایسے ہی بیت گئے لیکن اس دوران سلونی کو بتایا گیا کہ منوہر اس کے فلیٹ سے اپنا مختصر سا سامان لے کر کہیں اور چلا گیا ہے......فلم میں گیت لکھنے کا جو وہ کنٹریکٹ سائن کر چکا تھا وہ پروڈیوسر نے کنسل کر دیا ہے اور اُسے فلم سے باہر کر دیا گیا ہے......اور سب سے اہم خبر سلونی کے لئے یہ تھی کہ وہ رقص نہ کر سکے گی کیونکہ فرش پر گرنے سے اس کی ٹانگ کی ہڈی میں

نقص پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اس ٹانگ میں Constant Pump رہے گا......''

نرسنگ ہوم میں اس کا آخری دِن تھا۔ کھنہ اسے لینے آیا تھا۔

''سلونی اب تم رقص نہ کرسکوگی۔ ہوٹل انورادھا کے چکنے فرش پر کبھی تھرک نہ سکوگی تم نے اپنے بارے میں کیا کچھ سوچا ہے......میری تجویز......میرا مطلب ہے کہ چند روز قبل میں نے......! کھنہ یہ کہتے کہتے رُک گیا......

''اچھا، میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔ شاید تمہیں اس کہانی میں کوئی دلچسپی نظر نہ آئے پھر بھی......شاید تم سوچ رہی ہو ہر مرد بے وفا ہوتا ہے، بُرا ہوتا ہے کسی حد تک یہ درست بھی ہوسکتا ہے......یہ میری کہانی ہے سلونی......میں پچیس سال کی عمر میں ممبئی آ گیا۔ پیسہ میرے پاس تھا۔ پہلے ایک چھوٹی سی دکان سنبھالی ٹی سٹال، چھوٹے موٹے کام کیئے، کالے بازار والوں کا ساتھ دیا......میرے پاس پیسہ آ گیا......آہستہ آہستہ ترقی کرتا گیا اور ہوٹل بزنس میں ہاتھ ڈالا ......آج میں انورادھا ہوٹل کا مالک ہوں......!

''آپ اپنی کہانی مجھے کیوں سنانا چاہتے ہیں''

''صرف اس لئے کہ ہم دونوں کے جاننے والے یہ سمجھتے ہیں

کہ ہم دونوں کا......''

''لیکن یہ تو غلط......''سلونی نے بات کاٹتے ہوئے کہا'' ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ غلط ہے......لیکن شاید یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں شادی شدہ ہوں......میرا ایک بیٹا بھی ہے......تم مجھے بولنے دو سلونی......انورادھا سے مجھے بے حد پیار تھا......''

''انورادھا؟......کون انورادھا؟''

''میری بیوی کا نام انورادھا تھا''

''تھا......کیا مطلب''

''وہ اب اس دنیا میں نہیں......وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی......لیکن وہ بچے کو جنم دے کر اپنے آپ کو بچا نہ سکی......وہ مرگئی۔ آپریشن ٹیبل پر ہی مرگئی۔''

اور آپ کا بچہ......''

''میرا بیٹا صحیح سلامت ہے اور وہ ڈون سکول میں پڑھ رہا ہے اور میں یہاں ممبئی میں ہوٹل انورادھا میں جی تو رہا ہوں مگر بے مقصد، بے معنی......!

''وہ بن ماں کا بیٹا ہے...... اسی لئے تو چاہتا ہوں کہ تم میری انورادھا کا روپ بنالو......میرے بیٹے کی ماں بن کر......سلونی ہاں کہو......ہاں......''

سلونی نے آہستہ سے کہا۔

''آپ کی زندگی کی کہانی پُر درد ہے۔ آپ کے سینے کا گھاؤ گہرا ہے۔ آپ نے مجھ پر بہت احسانات کئے ہیں، مہربانیاں کی ہیں۔ میں نے آپ کے جس روپ کے بارے میں سوچا تھا وہ روپ میری آنکھوں کا دھوکہ تھا اور اب جو میں آپ کو دیکھ رہی ہوں، آپ کے بارے میں سوچ رہی ہوں، جاننے لگی ہوں تو آپ مجھے ایک دیوتا نظر آتے ہیں......آپ کو دیکھ کر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ایک بار پھر رحمان دادا میری زندگی میں آیا ہے......آپ عزت کے قابل ہیں کھنہ جی......''

''مگر سلونی''

''میں نے کہا کہ آپ دیوتا ہیں، فرشتہ ہیں...... میں آپ کی بڑی عزت کرتی ہوں مگر آپ سے شادی نہیں کرسکتی......اور شادی تو میں اب عمر بھر نہیں کروں گی۔ عورت زندگی میں ایک بار محبت کرتی ہے۔ ایک ہی بار پیار کے ساگر میں ڈوب جاتی ہے۔ میں نے منوہر کو بے تحاشا چاہا......لیکن اس میں محبت کا کیا دوش......محبت ایک جذبہ ہے، ایک خوبصورت ملاپ ہے، ایک مقدس رشتہ ہے......''

''مگر منوہر تو......''

''ہاں میں جانتی ہوں کہ اب وہ میری زندگی میں دوبارہ نہیں آئے گا۔ میں آنے بھی نہ دوں گی۔ وہ میرے لئے اور میں اُس کے لئے مر چکی ہوں لیکن محبت تو نہیں مرتی، محبت تو امر ہے......''

''نہیں میں اپنے وطن لوٹ جاؤں گی جس مٹی نے مجھے جنم دیا وہ مٹی بلا رہی ہے۔ جن گلیوں میں میرا بچپن گزرا ہے ان گلیوں کو میرے پاؤں کی آہٹ کا انتظار ہے۔ وہ میری اپنی مٹی ہے۔ وہ مجھے گھر سے بے گھر ہوتے نہیں دیکھ سکتی......!''

............●●●............

ادبی مذاکرہ

اُردو افسانہ...... منظر و پس منظر

شرکاء گفتگو

احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد ، آغا سہیل، جیلانی کامران، انور سدید، انور سجاد
خواجہ محمد زکریا، انیس ناگی، میمونہ انصاری، سہیل احمد خان، عذرا اصغر، سلمان بٹ
اصغر مہدی، اظہر جاوید، ، اصغر ندیم سیّد، ضیاء ساجد

اصغر ندیم:۔ قاسمی صاحب آپ سے ایک سوال کی اجازت چاہوں گا کہ ترقی پسند تحریک نے بلاشبہ افسانے میں سماجی تضادات اور انسانی الجھنوں کی مختلف جہتوں کو حقیقت پسندی سے پیش کیا، اس کے باوجود ترقی پسند افسانہ نگاروں پر بے شمار اعتراضات ہوئے۔ ان کی نوعیت کیا تھی اور اس میں کتنی حقیقت تھی؟

انیس ناگی:۔ آپ نے افسانے کا جو سٹرکچر قائم کیا ہے۔ اس میں بعض باتیں متنازعہ فیہ ہیں۔

اصغر ندیم:۔ یہ ابتدائیہ بحث کی بنیاد نہیں ہے۔ آپ اُس سے اختلاف کر سکتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی:۔ آپ نے مضمون میں جو ارشاد کیا ہے۔ ضروری نہیں سب کو اتفاق ہو۔ آپ کی ایک ایک سطر پر بلیغ بحث ہو سکتی ہے۔ اگر یہ تھیس ہے تو اس سے اختلاف تو ہوگا۔ مجھے ذرا جلدی جانا ہے۔ اس لئے مختصراً آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ ترقی پسند افسانے پر الزامات کی طرف جو اشارہ آپ نے کیا ہے تو بات یوں کہ الزام کس پر عائد نہیں ہوتے۔ منٹو پر بھی الزام لگا کہ وہ ایک فارمولے کے تحت افسانہ لکھتا ہے۔ اس کے خاص قسم کے کردار ہیں۔ انہی پر لکھتا ہے۔ جدید افسانہ نگار انور سجاد پر بھی الزام ہے کہ چاہے وہ افسانہ لکھے یا ناول قاری کو اس کا مفہوم

پانے میں کاوش کرنی پڑتی ہے۔ ترقی پسندوں پر جو یہ الزام ہے کہ وہ خارجیت پر زور دیتے تھے۔ اور داخلیت پر کم، تو میرا خیال ہے یہ درست نہیں ہے۔ افسانہ چاہے بیدی کا ہو یا کرشن چندر کا یا عصمت چغتائی کا یا دوسرے سینئر افسانہ نگاروں کا، ان کا کردار تو اُس وقت تک کردار بن ہی نہیں سکتا۔ جب تک اُس کے داخل یا نفسیات کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ ترقی پسند افسانہ نگار اس سلسلے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد کے افسانہ نگاروں نے صرف نفسیات کو اپنا موضوع بنایا اور خارج یا باہر کی دُنیا کی نفی کی یا اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ ان سے کہا بھی گیا کہ جو کچھ آپ کے اندر ہے وہ باہر ہی کا عکس ہے۔

اظہر جاوید:۔ اگر کسی کو ندیم صاحب سے کچھ استفسار کرنا ہو تو۔ انور سجاد صاحب آپ کا تو حوالہ بھی آیا ہے۔ آپ کچھ پوچھیں گے؟

احمد ندیم قاسمی:۔ ان کا حوالہ تو آئے گا۔

انور سجاد:۔ میں ایک بات سمجھنا چاہتا ہوں۔ جس وقت ہم ترقی پسند تحریک کا ذکر کرتے ہیں۔ اس وقت ہمارے ذہن میں کون کون سے افسانہ نویس ہوتے ہیں۔ اس میں بھی تو معیار کا فرق آ جاتا ہے۔ بعض بلند پایہ ادیب تھے۔ بعض بہت گھٹیا اور جذباتی......

احمد ندیم قاسمی:۔ میرا خیال ہے، ہم بلند پایہ افسانہ نگاروں سے متعلق بات کر رہے ہیں۔

انور سجاد:۔ جذباتیت اور سطحیت کا تاثر گھٹیا درجے کے ادیبوں نے دیا۔ ورنہ بنیادی ترقی پسند افسانہ نگاروں کو دیکھیں تو ان کے ہاں زندگی کو بڑی گہرائی سے دیکھا گیا ہے۔

اصغر ندیم:۔ ترقی پسند افسانے نے جو سفر کیا ہے اس میں ایسی کچھ خامیاں جو اس وقت محسوس نہ ہوتی تھیں آج آپ کو محسوس ہوتی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی:۔ میں تو اپنے نقطۂ نظر سے نہ تائب ہوا ہوں نہ مستعفی۔ میں ان خامیوں کی طرف اس انداز سے نشاندہی ہی نہیں کر سکتا۔ جس طرح آپ نے کیا ہے۔ ہم مسلّمہ طور پر اچھے افسانہ نگاروں کے متعلق بات کرنے آئے ہیں۔ ورنہ گھٹیا افسانہ نگاروں کی تو کھیپ کی کھیپ آج بھی موجود ہے۔

جیلانی کامران:۔ میری گزارش یہ ہے کہ ترقی پسند افسانے کی قدر و قیمت متعین کرنا مسئلہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ افسانہ ہماری ادبی سرگزشت میں شامل ہو چکا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ترقی پسند افسانے نے زندگی کو کیا مفہوم دیا۔ زندگی کے لئے کون سی ورلڈ پکچر دکھائی۔ وہ ترقی پسند افسانے سے پہلے کی دُنیا سے مختلف تھی۔ اس لئے نئے افسانہ نگار اور نئے رجحانات پیدا ہوئے۔ اب وہ ہماری تاریخ کا حصّہ ہے۔ اب ہم جس راستے پر جارہے ہیں یہ زندگی کے ان معانی سے مختلف ہے۔ جو ترقی پسند افسانے میں اُبھرتے ہیں کیونکہ کہانی کا براہِ راست تعلق زندگی کے ساتھ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس لئے ہمیں افسانہ نگاروں کو اچھا یا برا ثابت نہیں کرتا۔

اصغر ندیم:۔ ترقی پسند افسانے کی فکری سطح کیا تھی؟ قاسمی صاحب آپ کیا سمجھتے ہیں؟

احمد ندیم قاسمی:۔ فکری سطح حقیقت پسندی تھی۔ تمثیل بھی اس میں آجاتی تھی اور علامت بھی۔ جو کردار اس افسانے میں استعمال ہوتے تھے ان کی حیثیت علامتی ہوتی تھی کہ ایک فرد معاشرے کے بہت بڑے حصے کی ترجمانی کرتا تھا۔

ایک اہم بات جو میں اس سلسلے میں کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ منٹو، بیدی اور کرشن چندر کے فوراً بعد جو کھیپ آتی ہے وہ بھی اسی قدر قد آور اور توانا ہے۔ یہ نسل اشفاق احمد کی ہے۔ ہاجرہ، خدیجہ، جیلانی بانو، ممتاز مفتی اور کئی نام اس میں آتے ہیں۔ آج جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ بڑے بڑے ناموں کو ہمارے راستے سے ہٹنا چاہیئے جبھی ہم قد آور ہو سکتے ہیں، تو انھیں جاننا چاہیئے کہ اشفاق احمد کی نسل کو بہت زیادہ مشکلات تھیں کہ ان سے پہلے جو افسانہ نگار تھے وہ معراج پر پہنچ چکے تھے۔ ان کی موجودگی میں لکھنا اور خود کو منوا لینا بڑی بات تھی۔ جہاں تک آج کے افسانے کا تعلق ہے۔ تجربے سے مجھے انکار نہیں ہے۔ لیکن تجربے کو اتنا الجھا دینا کہ افسانے کی روایت سے ہی ہٹ جائیں، یہ بات اچھی نہیں ہے۔

اصغر ندیم:۔ میمونہ صاحبہ آپ افسانے کے بدلتے ہوئے رجحانات پر تاریخی حوالے سے روشنی ڈالیں گی؟

میمونہ انصاری:۔ افسانے کا ارتقاء ہمیں یلدرم سے لے کر ندیم تک بڑی تیزی سے نظر آتا ہے۔

یوں دیکھئے کہ ایک دَور یلدرم کا تھا۔ اس کے بعد حجاب امتیاز علی تک ہمارے ہاں بڑے افسانہ نگار پیدا ہوئے۔ اس کی آپ حد بندی کر سکتے ہیں کہ یہ رومانیت کا دَور تھا۔ اس کے بعد ترقی پسند افسانہ آیا۔ حقیقت پسندی کا رجحان چیخوف اور موپساں کی تقلید میں آیا۔ بلکہ ہمارے ہاں بعض ایسے نام ہیں جوان کے مقابلے پر رکھے جاسکتے ہیں۔ اس کے بعد آزادی اور تقسیم کا تجربہ۔ اس کے اثرات سے ردِ عمل یہ ہے کہ صرف افسانے نے ہی ترقی نہیں کی، نئے موضوعات سامنے آئے۔ اس کے ساتھ نئے رجحان اور نئی تکنیک آئی۔ عبداللہ حسین، انتظار حسین اور انور سجاد تک یہ سفر ٹھیک رہا۔ اس کے بعد مجھے لگتا ہے کہ یہ ارتقاء کہیں آ کے رُک گیا ہے۔ وہ تیزی نہیں ہے۔ نہ تجربات میں نہ تکنیک میں۔

احمد ندیم قاسمی:۔ محترمہ نے جو کچھ فرمایا ہے اس سے مجھے بالکل اتفاق نہیں ہے۔ ارتقاء ہمارا بالکل نہیں رُکا۔ اگر انور سجاد کا افسانہ سمجھنے میں ہم سے کوتاہی ہو جاتی ہے یا ہم بے چین ہو جاتے ہیں کہ ہماری گرفت میں کیوں نہیں آرہا تو اس میں قصور انور سجاد کا نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم منٹو اور بیدی کے قاری ہیں۔ اور نہ ہی دوسرے جدید افسانہ نگاروں کا قصور ہے جو علامتی اور تجریدی افسانہ لکھ رہے ہیں اِکّا دُکّا ایسے ہیں جو کم درجے کے ہیں۔ جو نثری نظم کے انداز میں لکھتے ہیں۔ بلکہ نثری نظم بھی ان ہی کی پیدا کردہ ہے۔ کہانی کا عنصر اس میں نہیں ہوتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس میں پلاٹ ہونا چاہئے یہ ہونا چاہئے یا وہ ہونا چاہئے۔ لیکن کہانی کم درجہ کے افسانہ میں غائب ہوگئی۔ البتہ انور سجاد اور انتظار حسین کے ہاں کہانی موجود ہے۔ دو چار نام آپ نے بھی لئے تھے۔ ان میں محمد منشا یاد اور خالدہ حسین اہم ہیں۔

اصغر ندیم:۔ رئیلزم کے تابع جو افسانہ تھا وہ زندگی کا اسلوب بن گیا۔ افسانہ نگار چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، بات چیت کے انداز میں افسانہ بنا دیتے تھے۔ ایسا تجربہ آج کے افسانہ نگار کو کیوں نصیب نہیں ہے۔

انور سجاد:۔ یہ بہت ضروری سوال ہے۔

احمد ندیم قاسمی:۔ ہمارا سیاسی منظر یعنی ہم تاریخ میں ایسے مختلف ادوار سے گزرے ہیں کہ مختلف

زمانوں میں کھل کے بات کرنا ذرا مشکل رہا ہے۔ انگریز کے دَور میں ہم کھل کے بات کہتے رہے۔صرف طبقاتی فرق کی بات ہم نہیں کرتے تھے۔غلامی کے خلاف بھی بات کرتے تھے آج کا ادیب خوفزدہ ہے۔

جیلانی کامران:۔ جناب یہ تو کوئی جواز نہ ہوا کہ افسانہ نگار ڈر گیا ہے۔اس لئے افسانہ اس طرح نہیں لکھا جارہا۔

احمد ندیم قاسمی:۔ میں عرض کرر ہا تھا کہ اس ماحول کا اثر ہوتا ہے جس میں افسانہ نگار سانس لے رہا ہوتا ہے۔ جب افسانہ نگار کو معلوم ہو کہ بیدی، کرشن اور اشفاق کے اندر میں براہِ راست بات کرنے سے وہ مشکل میں گرفتار ہو جائے گا تو یہ اس کی بزدلی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنا مافی الضمیر لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اور ایسا طبقہ خود ہے جس تک یہ پہنچ جاتا ہے۔تو میرے نزدیک تجرید، علامت اور استعارے کی فارم اسی وجہ سے پیدا ہوئی۔

اصغر ندیم:۔ ڈاکٹر صاحب جیسا کہ قاسمی صاحب نے فرمایا ہمارا افسانہ سیاسی ماحول کی وجہ سے ایسا ہوا ہے تو میرا سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا افسانہ ایک ہی محور پر نہیں گھوم رہا۔ جبر، گھٹن وغیرہ۔کیا اس سے کچھ اور سچائیاں گم نہیں ہوگئیں جو اردگرد تھیں۔

انور سجاد: نہیں بالکل نہیں۔

انیس ناگی:۔ دیکھیے اس سوال سے پہلے میرا سوال ہے کہ پریم چند سے لے کر منٹو تک اُردو افسانے کا کیا سٹرکچر بنا۔ لسانی اسلوب کیا بنا؟ اگر ہم ترقی پسندوں کو نکال دیں تو اُردو افسانہ غائب ہو جاتا ہے۔قاسمی صاحب کی نسل اور ترقی پسندوں پر چیخوف کے اثرات تھے۔یا اگر منٹو کا آخری زمانہ دیکھیں تو وہ ۱۹۵۲ء میں ایسی باتیں کر رہے تھے جو انور سجاد اور اس کی نسل آج کر رہی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ منٹو صاحب کو بظاہر گروہ بندی میں ترقی پسندوں سے باہر کر دیا گیا لیکن ''ہتک'' اور ''نیا قانون'' دیکھ لیں۔اس میں جو رویّہ ہے وہ ترقی پسند ہے۔فرق یہ ہے کہ وہ مارکس کی باتوں کو نہیں مانتے۔ ۴۷ء تک کے سارے زمانے میں ترقی پسند چھائے ہوئے ہیں۔انھوں نے پرانے قصّے کہانیوں سے نجات دلائی۔ نیا اسلوب دیا۔انھوں نے کچھ باہر کے

اثرات لے کر اپنے عہد کے انسان کی شناخت کی۔ اس کے بعد دوسری نسل آتی ہے۔ نیم رومانوی اور نیم حقیقت پسند یعنی اشفاق صاحب کی نسل۔ اس کے بعد انور سجاد کی نسل۔ تو یہ ہوا میں تو پیدا نہیں ہوئے۔ پیچھے وہ ساری روایت موجود تھی۔ میں کہوں گا کہ منٹو یہ ساری نئی تکنیک استعمال کرتا تھا۔ وہ اینٹی سٹوری بھی لکھتا تھا۔ وہ مظہریاتی کام بھی کرتا تھا۔ داخلی رپورٹنگ کو باہر لے آتا تھا۔ زبان کا سٹرکچر بھی توڑتا تھا۔ امیجر بھی استعمال کرتا تھا۔ انور سجاد کی نسل کے جراثیم بہت پہلے سے موجود تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے کیا کیا؟

اظہر جاوید:۔ ہماری خواہش ہے کہ پہلے ندیم صاحب کو فارغ کر دیں۔ وہ بیمار ہیں اور بمشکل اس مذاکرے میں شرکت کر سکے ہیں۔

خواجہ زکریا:۔ قاسمی صاحب سے ایک سوال۔ اکثر اصطلاحات کا ہمارے ہاں گھپلا ہو جاتا ہے۔ ایک ہی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے میں کچھ اور مفہوم لیتا ہوں اور دوسرا کچھ اور۔ اب یہ ترقی پسندی کی اصطلاح کو آپ مارکسزم کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں یا وسیع تر معنوں میں۔

احمد ندیم قاسمی:۔ ترقی پسندی کو میں ہمیشہ وسیع تر معنوں میں استعمال کرتا ہوں۔ اسے مارکسزم میں محدود نہیں کرنے دیا گیا۔ ایسے لوگ تحریک میں تھے جو اسے مارکس کی تعلیمات کے تابع ہونے سے بچاتے رہے۔ اور جنھوں نے مارکسزم کے تابع لکھا تھا۔ ان کا نام ونشان نہیں ہے۔ اس لئے یہ خیال کہ ترقی پسند صرف مارکسزم کے پرچارک تھے، غلط ہے۔

انور سدید:۔ لیکن تنقید میں جو کتابیں نظریاتی حوالے سے لکھی گئی ہیں۔ ان میں بالعموم ان افسانوں کو اہمیت دی گئی ہے جو مارکسزم کے نقطۂ نظر کے تحت لکھی گئی ہیں چنانچہ برملا ممتاز شیریں نے یہ لکھا کہ ایک کہانی میں نظریہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ کہانی سے چپکا ہوا، چنگھاڑتا ہوا نظر آئے۔

احمد ندیم قاسمی:۔ جن میں ایسا ہوتا ہے وہ کہانیاں نہیں ہوتیں۔ کتابوں کا حوالہ دے کر بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جیتا جاگتا انسان آپ کے سامنے ہے، وہ عرض کر رہا ہے کہ ایسا نہیں ہے تو کتابوں کی طرف کیوں جاتے ہیں۔

انور سدید:۔ میں علی سردار جعفری کا حوالہ دوں گا۔

احمد ندیم قاسمی:۔علی سردار جعفری افسانہ نگار نہیں ہیں۔

انور سدید:۔اُس نے افسانہ بھی لکھا ہے۔

انور سجاد:۔اس تنازعہ کو اتنے ہی سال بیت گئے جتنا پہلے ممتاز شیریں نے یہ بات لکھی تھی۔تاریخ ادب سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ آغاز میں ترقی پسند تحریک کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا(cpi) سے منسلک تھی۔ چنانچہ اس نے جو جو اچھائیاں یا برائیاں کیں اس کا پرتو ان ادیبوں میں نظر آتا ہے۔ جو راہِ راست CPI کے زیرِ اثر تھے ان Dogmatists کے حوالے سے یہ خرابیاں تحریک میں داخل ہوئیں۔ یہ میں آپ کو Blatant حقیقت بتا رہا ہوں۔

انور سدید:۔ یہ تو آپ بہت بڑی حقیقت سے پردہ اُٹھا رہے ہیں۔

انور سجاد:۔ جی جی بالکل جو کچھ میں جانتا ہوں، اپنی ذمہ داری پر کہہ رہا ہوں۔

جیلانی کامران:۔ یہ تو تاریخی قسم کا بیان ہے۔

انور سجاد:۔ جی جو نتائج میں نے اخذ کئے عرض کر رہا ہوں۔ادیبوں میں بعض دفعہ بیدی صاحب تحریک کے اندر شامل ہو جاتے تھے۔یعنی ترقی پسند Dogmatists کبھی انھیں شامل کر لیتے تھے کبھی باہر نکال دیتے تھے۔یہی حشر منٹو صاحب کا ہوا۔ بیدی صاحب اور منٹو خاص طور پر ان Dogmatists کا شکار رہے ہیں۔ترقی پسندی کے عالمین جو خود کو مارکسٹ کہتے ہیں۔وہ سب سے بڑے انٹی مارکسٹ تھے۔اگر مارکسزم کی تفسیر آپ دیکھیں تو......میں اس لئے بات کر رہا ہوں کہ عام بحث چھڑ سکے۔ہم نے اپنے آپ کو منٹو اور ترقی پسند تحریک تک محدود کر دیا ہے۔ تاریخ کا اگر چہ یہ بہت بڑا Phasel ہے۔لیکن یہ سیاسی اثر کی بات کر رہا ہوں۔ عصمت چغتائی نے ہمیں یہ بات سنائی تھی کہ جس وقت سی پی آئی کے تحت ان کی میٹنگ منعقد ہوئی کہ اب ہندوستان میں انقلاب آنے والا اب ہتھیار اٹھا لینے چاہئیں تو کرشن چندر نے کہا تھا کہ مجھے کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیجئے۔

سہیل احمد:۔انور سجاد صاحب اس میں یہ اضافہ کر دیجئے کہ کرشن کی مراد تھی کہ اگر انقلاب آنے والا ہے تو مجھے اپنا فرض سنبھالنے یعنی لکھنے کے لئے کسی پر سکون ماحول میں ہونا چاہئے۔

انور سجاد:۔ یہ بات واضح کرتی ہے کہ تخلیقی فن کار کی عملی یا انفعالی شمولیت اس زمانے کی سی پی آئی کے زیر اثر تھی۔ جس میں زیادہ تر Dogmatists کام کر رہے تھے۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ ہم اس وقت کی سیاست کو، اس دور کے مسائل کو جب کہ وہ زمین Turmoil میں تھی الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ بات تو اظہر من الشّمس ہے کہ ترقی پسند افسانے نے کہانی کا ایک بالکل نیا انداز دیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے انسان کو معاشرے سے جوڑ دیا۔ مارکس اور لینن خود کہتے ہیں کہ وہ فن کارانہ تخلیق کو مقدم سمجھتے ہیں۔ اس حوالے سے کہ فارم اور Content میں توازن ہونا چاہئے۔ ایک مثال دوں گا کہ لینن جلاوطنی میں کشتی کی سیر کر رہا ہوتا ہے اور چاندنی کی تعریف کرتا ہے تو سوچتا ہے کہ گورکی کم بخت وہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ اس کو یہاں ہونا چاہئے۔

اظہر جاوید:۔ ندیم صاحب آپ کا انور سجاد صاحب کی گفتگو کے متعلق کیا تاثر ہے؟

احمد ندیم قاسمی:۔ مجھے ان سے پورا پورا اتفاق ہے۔

اصغر ندیم:۔ اشفاق صاحب آپ نے زندگی کو کہانی میں کئی کئی طریقوں سے لکھا ہے۔ کئی شکلوں میں تجربہ کیا ہے۔ ڈرامہ، ریڈیو اور کئی دوسری شکلوں میں لسانیاتی سطح پر بھی۔ آپ آج کی کہانی سے کس حد تک مطمئن ہیں۔

انیس ناگی:۔ آج کی کہانی سے کیا مراد ہے۔

اشفاق احمد:۔ ظاہر ہے جو آج لکھی جا رہی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں ادب کا طالب علم اِنسانوں سے متاثر ہو کر کم لکھتا تھا وہ کتابوں سے متاثر ہو کر لکھتا تھا۔ اس لئے افسانے کے سلسلے میں آپ کو شکایت پید ہوئی۔ ترقی پسند یا ہمارے ساتھ کے لوگ گورکی یا مائیکل شولوخوف کو پڑھ کر لکھتے تھے۔ اپنے تجربات سے نہیں گزرے تھے۔ وہ لوگوں سے نہیں کتابوں سے ملے تھے جو لوگوں کے بارے میں لکھی گئی تھی۔ اس سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنے ماحول کی کہانیاں بنالیں۔ مجھ سے سینئر جو ترقی پسند تھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے مزدور یا کلرک کے بارے میں سارا مواد رسالوں، پمفلٹوں اور کتابوں سے حاصل کیا تھا۔ اور اس کے اوپر بہت خوبصورت ہُنر

کے ساتھ کہانیاں پیش کیں۔ لیکن وہ صاحبِ حال نہیں تھے۔ انھوں نے اُوپر اُوپر سے دیکھا اسے محسوس نہیں کیا۔

انور سدید:۔ گستاخی معاف یہ بات مثالوں سے ذرا واضح کریں۔ مثلاً کون سی کہانیاں انسانوں کی بجائے کتابوں کو دیکھ کر لکھی گئی ہیں۔

اشفاق احمد:۔ میں ساری کہانیوں کو کہہ رہا ہوں۔ آپ کو اس لئے یہ بات بُری لگی ہے کہ آپ خود کتابی دُنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کو مشکل سے سمجھ آئے گی کہ انسان سے آپ کا تعلق بھی نہیں رہا۔ ترقی پسند تحریک کے کسی ادیب کا مزدور سے کوئی رشتہ نہیں تھا، پتہ چل جاتا ہے۔ مثلاً دوستووسکی کے زندگی کے جو جتن کئے ہیں وہ سب آپ کے سامنے ہیں۔ گورکی جس طرح بیان کرتا ہے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ اس کے ساتھ گزرا ہے۔ منشی پریم چند ایسا تھا جو دہقانوں میں رہتا تھا۔ اور ان سے واقف ہے۔ ہم لوگ بڑے پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ ہم نے علم کو کھنگالا ہے۔ اور اُس سے اچک کر کچھ چیزیں لے لی ہیں۔ ہم نے جو لکھا اس میں کردار ہمارے ساتھ تھے۔ ماحول اور سوچ بھی یہاں کی تھی، تکنیک کتابی تھی۔

جیلانی کامران:۔ دیکھئے صاحب ایک بات......

اشفاق احمد:۔ یہ بڑی تکلیف وہ بات ہے۔ آپ سب کو باری باری بولنا پڑے گا۔ (قہقہے) اس لئے کہ ایسی بات پہلے کسی نے نہیں کی۔ جن سے آپ متاثر ہیں۔ امریکہ یا فلسطین وغیرہ وہ سب تجربے سے گزرے ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی تجربے سے نہیں گزرا۔ ماسوائے ۴۷ء کے واقعے کے کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوا۔ اس واقعے سے متعلق کہانیاں واقعی بھاری ہوئی کہانیاں ہیں۔ مگر اب جو کہانیاں لکھی جارہی ہیں، علم و دانش کے زور پر لکھی جارہی ہیں۔ یہ کوئی خرابی کی بات نہیں ہے۔ جیسے کہتے ہیں ناں کر دِیے سے دیا جاتا ہے۔ بہت کم خال خال ایسی کہانی آپ کو نظر آئے گی جو انسان اور لکھنے والے کے ٹکراؤ سے پیدا ہوئی ہوگی۔ ورنہ سب علم کی کہانیاں ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ آپ کو اپنے محلے میں کوئی کالو تیلی یا نورا دُھنیا نظر آ گیا ہوگا۔ لیکن اس کے گرد جو ''گوات'' بنایا گیا ہے۔ ریشم کے کیڑے سے وہ علم کا گوات ہوتا ہے۔

میمونہ انصاری:۔لیکن اشفاق صاحب ترقی پسند افسانہ نگار......

اشفاق احمد:۔دیکھئے بی بی مجھے بات پوری کر لینے دیں۔ہم افسانے کا جائزہ لے رہے ہیں۔ کوئی لڑائی نہیں ہے آپ سے ہماری۔

میمونہ انصاری:۔آپ دیکھیں تو سہی وہ ترقی پسند......

اشفاق احمد:۔آپ مجھ سے زیادہ تو نہیں بول سکتیں بی بی۔ہم تو کام ہی بولنے کا کرتے ہیں۔ میرا تو پیشہ ہی یہی ہے۔اصل میں ہماری الجھن یہ ہے کہ یہ ہمارا 'حال' نہیں ہے۔جو دوستووسکی کا تھا یا امریکہ کے اب لکھنے والوں کا ہے۔کوئی چھوٹا سا امریکی لے لیں اس کی زندگی کو دیکھیں پھر ان کی کہانیوں کو پڑھیں۔کاڈویل کیا ہے؟ پہلے وہ اخبار بیچتا تھا۔پھر فٹ بال کا کھلاڑی بن گیا۔ پھر وہ PIMP ہو گیا۔اس کے بعد میڈسن کی فیکٹری میں گیا۔پھر پروفیسر اور پھر علاقے کا چوہدری بن گیا۔چلا جاتا ہے زندگی میں اور پھر کہانی سے کہانی نکالتا ہے۔اونیل کو دیکھیں۔یہ لوگ زندگی کے اندر سے چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری چیزیں لے آتے ہیں۔زندگی کی Tunnel کے نیچے سے اوپر سے دیکھتے ہیں۔میں اسے زندگی کی محض حقیقت نہیں کہوں گا۔بلکہ یہ تو زندگی کے ٹوٹے ہیں۔اس کے اوپر اُن کا ہُنر کا حسن ہے۔جو ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے۔

انیس ناگی:۔اشفاق صاحب یہ فرمائیں کہ ہمارا ادیب جو شہروں میں رہتا ہے۔منٹو، بیدی کے علاوہ کہ وہ دونوں ہول ٹائم ادیب تھے زندگی کو پوری طرح بسر کرتے تھے۔ہمارے جیسے جو دفتروں کے قیدی ہیں۔ہمارا مزاج اسی حوالے سے بنتا ہے۔زندگی کا دھارا باہر چل رہا ہے۔ہم اندر بند ہیں۔مواقع کہاں ملیں، جیلانی کامران صاحب اپنے طلبا کے بارے میں اور میں دفتر کے لوگوں کے بارے میں لکھوں؟ یہ ہے میرا تجربہ باقی رہیں تخیلاتی باتیں کہ کاڈویل نے کیا کیا ؟ یا ہیمنگوے نے کیا لکھا یہاں ہول ٹائمر کا کوئی تصور نہیں ہے۔سارتر، ٹینی سی، ولیم۔کامیو اور اونیل ہول ٹائمر تھے۔وہ زندگی اور ادب دونوں کو بسر کرتے تھے۔ہم آدھے سمجھوتے کے طور پر ادب پیدا کر رہے ہیں۔

اظہر جاوید:۔ہم تو صرف اپنی صورتِ حال میں رہ کر ہی بات کر سکتے ہیں۔باہر کیا ہوا ہمیں اس

بحث میں نہیں جانا۔

انیس ناگی:۔ مجھے انور سجاد کی نسل سے پوچھنا ہے کہ چلیے ایک سٹرکچر بنا۔ ہم اس سے آگے جاتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ میں اور مجھ میں کمیونی کیشن گیپ کیوں پیدا ہوا۔ کیا میں تربیت یافتہ قاری کے طور آپ کی بات سمجھ نہیں پاتا یا آپ جس اندرونی یا مظہریاتی کیفیات سے گزر رہے ہیں وہ میری زندگی سے دُور ہیں؟ سارا طریقہ کار میں بھی جانتا ہوں تکنیک اور اس کے ذریعوں سے میں بھی واقف ہوں لیکن اس کے باوجود کیا بات ہے کہ آج بھی منٹو اور بیدی کی بعض کہانیاں مجھ میں جذباتی یا عقلی طور پر تھرک پیدا کرتی ہیں۔ یہ گیپ قاری کے طور پر میں آج بھی محسوس کرتا ہوں۔

اصغر ندیم:۔ آپ کے ناولوں اور افسانوں کو پڑھ کر یہی سوال میں آپ سے کرتا ہوں۔

انور سدید:۔ ''دیوار کے پیچھے'' کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ جو زندگی انیس ناگی نے بسر کی ہے وہ اس میں لکھی ہے۔

اظہر جاوید:۔ ہم افسانے پر بات کر رہے ہیں۔

انور سدید:۔ اور افسانہ تو ناگی صاحب نے نہیں لکھا۔

اصغر ندیم:۔ لکھا ہے۔ چھپا بھی ہے۔

خواجہ زکریا:۔ اگر تو آپ کی مراد یہ ہے کہ انسان کو متنوع تجربات نصیب ہونے چاہئیں اور اس کے ساتھ اس کی قوتِ مشاہدہ اور احساس بھی متاثر ہوتا ہے۔ تو تب ہی وہ بڑا افسانہ لکھ سکتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان تجربات کے بغیر اگر اس کی قوت مشاہدہ اور احساس اس ماحول میں رہ کر متاثر ہو جائیں اور اچھا لکھ سکے۔ اس کی مثالیں بھی ادب میں ملتی ہیں۔

اشفاق احمد:۔ متنوع تجربات سے یہ مراد نہیں تھی کہ جب تک آدمی اتنی قلابازیاں نہ لگائے۔ کہانی نہیں لکھ سکتا۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو کرسی پر بیٹھے ہیں۔ انسان کے ساتھ یا زندگی کے ساتھ متعلق ہو کر ایسے ہی متفرق تجربات سے متاثر ہوتے ہیں لیکن اتفاق یہ ہوا، جیسا کہ انیس نے کہا۔ ہم چونکہ بند رہے کمروں، میں ملازمت میں رہے۔ ہمہ وقت ادیب نہیں تھے،

اس لئے تجربات نہیں کر سکے۔ تو یہ معذرت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ جب آدمی ادب کا پیشہ اختیار کرتا ہے تو اسے پورے طریقے سے کرنا چاہیئے۔ ایک ڈاکٹر اگر یہ کہے کہ میں تو پارٹ ٹائم ڈاکٹر ہوں۔ چھٹا ہے بھلا۔ اب دیکھیے یہ Conviction کی بات ہے۔ اس کا فیصلہ آپ ہی کریں گے۔ اب اگر آپ لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جائیں۔ خدا کرے کہ ہوں۔ تو آپ مجھ سے کبھی نہیں پوچھیں گے۔ کہ شیشہ کہاں سے ملتا ہے۔ کنگھی کہاں سے ملتی ہے۔ خوشبو کہاں سے ملتی ہے۔ اب آپ اس Conviction کے تحت محبت میں کنگھی دے چکے ہوں گے۔ خوشبو لگا چکے ہوں گے۔ یہ صورت ادب سے Conviction کی ہے۔

انیس ناگی:۔ جس زندگی کو میں ایک ادیب کے طور پر بسر نہیں کر سکا۔ ایک مزدور کے پیرہن میں زندہ نہیں رہا تو پھر میں تصور کروں گا۔ الف کے بارے میں ب کے بارے میں۔

اشفاق احمد:۔ بس یہی میں کہنا چاہتا ہوں۔ جس زندگی کے بارے میں، میں جانتا نہیں، اس کے بارے میں لکھنا محض عِلم ہی عِلم ہوگا۔ یہ میرا حال نہیں رہا۔ میں اس پر حاوی نہیں ہوں۔ اچھا اب دیکھیں میں زندگی میں کلرک نہیں رہا نہ ہی سائیکل پر ٹفن باندھ کے نکلا۔ اس کے باوجود میں کلرک پر بہت اچھا افسانہ لکھ سکتا ہوں۔ عِلم کے زور پر، لیکن وہ بڑا ہی صحافیانہ قسم کا افسانہ ہوگا۔ وہ آپ سے داد بھی لے لے گا۔ لیکن ادب کو آگے نہیں بڑھائے گا۔

سہیل احمد:۔ میں بحث کے درمیان شریک ہوا ہوں۔ اس لئے پورا سرا تو ہاتھ نہیں آسکا۔ لیکن میں یہ کہوں گا کہ یہ بھی پھر ادب کو بہت ہی محدود کرنے کا طریقہ ہے۔ ترقی پسند تحریک کا اور انسانوں کا ذکر آیا ہے۔ میں ایک افسانہ نگار رفیق حسین کا ذکر کرتا ہوں۔ انھوں نے جانوروں کے متعلق کہانیاں لکھیں۔ کیا ان کہانیوں کا ہماری دُنیا سے یا انسانی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے یا وہ محض جانوروں کی کہانیاں ہیں یا انھوں نے جانوروں کے ساتھ رہنے کا تجربہ کیا ہے؟

اشفاق احمد:۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے بڑے بھولے پن سے پھر میری تائید کر دی کہ رفیق حسین واحد افسانہ نگار ہے جو صاحب حال ہے جو جنگل میں رہتا تھا۔ جس کا جانوروں کے ساتھ ناتا تھا۔

سہیل احمد:۔ دیکھیئے مزدور پر لکھنے کے لئے مزدور ہونا ضروری نہیں ہے۔

اشفاق احمد:۔ اوہو مجھے صاحبِ حال کا مطلب سمجھانا پڑے گا جو صاحبِ حال نہیں ہوتا۔ اس کا مزدور سے ڈائریکٹ تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اس کے اوپر ویسے نہیں لکھ سکتا جیسے اس کے قریب رہنے والا لکھ سکتا ہے۔

خواجہ زکریا:۔ کیا دور رہ کر میں ان لوگوں کا درد محسوس نہیں کرسکتا۔ کل میرے سامنے ملازم کا لڑکا حادثے میں مر گیا۔ کیا میں احساس نہیں کرسکتا کہ وہ کہاں سے چلا۔ کیسے حالات میں تھا۔ کیسی اس کی زندگی تھی۔

انور سجاد:۔ یہی تو کہانی ہے۔

خواجہ زکریا:۔ کیا میرے لئے اس افسانے کو لکھنے کے لئے لڑکا بننا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ تجربے کو یہ شکل دینا مناسب نہیں ہے۔

اشفاق احمد:۔ اس کی رپورٹنگ ''جنگ'' میں ہو چکی ہے کہ لڑکا کہاں سے آیا ہے کیسے اس کو حادثہ پیش آیا وغیرہ یہ افسانہ نہیں ہے۔

سہیل احمد:۔ طوائفوں کے معاملے میں جتنا رسوؔا اور منٹوؔ نے لکھا ہے کسی نے نہیں لکھا تو کیا وہ......

اشفاق احمد:۔ رسوؔا اور منٹوؔ نے طوائفوں کو بڑا Romantacise کیا ہے۔ میں تو خود طوائفوں کے پاس گیا ہوں۔ میرا تو پیشہ رہا ہے ریڈیو کے زمانے میں۔ وہاں کی طوائفیں مختلف ہوتی ہیں۔ کھولی کی طوائف کو لے لینا، تجربہ نہیں بنتا۔

سہیل احمد:۔ دیکھیں بمبئی کی کھولیوں اور لاہور کے اُس بازار میں بڑا فرق ہے۔

اصغر ندیم:۔ انور سجاد صاحب آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد میں جیلانی صاحب سے ایک سوال کروں گا۔

انور سجاد:۔ جناب میں کچھ بیانات دینا چاہتا ہوں۔ قاسمی صاحب نے ابھی کہا تھا کہ نئی کہانی خوف سے پیدا ہوئی ہے۔ سیاسی جبر کی وجہ سے انسان نے اپنا سٹائل بدل لیا ہے۔ ہوسکتا ہے ایسا بھی ہو۔

آغا سہیل:۔ کئی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔

انور سجاد:۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ مارشل لاء سے لے کر آج تک ملکی اور بین الاقوامی صورتحال تیزی سے بدلی ہے۔ انسان کے Perception کے ذریعے بدل گئے ہیں۔ انسان کے لئے زندگی کی حقیقت تو بدلتی رہتی ہے۔

اظہر جاوید:۔ قطع کلام کر رہا ہوں۔ آپ کی بات بڑھانے کے لئے آپ یہ بھی سمجھائیں کہ جب ملک میں کوئی صورتِ حال بدلتی ہے تو شاعر کا ردِ عمل جذباتی طور پر فوری ہوتا ہے۔ جب کہ افسانے میں یہ آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔

انور سجاد:۔ اس لئے کہ افسانہ نگار کو بہت کچھ Assimilate کرنا پڑتا ہے۔ شاعر اس وقت ایک صحافیانہ عمل میں اگر فوری طور پر ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔

اصغر ندیم:۔ آپ اسے جذباتی ردعمل کہہ سکتے ہیں۔

انور سجاد:۔ چلیں کہہ لیں۔ ویسے صحافیانہ اظہار بھی بہت ہوا تھا ۶۵ء کی جنگ میں۔

انور سدید:۔ پہلے اس بات کو طے کر لیں کہ تجریدی یا علامتی افسانہ ۱۹۵۸ء کے بعد یہاں آیا یا پہلے۔

انور سجاد:۔ جی نہیں میں تاریخ نہیں دے رہا جو واضح رجحان آیا اس کی بات کر رہا ہوں۔

انور سدید:۔ اور یہ جو واضح رجحان آیا۔ اس کے نقوش ہمیں پیچھے سے نظر آتے ہیں۔ کندھے سے کندھا ملا ہوا ہے۔

انور سجاد:۔ اس سے مجھے انکار نہیں ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جو بھی کہانی آج لکھی جا رہی ہے۔ اس کا بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک ترقی پسند تحریک سے تعلق ہے جتنا آپ زور لگا لیں۔ اس حقیقت سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ ہماری جڑیں اسی میں ہیں اب وہی پہلے والی بات کہ خوف سے افسانے پر کیا اثر پڑا۔ خوف نے نئے افسانے کے اسلوب کو تعمیر نہیں کیا۔ بلکہ بدلتی ہوئی صورتِ حال اور ذرائع نقل و حمل نے اسے تبدیل کیا ہے۔

جیلانی کامران:۔ وہ کیسے؟ خوف کی بات تو میں مان گیا کہ نئے افسانے کو اس نے تبدیل نہیں کیا۔ جب آپ Perception کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کی تھوڑی سی وضاحت بھی

کر دیں۔

انور سجاد:۔ جی میں اپنے متعلق بتا سکتا ہوں کہ جس طرح میری تربیت ہوئی ہے۔ ایک بتدریج عمل کے ذریعے۔ میری تھیم قاسمی صاحب کے مطابق وہی باسی تھیم ہے۔ جب وہ معاملہ مجھ سے الگ نہیں ہوتا میں اس مرکزی موضوع میں مصروف رہوں گا۔ اور وہ ہے جب ہر قسم کا جبر...... اسی سے میں Perception کو Define کر سکتا ہوں۔ میرے اسلوب میں جب تبدیلی آنا شروع ہوئی تو میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ میں اگر جبر کا سامنا کرنا چاہتا ہوں تو میں مروجہ اصولوں میں تمیز مروجیت کی بات کیسے کر سکتا ہوں۔ وہ Containment پرانی فارم میں نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے دوسروں کا پتہ نہیں ہے۔ چنانچہ خوف کا اتنا تعلق نہیں ہے جتنا کہ پچھلی روایت خاص طور پر منٹو صاحب کا...... حالانکہ کرشن چندر نے کہانیاں لکھی ہیں۔ فنٹیسی میں مرزا ادیب بھی مبتلا رہے ہیں۔ تاریخ تو ہے ہمارے پاس اس کے بعد ہمارا اپنا انتخاب ہے کہ کسی بھی شے کو ہم چن کر آگے بڑھ جائیں۔ اب رہی بات ناگی کی اور اشفاق صاحب کے اٹھائے ہوئے بنیادی سوالات کی کہ رائٹر صاحبِ حال نہیں ہوتا اور یہ کہ آدمی دوہری زندگی بسر کر رہا ہے بعض دفعہ تو وہ ریا یا منافقت تک جا پہنچتا ہے۔ صاحب حال کے سلسلے میں جو شخص خوبصورتی سے بچ نکلتا ہے وہ تو انتظار حسین ہے۔ کیونکہ وہ صاحبِ ماضی ہے اس لئے کبھی وہ خود کو اشفاق صاحب کی نسل سے متعلق کرتے ہیں کبھی وہ ہمارے ساتھ خود کو جوڑتے ہیں۔ صاحب حال جناب والا میرے نزدیک روحانی، جسمانی یا جسے انتظار حسین اندرونی واردات کہتے ہیں۔ اور زندگی کا تجزیہ Temporal معنوں میں...... یہ دونوں جب تک اکٹھے نہیں ہوتے ہے جس کی وجہ سے آپ اپنے اندر روحانی اظہار کے لئے خواہش محسوس کرتے ہیں۔ انسان اپنی Creativity میں اپنے انسان ہونے کا اثبات کرتا ہے۔ یہ اس کی سرشت میں موجود ہے کہ وہ Creative ہو۔ یہ اہم انسانی کوالٹی ہے۔ جب آپ کو یہ معلوم ہے کہ یہ اہم انسانی قدر ہے تو آج کے دور میں دوغلے انسان کی وجہ بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی سے اپنے عمل سے اپنی روحانیت سے کس طرح Alienate ہو گیا ہے۔

انیس ناگی:۔ یہ میٹا فزیکل Alienation یا مارکس والی Alienation ہے۔

انور سجاد:۔ اس Alienation کے حتمی نتائج جو میں مرتب کرتا ہوں آخر کار اسی میٹا فزیکل Alienation کے ہو جاتے ہیں۔ چونکہ جس وقت تک کام کے ساتھ انسان کا تعلق نہیں رہتا اور Surplus Value انسان کے عمل کو متعین کر دیتی ہے تو انسان کا کام سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

جیلانی کامران:۔ آپ تو تھیوری کی باتوں میں الجھ گئے۔

انور سجاد:۔ تھیوری کی باتیں نہیں ہیں سر۔ ویسے اگر آپ کو معلوم ہے تو میں نہیں بولتا۔

جیلانی کامران:۔ نہیں نہیں آپ بات کریں۔

انور سجاد:۔ میرا تجزیہ یہ ہے کہ آج کے انسان کی غیریت کے المیہ کی وجوہ سوشو پولیٹیکل اور اقتصادی ہیں۔ انیس کے مطابق جو لوگ دوغلی زندگی بسر کر رہے ہیں، آپ انھیں اقتصادی تحفظ فراہم کر دیں۔ وہ ایسے زندہ رہ سکے گا جیسے اس کی خواہش ہے۔

جیلانی کامران:۔ گویا افسانے میں تجریدیت اس بنا پر آئی جس کی خبر ابھی آپ نے دی ہے۔

انور سجاد:۔ افسانے میں تجریدیت تخلیقی فن کار کی Alienation کے سبب آئی۔

جیلانی کامران:۔ اور جو ہیرو یا انسان اس نے پروجیکٹ کیا وہ داخلی طور پر ٹوٹا ہوا ہے۔ پریشان ہے۔

عذرا اصغر:۔ میں ڈاکٹر صاحب سے ایک بات پوچھنا چاہوں گی کہ پاکستان اور بھارت میں آج کل دو قسم کے افسانہ نگار ہیں۔ روایتی اور علامتی۔

انور سجاد:۔ یہ دو قسم کے افسانہ نگار ہر زمانے میں رہے ہیں۔

عذرا اصغر:۔ ٹھیک ہے علامت تو بہت سے لوگوں نے استعمال کی ہے۔ منٹو نے بھی قاسمی صاحب نے بھی۔ مثلاً منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ جو ہے، علامتی افسانہ ہے۔

انور سجاد:۔ میں اگر اسے علامتی نہ سمجھوں تو پھر؟

عذرا اصغر:۔ میرا مطلب ہے اس وقت علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔

انور سجاد:۔ میں اسی طرف آ رہا ہوں کی ابلاغ کا مسئلہ جس کا ذکر ناگی صاحب نے کیا ہے۔ اس کی دو وجوہ سمجھ میں آتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ لکھاری اپنا تخلیقی کام کرتا رہتا ہے۔ اور باقی معاشرہ

اس کے متوازی اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہوا کہ یہ دونوں کام یک جا نہ ہو سکے۔ ۱۹۵۸ء اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس زمانے میں اقتصادی طور پر مسابقت کی بنیاد پڑی اشیائے صرف کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی دوڑ شروع ہوئی۔ اس طرح حقیقت کے کئی چہرے سامنے آئے۔ اس طرح ٹوٹ پھوٹ کا مسئلہ سامنے آیا اور میرے نزدیک معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ کا نمائندہ وہ Alienated آدمی ہے جو انسان کی ٹوٹ پھوٹ کی بات کر رہا ہے۔

عذرا اصغر:۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ہمارا ذہنی اور نفسیاتی احساس ہے کہ ہم اس قسم کا افسانہ لکھتے ہیں۔

انور سجاد:۔ ہوگا ان کے ہاں جو اس قسم کا افسانہ لکھ رہے ہیں۔ میرے ہاں تو یہ صورت نہیں ہے۔ آج مجھے واضح فرق نظر آتا ہے۔ Masses میں اور Common man میں ہم Mass Consumption کے عادی ہو چکے ہیں۔ جو چیز ہمیں مارکیٹ میں مہیا کر دی جاتی ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی طلب مارکیٹ میں پوری کر دی گئی ہے۔ جب کہ سب سے پہلے طلب پیدا کی جاتی ہے۔ لوگ عادی ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا آپ مجھے بتائیے کہ کتنے ادبی پرچے نکل رہے ہیں اور کس طرح سِسک سِسک کر نکل رہے ہیں۔ کیونکہ مارکیٹ نہیں ہے۔ لوگ انسان سے صارف میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ ساری ایجنسیز اس میں شامل ہیں۔ اخبار، ریڈیو، ٹی وی وغیرہ۔

اشفاق احمد:۔ ساری ورلڈ میں یہی کیفیت ہے۔

انور سجاد:۔ ہاں ساری ورلڈ میں یہ ہے۔ ہم اس کا حصہ ہیں۔ لہٰذا ہم جس وقت کوئی نظریہ Inject کرنا چاہتے ہیں۔ اسے منفعل حیثیت سے قبول کرتے رہتے ہیں۔ ڈائجسٹوں کی کہانیاں جن کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ہم چھاپتے رہتے ہیں۔ کیونکہ آدمی پوری طرح انفعالیت اختیار کر چکا ہے۔ اس لئے جب ہم کہتے ہیں۔ جدید افسانہ سمجھ میں نہیں آرہا۔ تو وجہ یہ ہے کہ آج کے معاشرے میں یہ Consumer Good نہیں ہے۔ جب ترقی پسند افسانہ شروع ہوا تو کب سمجھ میں آیا تھا۔

جیلانی کامران:۔ دیکھنا یہ ہے کہ افسانہ ایک خاص قسم کی توقع پیدا کرتا رہا ہے۔ قاری کے نقطۂ

نظر سے کیا وہ توقع آج کا افسانہ پوری کرتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم قدیم سے کہانی سننے کے قائل ہیں۔ اب ہمیں شک گزر رہا ہے کہ افسانے میں بتدریج کہانی کہیں سے گم ہو رہی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ آج سے دو سو سال پہلے جب داستانیں لکھی جاتی تھیں تو اس انسان کی شکل اور تھی۔ اس کے بعد جیسے جیسے ترقی پسند تحریک کے دوران افسانہ آیا۔ اس سے انسان کی شکل اور نظر آئی۔ ہمیں انسان بدلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور اب جس اِنسان سے ہم راولپنڈی میں آشنا ہو رہے ہیں۔ اس انسان کے منہ پر ٹیپ لگا ہوا ہے۔ وہ انسان کی بجائے کوئی اور مخلوق دکھائی دیتا ہے۔ آج کا افسانہ جس اِنسان کی نشاندہی کرتا ہے وہ کہاں تک پہلے انسان کی ارتقائی تصویر ہے۔

اشفاق احمد:۔ ہم آپ کی گفتگو سے جو پُر مغز تھی یہ سمجھے کہ آج کی کہانی کا عنصر غائب ہوتا جا رہا ہے۔ اور راؤنڈ دی گلوب غائب ہوتا جا رہا ہے۔ پھر جو شخص ہم نے داستانوں میں دیکھا تھا وہ نظر نہیں آ رہا۔ تو میرا خیال ہے ارتقا کے عمل کی وجہ سے ایسا ہے۔ آپ نے صرف راولپنڈی کی بات کی ہے اس سے اندازہ نہیں ہوتا کہ یہاں انسان بدل رہا ہے۔

جیلانی کامران:۔ میں گزارش کر رہا تھا کہ مجھے دُنیا سے، بڑی سے کوئی غرض نہیں ہے میں اپنے افسانے کی بات کر رہا تھا۔ میں کہتا ہوں۔ ہمارے ہاں جو نیا انسان کہانیوں میں آ رہا ہے۔ قاری بخوبی اس کی پہچان نہیں کر پا رہا۔ وہ اسے غالباً انسان ہی قرار نہیں دیتا۔ نہ اپنے آپ کو اس سے Identity کرتا ہے۔

انور سجاد:۔ پہلے آپ مجھے قاری کا مفہوم سمجھائیں۔ مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا قاری ہے کون؟ مجھے تو یہ قاری غلام رسول لگتا ہے۔ (قہقہے)

اشفاق احمد:۔ جیلانی صاحب آپ بتائیں آپ کے نزدیک کہانی سے کیا مراد ہے؟

جیلانی کامران:۔ جسے بچہ کہانی کہہ کر سنتا ہے۔ ہم تو اسے کہانی کہتے ہیں۔ ہم اس کی تعریف کتاب سے نہیں لاتے۔

سہیل احمد:۔ اس طرح تو علامتی افسانہ زیادہ اس تعریف پر اُترتا ہے۔ کیونکہ جنوں بھوتوں اور

پریوں کی کہانیاں تمثیل کے عناصر کے ساتھ اس کہانی کے زیادہ قریب ہے۔

اظہر جاوید:۔ جیلانی صاحب کا مطلب سمجھ سے تھا کہ بچہ کہانی سُن کر سمجھ جاتا ہے۔

سہیل احمد:۔ میں اپنی بات کو واضح کرتا ہوں۔ مثلاً انتظار حسین داستان سے کہانی بناتے ہیں۔ جیسے کایا کلپ ہے اب اس کو بچہ بھی سمجھ سکتا ہے اپنے طریقے سے سمجھتا ہے میں نے ان معنوں میں بات کی تھی جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ابہام ہے اور علامتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ اگر کوئی یہ بات تسلیم کرتا ہے تو پھر وہ اس کے متعلق محاکمہ دینے کا اہل بھی نہیں ہوتا۔ مجھے اگر سمجھ نہیں آتی کسی چیز کی تو میں صاف کہہ دیتا ہوں بھائی سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمارے پاس ایم اے کے طالب علم آتے ہیں۔ راشد، مجید امجد ان کو سمجھ میں نہیں آتا۔ آزاد نظم نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن جب انھیں بتایا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے فلاں فلاں اصول کام کر رہے ہیں تو وہ آہستہ آہستہ اس کے سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ اس کی تحسین کے قابل ہو جاتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ پرانے افسانے کے اصولوں سے آپ نئے افسانے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ میں یہ بھی نہیں کہہ رہا ہوں کہ نیا افسانہ بُرا نہیں لکھا جا رہا یا جو کوئی علامت کے نام پر لکھ دیتا ہے وہ اچھا ہوتا ہے۔ بہر حال نئے افسانے کے پیچھے بھی کوئی اصول تو کام کر رہے ہوں گے۔ اس کی تحسین اسی دائرے میں رکھ کر ہو گی نہ کہ آپ اسے بیدی، عصمت اور کرشن چندر کے دائرے میں لا کے ماریں۔

عذرا اصغر:۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ دَور کے کچھ افسانہ نگار ایسے ہیں کہ ان کی علامتیں خود ان کی مجھ میں بھی نہیں آتیں۔ کیا یہ خیال درست ہے۔

سہیل احمد: آپ مثال کے طور پر یہ بتائیں کہ فلاں افسانے کی علامت آپ کو سمجھ نہیں آئی۔ میں کوشش کرتا ہوں آپ کو سمجھانے کی۔

عذرا اصغر: خیر میری ذات کو چھوڑیں۔ میں تو لوگوں کی بات کر رہی ہوں۔

سہیل احمد:۔ جی وہ لوگ آخر کچھ افسانوں کے نام بھی تو بتاتے ہوں گے کہ فلاں افسانہ سمجھ میں نہیں آیا۔

انیس ناگی:۔ یہ ساری گڑ بڑ انور سجاد کے شاگردوں نے کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب خود تو بچ گئے۔ شاگردوں کو مروادیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ جس قسم کا تجربہ کرتے ہیں، جس قسم کی علامتیں وضع کرتے ہیں۔ آیا اس کی Relevence ہمارے سیاق وسباق میں بھی ہے کہ نہیں؟ کیونکہ میں بھی افسانے کا قاری ہوں۔ میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رہا ہوں۔ آج ان سے کیوں منحرف نظر آتا ہوں۔ ان پچیس سالوں میں افسانے نے جو نشوونما پائی اس کا نتیجہ ابہام آپ کے سامنے ہے۔

اظہر جاوید:۔ عذرا کا سوال یہ تھا کہ جو علامت وضع کی جاتی ہے ذاتی حوالے سے ہوتی ہے یا اجتماعی حوالے سے مثلاً مظہر الاسلام جب کہتا ہے گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی تو گھوڑوں سے اس کی کیا مراد ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کچھ اور سمجھیں اور میمونہ انصاری کچھ اور مطلب لیں۔

عذرا اصغر:۔ عام قاری اس افسانے کو کیا سمجھے گا؟

سہیل احمد:۔ عام قاری تو بیدی کا متھن بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اگر آتا ہے سمجھ میں تو بتائیں۔

عذرا اصغر:۔ وہ تو سمجھ میں آتا ہے۔

اظہر جاوید:۔ یہ بات تو خیر سمجھ میں آتی ہے کہ اس کے پیچھے دیو مالائی یا اساطیری سلسلہ ہے۔

سہیل احمد:۔ اس کا مطلب ہُوا یہ افسانہ ہر قاری کے لئے نہیں ہے صرف اس کے لئے ہے جو اس ماحول سے واقف ہے۔

عذرا اصغر:۔ اس کا مطلب ہے قاری کی بھی الگ پہچان ہوگی۔

سہیل احمد:۔ ہاں بالکل ہوتی ہے۔ ہر ادب میں قاری کی درجہ بندی ہوتی ہے جو شخص عدم کو پڑھتا ہے ہوسکتا ہے۔ غالب کو اس طریقے سے نہ پڑھ سکے۔

اشفاق احمد:۔ ڈاکٹر صاحب بڑی عجیب بات ہوگی کہ اگر آپ پڑھنے والی کی درجہ بندی کریں۔

سہیل احمد:۔ ہم نہیں کریں گے۔ قاری خود کر رہا ہے ایسا۔

اشفاق احمد:۔ اس لئے کہ ہم نے خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، ممتاز مفتی اور فیاض محمود کے افسانے پڑھے اور اس قسم کی تقسیم نہیں کی کہ فلاں کو پڑھنا ہے فلاں کو نہیں پڑھنا۔

سہیل احمد:۔ اس لئے کہ آپ کا تجربہ مختلف النوع تھا۔ ورنہ اس زمانے میں ترقی پسندوں کے

خلاف جو لکھا گیا۔ اس کو ذرا کھول کے دیکھیں۔ سب میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ بکواس کر رہے ہیں۔ ان کی کہانیاں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ مذہب کا اور فلاں چیز کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

اشفاق احمد:۔ وہ جو ترقی پسندوں کے خلاف لکھا گیا وہ تو ''علم دوست'' لوگوں کے مضامین ہیں ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ آج کے نئے افسانہ نگار کے جو سمبلز ہیں۔ قاری اس کو پکڑ نہیں جاتے۔

انیس ناگی:۔ یہ بہت غلط العام بات ہے۔

سہیل احمد: علامتوں کا عدم ابلاغ تو ایک فنکار کی کمزوری ہو سکتی ہے۔

اشفاق احمد:۔ بس یہی ہم کہہ رہے ہیں۔ اب جو کہانی جس پینترے سے گزر رہی ہے۔ کیا یہ کہانی اتنی ہی آسان اور خوش تر ہے یا نہیں جیسے پہلی کہانی تھی۔

انور سجاد:۔ جنابِ والا! اس سلسلے میں زیادہ قصور اس بات کا نظر آتا ہے کہ نا پختہ افسانہ نگار سے علامت بن نہیں پاتی یا وہ اسے تخلیق کر کے پھیلانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ افسانہ نگار ابھی خام ہے اسے اور مشق کی ضرورت ہے۔ مزید علم اور تجربہ درکار ہے جب ہم نئے افسانے کی بات کرتے ہیں تو زیادہ تر یہی نا پختہ افسانہ ہمارے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ صورت یہ ہے کہ مجموعوں پہ مجموعے چلے آ رہے ہیں۔ اخباروں میں پبلسٹی ریویوز، تصویریں اور انٹرویوز چھپے پہ چھپے جا رہے ہیں۔ جو اخبار پڑھتا ہے وہ اس کا نام جانتا ہے۔ لیکن اس سے باہر کے کوئی اس کا نام نہیں جانتا۔ اب میرے جیسے جن کے دوست ذرا زیادہ ہوئے انھوں نے ریویوز بھی اپنی پسند کے کرا لیے۔ مختلف مکتبہ فکر ہیں، گروپنگ ہے اور اس کو پرموٹ کرنا ہے اس کو ڈاؤن کرنا ہے۔ اس سے لگتا ہے۔ شاید بڑا کام ہو رہا ہے۔ اس رولے گولے میں صحیح آدمی کی پہچان کہاں ہے۔

سہیل احمد:۔ اس میں ایک سوال کا اضافہ میں یہ کر دیتا ہوں کہ پچھلے دس سال میں جب سے علامتی اور تجریدی افسانہ آیا ہے۔ اس کے متوازی اسی عرصے میں جو نام نہاد حقیقت پسندانہ افسانہ لکھا گیا ہے۔ ذرا ایک نظر اس پر بھی ڈالیں کہ وہ بھی اپنے سے اسالیب کی جگالی کے علاوہ بھی کچھ ہے یا نہیں۔

عذرا اصغر:۔ جب ہم پریم چند یا اس کے ہم عصروں کو پڑھتے ہیں تو ہمیں اس دور کے تمام سیاسی

معاشی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ جو آج کا افسانہ ہے کیا اس سے ہماری آئندہ نسلیں اس دَور کو سمجھ سکیں گی۔

انور سجاد:۔ وہ تاریخ سے سیکھیں گی۔

سہیل احمد:۔ پریم چند کے ہاں بھی مختلف قسم کے افسانے ہیں۔ ایک افسانہ وہ کہانی بنا کے لکھتا ہے۔ پھر وہ دو بیلوں کی کہانی لکھتا ہے جو تمثیلی پیرائے میں ہے۔ اس طرح بھی زمانے کی حقیقت ظاہر کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اگر آج کا افسانہ نگار یہ کہتا ہے کہ ایک مداری آیا ہے اور وہ بندر نچا رہا ہے ہماری سیاسی اور تہذیبی حقیقت کا اظہار کر رہا ہے۔ باقی کو الٹی کا فرق ہوسکتا ہے۔

اصغر ندیم:۔ آغا صاحب آپ بتائیں کہ کچھ عرصہ پہلے ایسی کوششیں بھی ہوئی تھیں۔ ایسی کہانی بھی لکھی گئی جس میں تجرید علامت یا نئے اسالیب میں کہانی لکھی گئی۔ اور اس میں کہانی پن کے ساتھ پورا ابلاغ بھی ہوتا ہے۔

اظہر جاوید:۔ میرا بھی ایک سوال اس میں شامل کر لیجئے کیا تجرید اور علامت ایک ہی چیز ہے یا دو مختلف چیزیں۔

آغا سہیل:۔ کئی سوال ہو گئے ہیں۔ میں تو افسانے کا ایک معمولی قاری ہوں اور افسانے کو سمجھنے کی کوششیں کر رہا ہوں۔ گزشتہ ۴۷ سال سے میں نے اسے اپنے انداز سے سمجھا ہے کہ ایک تو روایتی کہانی ہے، پہلے بھی تھی۔ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ دوسری علامتی یا تجریدی کہانی ہے جو اسلوب کی بنیاد پر ہے۔ افسانہ اپنی کوئی شکل بدل سکتا ہے۔ ظاہری بھی اور باطنی بھی۔ ہیئت کے تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً انور سجاد کی علامت کے متعلق اگر بات کریں تو وہ میری سمجھ میں اس لئے آجاتی ہے کہ میں انور سجاد کو جانتا ہوں کہ وہ بیک وقت ڈرامے کا آدمی بھی ہے لہٰذا روشنیوں کا، سٹیج کا، آوازوں کا ایک باقاعدہ پس منظر اس کے ساتھ ہے۔ مصوّر بھی ہے، ادا کار بھی ہے۔ فائن آرٹس کی بہت سی چیزیں اس کا حصہ ہیں۔ ان حوالوں سے جو علامت بنتی ہے وہ میری سمجھ میں آجاتی ہے۔ اب جو گھپلا مجھے نظر آتا ہے، وہ ہے نقاد کا، قاری کا قصور نہیں ہے۔ نقاد نے گڑبڑ کی ہے جسے ہم Defective Image کہہ رہے ہیں۔ نقاد کو یہ پیدا نہیں

ہونے دینا چاہیئے تھا۔ نقاد نے صرف یہ کیا ہے کہ دوسروں کی بیسا کھی لگا کے اپنے افسانے کو دیکھا ہے۔ دوسری بات جو میں محسوس کرتا ہوں یہ ہے کہ نقاد کو زمانوں کا باقاعدہ تجزیہ کرنا چاہیئے۔

انیس ناگی:۔ جناب ۱۹۶۰ء کے بعد بے پناہ گفتگو اسی موضوع پر ہوئی ہے۔ بحثیں اور ڈائیلاگ موجود ہیں۔ کتابوں میں رسالوں میں کہ نئے افسانے کا تصور کیا ہے۔ پوری وضاحت موجود ہے۔

آغا سہیل:۔ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ!

انور سدید:۔ تنقید کا عمل تو تخلیق کے بعد شروع ہوتا ہے۔

آغا سہیل:۔ یقیناً لیکن......

انور سدید:۔ مثلاً آپ نے انور سجاد کا ذکر کیا کہ اس کی علامتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اور دوسرے لوگ جو ان سے واقف نہیں ہیں۔ وہ نہیں سمجھ سکتے۔ میرا خیال ہے پس منظر کے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر قاری کی تربیت اس انداز سے ہوئی ہو کہ وہ علامتوں کی تعمیر کر سکتا ہو تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اصل میں، ہم قاری کو اس سطح پر نہیں لے آتے کہ وہ اس کی تحسین کر سکتے۔

آغا سہیل:۔ آپ نے دو باتوں کو ملا دیا ہے۔ میں اصل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک تو میں انیس ناگی کی بات سے جزوی طور پر اتفاق کرتا ہوں کہ نقاد باقاعدہ اپنا کام کرتا رہا ہے۔ بیچ سے قاری جو غائب ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نقاد نے اپنا کام نہیں کیا۔ اور قاری کو پوری طرح Educate نہیں کیا گیا۔ جہاں تک انور سدید صاحب کی بات کا تعلق ہے، اس سلسلے میں عرض ہے کہ کچھ چیزیں ابلاغ کی سطح پر نہیں آ رہی ہیں۔ اس سلسلے میں کس کا قصور ہے یقیناً آپ کہہ سکتے کہ لکھنے والا مکمل پختہ نہیں ہے اس میں کوئی نہ کوئی خامی رہ جاتی ہے۔ ایک آنچ کی کسر رہ جاتی ہے۔ اگر یہ کسر نہ رہتی تو یقیناً کچھ نہ کچھ تو ابلاغ ہوتا۔ کہیں نہ کہیں تو ابہام ہے یہ کیوں ہے؟

انور سدید:۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں نثری نظم اچانک آئی اور لکھنے والوں کی جن کی پوری تربیت نہیں ہوئی تھی، ایک کھیپ آ گئی۔ چنانچہ بیڑا غرق ہو گیا۔ جدید افسانے میں بھی ہوا کہ لوگوں نے اسے فیشن کے طور پر اپنایا اور انور سجاد کی طرح پوری ریاضت سے نہیں گزرے۔

آغا سہیل:۔ یہی بات میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ اگر انور سجاد کی علامت سمجھ میں آتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پیچھے باقاعدہ ذہانت ہے۔ اور باقاعدہ ادبی روح کو اس میں جذب کیا ہے۔

انور سدید:۔ ظاہر ہے جتنا بڑا افنکار ہوتا ہے اتنا ہی اس کے تجربے بڑے ہوں گے۔ اتنا ہی اس کا ابلاغ قاری تک آسانی سے ہوگا۔ خواہ وہ علامت میں کرے یا تجرید میں کرے۔

اصغر ندیم:۔ انور سدید صاحب آپ نے تو نئے افسانے کی تحسین کی ہے۔ میں نے آپ کے تبصرے دیکھے ہیں۔ آپ سیدھی سی ایک بات بتائیں کہ کیا آپ سمجھتے ہیں اس جدید افسانے میں کہانی کی کوئی شکل ہے۔

انور سدید:۔ کہانی کا عنصر ایک زمانے میں غائب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اب جو کہانی آپ دیکھ رہے ہیں اس میں تجربہ اور علامت کے ساتھ کہانی کا عنصر بھی ہے۔ ندیم نے بعض لوگوں کے نام لئے تھے۔ مثلاً منشا یاد ہیں۔ مظہر الاسلام، احمد داؤد، احمد جاوید۔ ان کے ہاں کہانی موجود ہے۔ ایک نئی افسانہ نگار نگہت سیما کا افسانہ پڑھا۔ مجھے اچھا لگا عرض کرنے کا۔

سہیل احمد:۔ ایسا ممکن نہیں ہے؟ بات ہو چکی ہے اس پر۔

انور سدید:۔ بیدی کا ذکر آیا ہے تو میں کہوں گا وہ ایک لمبے عرصے سے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ اگر آپ دانہ دوام کی کہانیاں دیکھیں اور بعد کی کہانیاں مثلاً ایک باپ بکاؤ ہے وغیرہ تو ان میں آپ کو ارتقاء کا ایک سلسلہ نظر آئے گا۔ اب تو وہ ایک عرصے سے بیمار ہیں۔ لیکن وہ تجربے کرتے رہے ہیں۔ جیسے متھن کا ذکر آیا۔ بڑا افسانہ نگار تجربہ کرتا ہے اور نئے لوگ نقل کرتے ہیں، جدید افسانے کے ساتھ یہی ہوا ہے۔

میمونہ انصاری:۔ میرا خیال ہے ادب میں اجارہ داری ہے۔

انور سدید:۔ افسانے پر کس کی اجارہ داری ہے۔

میمونہ انصاری:۔ مردوں کی۔

اظہر جاوید:۔ جناب صدر ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے میرا تجربہ ہے کہ سب سے زیادہ لکھنے والی خواتین کی کہانیاں ہمیں موصول ہوتی ہیں۔ بانو قدسیہ، پروین عاطف، الطاف فاطمہ، نشاط فاطمہ،

سائرہ ہاشمی، عذرا اصغر، فرخندہ لودھی، فردوس حیدر، رضیہ فصیح احمد، پروین سرور سب کی کہانیاں چھپتی ہیں۔

انیس ناگی:۔ڈاکٹر صاحب میرا ایک سوال ہے۔

انور سجاد:۔کون؟ ڈاکٹر آف میڈیسن یا ڈاکٹر آف لٹریچر۔

سہیل احمد:۔کچھ بھی ہو ڈاکٹر آف میڈیسن کا ذکر ضرور آئے گا۔

انیس ناگی:۔ہم اُردو افسانے کی روایت کو ایک مشترکہ روایت لیتے ہیں۔لیکن میرے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ۱۹۶۰ء کے قریب جو پاکستانی افسانہ لکھا گیا۔اس کا رنگ، لحن اور لب ولہجہ ہندوستان سے مختلف ہے۔ ہمارا افسانہ ہندوستانی افسانے سے بالکل الگ نشو ونما پاتا ہے۔ ہندوستان کے نقاد گوپی چند نارنگ سب افسانہ نگاروں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہے تھے جب کہ ہندوستان کا نیا افسانہ ہمارے یہاں کے اثر سے پیدا ہوا ہے۔اس کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے۔

انور سدید:۔میری رائے یہ ہے کہ جب آزادی نصیب ہوئی تو ہماری سوچ کے انداز یقیناً ان سے مختلف تھے۔اب جو افسانہ ہندوستان میں لکھا جا رہا ہے۔ وہ ہیبت میں چاہے ایسا ہو۔لیکن Content میں بہت مختلف ہے مثلاً جوگندر پال کا نیا ناول ''نادید'' بظاہر اندھوں کے متعلق ہے لیکن واضح طور پر اندرا گاندھی کی تصویر ابھرتی ہے جو کہ سیاسی اثر کو ظاہر کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں یہاں کی صورتِ حال نظر آئی ہے۔

جیلانی کامران:۔اس کا مطلب یہ ہوا، ہمارا افسانہ ایک محدود معانی میں Document پیدا کر رہا ہے۔اس میں کبھی آپ الف کا چہرہ پہچانتے ہیں کبھی اندرا۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج کی کہانی لکھنے والے کا سوشو پولیٹیکل تجربہ اور پس منظر کا تجزیہ بہت اچھا ہوتا ہے۔اس کے باوجود اس نے انسان کی کوئی خدمت نہیں کی۔اس نے جس انسان کا تصور ہمیں دیا ہے وہ ایسا ہے جس نے انسان کے متعلق شکوک پیدا کیے۔ میری گزارش یہ ہے کہ کہانی کار اور کسی ایسے انسان کا جس کے بارے میں شکوک نہ ہوں۔ ایک براہِ راست رشتہ ہے۔ جب وہ انسان موجود ہوتا ہے، کہانی پیدا

ہوتی ہے اور جب وہ انسان ٹوٹتا ہے کہانی بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ ہمارے ہاں وہ کہانی نہیں ہے۔ آپ نے اسے By Courtsy کہانی کہہ سکتے ہیں۔ یہ کہانی کسی طرح سے نہیں ہے۔

انیس ناگی:۔ ہم تو بزدل ہیں۔ لکھ نہیں سکتے۔ آپ بتائیں کیا.........

جیلانی کامران:۔ دیکھئے میرے ذہن میں آپ کے ناول بھی ہیں۔ میری بات مکمل ہو لینے دیں۔ گزارش یہ ہے کہ اتنے بہتر انٹلکچوئیل یہاں جمع ہیں۔ یقیناً اس سے بہتر ہمیں پاکستان میں نہیں ملیں گے۔

سہیل احمد:۔ یہ تو خودستائی زیادہ لگتی ہے۔

اشفاق احمد:۔ نہیں نہیں اچھی سٹیٹ منٹ دی ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم سے بہتر کہیں نہیں ہوں گے۔

جیلانی کامران:۔ اس مسئلے پر ڈاکٹر صاحب گفتگو کیجئے کہ کہانی کا نہ ہونا کیا انسان کے Give and take کی وجہ سے تو نہیں ہے۔

انور سجاد:۔ عرض کرتا ہوں۔ انسان اپنی معاشرتی پہچان کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے۔ افسانہ نویس بھی انسان ہے۔ وہ بھی ایک مخصوص قسم کے معاشرے میں زندہ رہتا ہے لہٰذا وہ اس کے اثرات سے بچ نہیں سکتا۔ آپ افسانے کو مختلف فرائض سونپ دیتے ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میرا بنیادی تھیسس یہ ہے کہ انسان جب تخلیقی عمل اختیار کرتا ہے تو اپنے انسان ہونے کا اثبات کرتا ہے۔ جس وقت آپ انسان سے متعلق Distorted vision کا ذکر کرتے ہیں اور اسے افسانے میں دیکھ کر آپ کو نفرت ہو جاتی ہے تو گویا میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوں، چونکہ اس انسان کی تصویر سے جیلانی صاحب کو نفرت ہو جاتی ہے تو امید پیدا ہوتی ہے کہ شاید وہ اس صورتِ حال کو تبدیل کرنے کی کوشش بھی کریں گے اب ہمیں دو باتوں کی تخصیص کرنی پڑے گی۔ کیا آپ سیاست اور سوشیالوجی کو افسانے میں پوری طرح Integrate کرنا چاہتے ہیں۔ یا محض ایک معاشرتی آدمی کو جو کہ سیاسی اور اقتصادی اثرات سے بنا ہوتا ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ سیاست دان کے جو مقاصد ہوتے ہیں وہ بڑے Shortsighted ہوتے ہیں اسکا ایک فوری Goal ہوتا ہے۔ جس کی حقیقت دیرپا نہیں ہوتی۔ جب کہ فن کار جو ہے اس کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ عظیم رہتا ہے۔ جب ہم انسان کو ٹوٹا پھوٹا دیکھتے ہیں اور امید کی بات کرتے

ہیں تو میں پوچھتا ہوں یہ مطالبہ صرف تخلیقی کاموں سے کیوں کیا جاتا ہے۔ ایک افسانہ جس میں تبدیلی کی خواہش ابھرتی ہو، چاہے اپنی منفیت میں چاہے مثبت انداز میں، دوسرا افسانہ جو آپ کو ماضی میں لے جاکر مایوس کردے۔ ان دو طرح کی کہانیوں میں ایک میں آپ کو انسان سے نفرت ہو جاتی ہے اور دوسری میں آپ بالکل گم ہو جاتے ہیں اور اپنی وجودی حالت سے بھی پرے چلے جاتے ہیں۔ وجود حالت سے دور ہونا اور وجودی حالت میں بڑا فرق ہے۔ مثال کے طور پر آج کل کے نام نہاد مارکسٹ نقادوں نے کافکا کو ترقی پسندی میں شمار کرنا شروع کر دیا ہے کیونکہ وہ جو ماحول پیدا کرتا ہے وہ انسان کے رہنے کے قابل نہیں ہوتا۔ جو خواہش کو اکساتا ہے کہ تبدیلی لائی جائے۔ جیلانی صاحب نے ترقی پسند Dogmatists والی بات کی ہے کہ اس میں سحر کی امید نظر نہیں آرہی۔ لہٰذا یہ کہانی خراب ہے۔ دوسری بات جس پر میں زیادہ زور دیتا ہوں، وہ یہ ہے کہ آپ کا نظریہ اور اپروچ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کا کرافٹ اول درجے کا ہونا چاہیئے۔ تاکہ اول درجے کے طریقے سے اس کا ابلاغ ہو سکے۔ ترقی پسندوں نے یہی غلطی کی کہ کم درجے کے افسانوں کو عظیم جانا کیونکہ اس کا Content ان کے نظریات کے مطابق تھا۔ یہی غلطی ہم آج کر رہے ہیں کہ ہیئت اور موضوع میں توازن نہیں دیکھ رہے۔ اگر کرافت اچھا ہو تو پھر تنقید کی جاسکتی ہے۔ جب کرافٹ ہی نہیں ہوگا تو اسے ہم کیا کہیں گے۔

انیس ناگی:۔ ڈاکٹر صاحب میرا آپ سے سوال ہے کہ میرے جیسے لاکھوں آدمی جو منافقت بھری، تضادات سے بھرپور زندگی گزارتے ہیں، جب آپ کا نیا افسانہ پڑھتے ہیں تو اس میں انسان کی پختگی نظر نہیں آتی۔

انور سجاد:۔ یہی تو میں بتا رہا ہوں کہ وہ Alienated انسان جو غیر انسان بن گیا ہے۔ اس کو دوبارہ پیدا کرسکوں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ کس طرح نظر آئے گا آپ کو۔ انسان کا دوبارہ اپنے آپ سے اور معاشرے سے جڑ جانا ہی تو میرا مسئلہ ہے وہ انسان Suffer کر رہا ہے اور اسے Massman بنا دیا گیا ہے۔ میں اس وقت تک تبدیلی کو قبول نہیں کرسکتا۔ جب تک سارے کو تہس نہس ہوتے نہ دیکھ لوں۔

جیلانی کامران:۔آپ نے بھی Dogmatists والی بات کردی ہے۔

انور سجاد:۔جی نہیں یہ میری Interpretation ہے۔

انیس ناگی:۔ڈاکٹر صاحب ایک ثابت انسانی زندگی غائب ہوچکی ہے۔اس کی چھوٹی سی مثال دوں گا۔آپ کے فوراً بعد کی نسل میں منشا یاد اور رشید امجد وغیرہ آتے ہیں ان میں محبت کا جذبہ غائب نظر آتا ہے۔

انور سجاد:۔اس کا انھیں تجربہ ہی نہیں ہوا۔ہمارے بے شمار ادیبوں سے تحیر، عشق اور معصومیت کے جذبے غائب ہوچکے ہیں۔سوائے بنیادی جبلتوں کے اظہار کے۔

اصغر ندیم:۔ یہ بنیادی جذبے جن کا ذکر آپ نے کیا وہ غائب ہوچکے ہیں۔جیلانی صاحب اگر آپکو اس سے اتفاق ہے بتائیں کہ یہ تین چیزیں کیسے غائب ہوئیں یا ان کی کہانی اور ادب کے لئے کتنی اہمیت ہے۔

جیلانی کامران:۔جب آپ جانتے ہیں کہ یہ تینوں بنیادیں Affection ہیں۔ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے۔کیا آپ ان کو اپنی کہانیوں میں شامل نہیں کرنا چاہیں گے؟

انور سجاد:۔جی میں کرنا چاہوں گا۔

اشفاق احمد:۔کرنا تو چاہتے ہیں لیکن یہ Consumer سوسائٹی بنی ہوئی ہے۔یہاں محبت معصومیت اور تحیر آپ کو گردو پیش نظر نہیں آئے گا، کیونکہ جنسِ خریدار کا رخ بدل گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔لیکن میں اس بات کے بالکل اُلٹ سوچتا ہوں۔میں پھر اسی بات پر آؤں گا۔جس پر آپ ناراض ہوئے تھے۔ کیونکہ آپ دُنیا کے دکھوں کو ٹائمز اور نیوز ویک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مثلاً میں پنڈی گیا۔وہاں اور طرح کی کہانیاں لکھی جارہی ہیں۔میں حیران رہ گیا کہ میں تو بہت پیچھے رہ گیا ہوں۔وہاں دو افسانہ نگاروں نے تنہائی کے کرب پر افسانے سنائے۔میں نے کہا آپ خوش قسمت ہیں آپ کو تنہائی کی آزادی ملی ہے۔ہمارے ہاں تو کبھی ماما آگیا۔کبھی پھوپھی آگئی۔گھر ہی بھریا ہندا اے۔انھوں نے کہا جی چونکہ ولایت میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس لئے ہم بھی لکھ رہے ہیں۔

انور سجاد:۔ یہ اشفاق صاحب آپ نے خود لگائی ہے۔ منڈے اے گل کدی نئیں کہہ سکدے۔

اشفاق احمد:۔ آں ہاں اس لئے کہ گھر کا سسٹم ٹوٹ رہا ہے۔ میں تو دیکھ رہا ہوں۔ ناروے میں جو کیفیت ہے۔ کیونکہ میں کہانی کہنے والا داستان گو ہوں۔ اس لئے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ محبت، معصومیت اور تحیر ہمارے ہاں موجود ہیں، دیکھنے والا نہیں ہے۔ دو واقعات سناتا ہوں۔ میرے گھر کے سامنے سے لکڑ ہاروں آٹھ سالہ پٹھان بچہ اپنے سات سال کے بھائی کو اٹھائے جا رہا تھا۔ جس کے پاؤں زمین پر لگ رہے تھے۔ کیونکہ وہ بھی اس جتنا تھا۔ میں نے اس لڑکے سے پوچھا۔ کیوں کاکا ایہہ بھاری اے۔ اُس نے جواب دیا۔ نہیں جی ایہہ میرا بھرا اے۔

اسی طرح میں ٹی وی کے لئے حیرت کدہ کی طرز پر کہانی کی لوکیشن دیکھنے نکلا۔ دیکھا ایک ٹوٹے مکان کے ڈھیر پر ایک طرف گتوں سے رہنے کے لئے ایک عورت نے جگہ بنائی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا جسے سردی لگ رہ تھی۔ وہ سردی سے بچانے کے لئے اس کے گرد ایک اور گتہ دے دیتی۔ بچے نے ماں سے کہا۔ اماں جن غریبوں کے پاس گتے نہیں ہوتے وہ کیا کرتے ہیں۔

اب یہ کہانیاں ہیں معصومیت کی۔ جنسِ خریدار چاہے بدل گیا ہو۔ لیکن یہ کہانیاں ہیں۔ اب آپ اس چیز سے نہ گھبرائیں کہ افسانوں کی کتاب بکتی نہیں ہے جب سے اُردو بنی ہے۔ سب سے زیادہ بکنے والی کتاب ''موت کا منظر'' ہے۔ اس کا مطلب نہیں کہ یہ بالِ جبریل سے زیادہ قابلِ توجہ ہے۔ میری تو آج کے افسانہ نگار سے دکھ بھرے انداز میں صرف یہ شکایت ہے کہ اتنی اعلیٰ چیزیں جو وہ کمیونی کیٹ کرنا چاہتے ہیں اور جس کے لئے ہر چشم راہ ہیں اور سمجھنے کے لئے زور لگاتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے کہا کہ یہ نقادوں کا قصور ہے گویا وہ یہ چاہ رہے ہیں کہ اس کی تفسیریں لکھی جائیں۔ آٹھ جلدوں میں۔

جیلانی کامران:۔ جی نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔

اشفاق احمد:۔ اس وقت تو یہی لگتا تھا۔ اور بات یہ ہے کہ نقاد یہ سب نہیں کرسکتے۔ جیسے انور سدید نے کہا کہ آدمی خود ہی اپنی کہانیوں کے آگے چلتا رہتا ہے۔ لیکن وہ جو انسانی Emotion ہے

اس کا اظہار بہت ضرور ہے۔

اظہر جاوید:۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر اصغر ندیم سید صاحب کچھ سوال کرنا چاہتے ہوں تو بحث کسی مقام پر پہنچے اور اسے ختم کریں۔

اصغر ندیم:۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ پچھلے دو تین سال سے جو افسانے لکھے گئے ہیں۔ ان میں ایسے افسانے جنھیں ہم آرٹ کرافٹ کے حوالے سے بھی بہتر کہانیاں کہہ سکتے ہیں۔ اس میں اسلوب کی نئی حسیت کے ساتھ ساتھ افسانے کے معانی کو بھی دریافت کرنے کی کوشش نظر آتی ہے اور اس سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ اگر ہم نے اپنے مسائل پر لکھا ہے۔ اور شدت سے اس کو محسوس کرتے ہیں تو ہمیں کسی حد تک ابلاغ کو اہم جاننا ہوگا جن افسانہ نگاروں کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ ان کے ہاں کہانی کی ایک شکل بنتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جو ابلاغ بھی کرتی ہیں اور ارد گرد کے ماحول کو بھی پیش کرتی ہیں۔ اور اپنی ذاتی اور داخلی صورتِ حال کو بھی سامنے لاتی ہیں۔ کچھ لوگوں نے تیسری دُنیا سے خود کو جوڑنے کی کوشش بھی کی کہ تیسری دُنیا کی کہانی بھی تقریباً مشترک مسائل سے متعلق ہے۔ اگر ہمیں اسی طرح سوشو پولیٹکل صورتِ حال کو محسوس کر کے لکھنا ہے تو ہمیں زیادہ واضح ہونا پڑے گا۔

انور سدید:۔ اگر تیسری دنیا کے مسائل ایک جیسے ہوں تو اس طرح مشترکہ احساس کے ساتھ لکھا جاسکتا۔ کچھ مسائل ہوسکتا ہے مشترک ہوں۔ لیکن آرٹ میں فرق ہوسکتا ہے۔ جیسے انیس ناگی نے کہا کہ پاکستانی اور ہندوستانی افسانہ مختلف آہنگ رکھتے ہیں۔

اظہر جاوید:۔ میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔ اگر افسانے پر نام نہ لکھیں تو پتہ نہیں چلے گا۔ یہ انور سجاد کا ہے یا بلراج منیرا کا۔

انور سدید:۔ جی نہیں صاف پتہ چل جائے گا کس کا ہے؟

اظہر جاوید: شاید کچھ لوگوں کو پتہ چل جائے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ چاہے روایتی کہانی ہی کیوں نہ ہو۔ اس پر کسی کا نام نہ ہوگا کیسے پتہ چلے گے پاکستانی ہے یا ہندوستانی۔

انیس ناگی:۔ Content سے پتہ چلے گا۔ ویسے تو اگر آپ چیخوف کی اور موپساں کی درمیانی

درجے کی کہانی لے لیں اور نام نہ لکھیں تو کِس طرح پہچانیں گے۔ جب تک اس کا سٹائل بہت زوردار نہ ہو۔ انور سجاد نے جب یہاں لکھنا شروع کیا ہے۔ ہندوستان میں کیا صورتِ حال تھی۔ بلراج منیرا جسے انور سجاد بڑا افسانہ نگار کہتا ہے، وہ اس کی کاپی کرتا ہے۔

اظہر جاوید:۔ کیا قیامِ پاکستان کے بعد جو ادب پیدا ہوا...... ہم اس کی شناخت کر سکتے ہیں۔

انیس ناگی:۔ بالکل بالکل! ہر لحاظ سے شناخت کر سکتے ہیں۔

اشفاق احمد:۔ ہاں بہت واضح فرق ہے دوسروں سے۔

انیس ناگی:۔ تھرڈ ورلڈ میں کوئی افسانہ نہیں لکھا جا رہا۔ انڈونیشیا، تھائی لینڈ، برما، ملیشیا۔

اظہر جاوید:۔ تھرڈ ورلڈ میں فلسطین بھی آتا ہے۔

اشفاق احمد:۔ افریقہ کے ممالک بھی ہیں۔

اظہر جاوید:۔ میرا خیال ہے تھرڈ ورلڈ میں جتنی اچھی کہانی لکھی جا رہی ہے۔ شاید ہی کہیں اور ہو۔

انور سجاد:۔ جو جو ممالک اپنے اپنے انداز سے اپنی شناخت کے لئے اور بڑی قوموں سے خود کو رہا کرانے کے لئے کوشش کر رہے ہیں ان میں تھوڑی بہت مماثلت ہے۔

انور سدید:۔ ایک سوال اشفاق صاحب سے پوچھنا ہے آپ نے ایک دو واقعات سنائے۔ تو ہم نے کہا یہ تو کہانیاں ہیں۔ تو کیا آپ ان واقعات کو دیکھ کر ڈھلی ڈھلائی کہانیاں ہمیں دیتے ہیں۔

اشفاق احمد:۔ جی نہیں۔ ضروری نہیں۔ جو واقعہ دیکھا ہے وہ کہانی میں ضرور آئے۔ اکثر وہ آتا ہی نہیں۔

میمونہ انصاری:۔ مجھے بھی ایک بات پوچھنی ہے۔ آپ نے پہلے کہا کہ ترقی پسندوں نے کتابوں سے پڑھ کر مجرد تصورات کو افسانوں میں پیش کیا۔ آپ نے غلام عباس کا اوورکوٹ دیکھا۔ بتایئے اس میں مجرد خیال کہاں ہے۔ کیا مشاہدہ نہیں تھا۔

اشفاق احمد: یہ بی بی وہ تو لوگوں کے افسانے سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔

میمونہ انصاری:۔ لیکن انھوں نے کس طریقے سے اپنے ماحول میں ڈھالا۔ اس طرح تو آپ قاسمی صاحب کے ''گھر سے گھر تک'' کو بھی کہہ دیں گے کہ یہ چربہ ہے۔

اشفاق احمد:۔ جی ہاں ہو سکتا ہے۔

میمونہ انصاری:۔لیکن کیا انھوں نے اپنے ماحول میں رہ کر اس کا تجزیہ نہیں کیا۔کیا وہ طبقہ ان کا دیکھا بھالا نہیں۔

اشفاق احمد:۔یہی بات تو میں کہہ رہا ہوں کہ اپنے ماحول میں ڈھالا ہے۔ان کا اپنا تجربہ نہیں ہے۔

انور سجاد:۔آپ نے دیکھا ہوگا تلنگانہ کے جو سب سے مشہور سیاسی آدمی تھے مخدوم محی الدین۔ ان کی شاعری آپ نکال کے دیکھ لیں۔

اشفاق احمد:۔ایک کی نہیں سب کی۔

اظہر جاوید:۔اگر آپ اس حوالے سے مخدوم محی الدین کو دیکھتے ہیں تو ذرا ظفر علی خاں کی شاعری کو بھی دیکھیں وہ اب کہاں ہے۔

اشفاق احمد:۔ہاں یہ بات بھی ہے۔

اظہر جاوید:۔تو بس اس میں صرف کسی ترقی پسند کا نام نہیں آتا۔مولانا کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ ان کی ساری شاعری ہنگامی تھی۔اور جو اچھی تھی وہ بھی ہنگامی میں دب گئی۔

انور سجاد:۔اگر کسی بھی تخلیق میں Passion نہیں ہے۔تحیر نہیں ہے۔آپ کے نقطۂ نظر کو وہ پروجیکٹ نہیں کرتا ہے تو اس میں زندہ رہنے کے کم امکانات ہیں۔

اشفاق احمد:۔ہاں اصل چیز یہ ہے۔یوں تو ہم بھی نیشنل کنسٹرکشن کے اُوپر ڈرامے لکھتے ہیں جو ادب نہیں ہے۔

اظہر جاوید:۔آغا سہیل صاحب کہہ رہے تھے کہ انور سجاد کی کہانی اس لئے انھیں سمجھ میں آئی ہے کہ وہ حوالہ جانتے ہیں۔میں کہتا ہوں ایک آدمی چیچو کی ملیاں میں بیٹھا ہوا ہے اور وہ سب پہلوؤں سے واقف نہیں ہے، وہ کیسے سمجھے گا۔

اصغر ندیم:۔میرا خیال ہے یہ تو حسیت کی بات ہے۔اگر اس کی Sensibility میں وہ چیزیں آتی ہیں تو وہ سمجھ پائے گا۔ورنہ چاہے وہ انور سجاد کے بہت ہی قریب بیٹھا ہو سمجھ نہیں پائے گا۔

آغا سہیل:۔میں نے مثال دی تھی۔مقصد یہ تھا کہ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ آج سے اس چمچے کا مطلب میں یہ لوں گا اور آپ اسے علامت بنائیں گے تو یہ کبھی کمیونی کیٹ نہیں ہوگا۔

اظہر جاوید:۔ مثلاً آپ چمچے کو قلم کہنا شروع دیں۔

اصغر ندیم:۔ میرا خیال ہے افسانہ نگار کبھی ایسا نہیں کرتا۔ یہ اتنا سادہ عمل ہے اس کے پیچھے کچھ سماجی محرکات ضرور ہوتے ہیں۔

انور سجاد:۔ اگر آپ چمچے کی خصوصیات قلم کو دے دیں اور قلم کی چمچے کو تو چمچہ گیری واضح ہو جاتی ہے۔

آغا سہیل:۔ وہ ٹھیک ہے میں اصل میں Ambiguity کی بات کر رہا تھا۔

انیس ناگی:۔ آپ پرائیویٹ سمبلز کی بات کر رہے تھے۔

آغا سہیل:۔ جی ہاں، آپ اپنی کوئی پرائیویٹ علامت وضع نہیں کر سکتے۔ علامت کہیں نہ کہیں موجود ہوتی ہے۔ روایت میں۔ تاریخ میں۔ سماج میں۔ وہاں سے آپ نکالتے ہیں۔

انور سجاد:۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کوئی علامت خود بنائیں اور اسے اس طرح پھیلائیں کہ وہ واضح ہو جائے پرائیویٹ علامت کوئی چیز نہیں ہوتی۔

اشفاق احمد:۔ مَیں تو اپنا قول فیصل دے چکا ہوں۔ اور اس کے بعد ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بڑی سیر حاصل بحث ہوئی ہے۔ اِدھر اُدھر بکھری بھی ہے۔ جو کہ اچھی بحث کا خاصا ہوتا ہے۔ کِسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکتا۔ مجھے یقین ہے آپ اس میں سے کچھ نکال لیں گے۔

انور سجاد:۔ کافی کچھ نکال دیں گے۔

......☆☆☆......
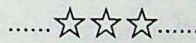
(بشکریہ ''تخلیق'' لاہور، افسانہ نمبر ۱۹۸۴)

سفر نامہ

●......ڈاکٹر عرفان عالم

داستانِ گلستاں

(قسط نمبر 1)

یہ بات 11 جون 2011ء کی ہے کہ جب میں صدر اسپتال سے وابستہ سپر اسپیشلٹی اسپتال واقع 'شیریں باغ'، کرن نگر، سرینگر میں اپنی شریک سفر کے ساتھ اپنا معمول کا طبی معائنہ کرانے گیا تھا۔ مریضِ عشق حال ہی میں مریضِ دل کی باضابطہ فہرست میں شامل ہو گیا تھا۔ میرے دل کو معمول پر رکھنے کے لئے شعبۂ قلبیات کے جراحوں نے ماہر قلبیات ڈاکٹر نذیر احمد لون کی سربراہی میں میری رگِ جاں (شریانیوں) میں فولاد کی دو مصنوعی نلکیاں پیوست کر کے مجھے عشق کرنے کی آزادی دے ہی دی۔ بیگم میرے دل کی بیماری سے بے حد غم زدہ ہیں اور اگر اس پر یہ بات عیاں ہو جائے کہ عاشق کا کوئی اور معشوق ہے تو وہ بلاشبہ شریانیوں میں خون روکنے والا آلہ (stopper) بھی لگواتی۔ بہر کیف وہاں سے گاڑی میں بیٹھتے ہی اچانک میرے حبیب کا فون آیا "یار کیا آپ نے اپنا میل دیکھا؟!" میں نے کہا "نہیں تو۔۔ خیریت تو ہے نا"۔ اُس نے جواب میں کہا "دراصل المصطفیٰ بین الاقوامی یونیورسٹی ایران نے مجھے ایک ای میل ارسال کیا ہے۔۔ "ورکشاپ میں شرکت کے لئے"۔۔ اس لئے آپ اپنا میل دیکھیں کہ آپ کو بھی دعوت نامہ موصول ہوا ہو۔۔" خیر! دفتر پہنچنے کے بعد جب میں نے اپنا میل دیکھا تو مجھے بھی دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ میں نے یہ بات ڈاکٹر حبیب صاحب کو بتائی، وہ بہت خوش

ہوئے۔تو اس طرح بنا وقت ضائع کئے پہلی فرصت میں کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل سرینگر اور مرکزی وزارت برائے گھریلوں معاملات ،حکومتِ ہند سے اجازت نامہ حاصل کر کے ہم نے سفری دستاویزات تیار کرائیں۔

جولائی کی دس تاریخ کو ہم ' گوائر' کے طیارے کے ذریعے سرینگر سے دہلی پہنچے۔ہم نے اپنے رکنے کے لئے جواہرلال نہرو یونیورسٹی کا انتخاب کیا۔کیونکہ اب بھی کسی نہ کسی صورت میں تعلیمی اعتبار سے یہ دانشگاہ ہندوستان کی تمام دانشگاہوں میں اپنی عظمت کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہی ہے۔یہاں سے تعلیم حاصل کرنا ہر کسی ہندوستانی کا خواب ہوتا ہے۔رات کے قیام کے لئے اراولی مہمان خانہ میں ایک کمرہ مخصوص کیا۔اراولی کے منیجر جناب راجندر صاحب نے ہمارا استقبال بڑی بے دلی سے کیا۔میں جواہرلال یونیورسٹی کے انتظامیہ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے مہمان خانہ سے وابستہ اسٹاپ کے لئے ایک طرح کا ریفریشر کورس کرائیں تاکہ انہیں مہمانوں سے خوش اخلاقی سے پیش آنے کا طریقہ سیکھنے کا موقع ملے۔

دہلی کا موسم جہنم کی یاد دلانے میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔میں دہلی میں کئی ایک بار جولائی کے مہینے میں رہا ہوں ،لیکن اس طرح کی گرمی دہلی میں آج میں نے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔شاید ہی امسال کے ساون میں دلی کی عورتیں ،''تیری دوٹکیاں دی نوکری میرا لاکھوں کا ساون جائے' گنگنائیں گی جھلسا دینے والی اس گرمی میں کمرے سے باہر نکلنا کسی قیامت سے کم نہ تھا۔اس ماحول میں مجھے حالی کی نظم ''برکھارت'' یاد آرہی تھی۔منظر یہ تھا نہ بارش کے ہی آثار نظر آرہے تھے اور نہ سورج ہی دکھائی دے رہا تھا۔حالانکہ پورا ہندوستان اس وقت آلودگی کے بحران سے گزر رہا ہے۔لیکن ماحولیاتی آلودگی نے بہت بری طرح سے دہلی کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے۔

بہر حال! نہا دو کر کمرے سے باہر نکلا اور پسینہ صاف کرتے کرتے اراولی مہمان خانے سے جواہرلال نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز پہنچا اور شعبہ اردو کا رخ کیا۔لیکن پروفیسر رضا صاحب کے بغیر وہاں پر کوئی بھی استاد اس وقت موجود نہیں تھا۔اساتذہ سے فون پر

بات کرنا چاہا لیکن وہاں پر نیٹ ورک کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ کسی طرح اسی دوران پروفیسر خواجہ اکرام الدین صاحب سے بات ہوئی تو انہوں نے دوسرے دن ملنے کا وقت دیا۔ دوسرے دن پروفیسر خواجہ اکرام الدین صاحب سے ملا۔ لیکن میری بدقسمتی کی انتہا نہ رہی کہ دوسرے اساتذہ صاحبان وہاں موجود نہیں تھے۔ پروفیسر انور پاشا صاحب سے فون ہی پر بات تو ہوئی، لیکن ملنے کا جو وقت انہوں نے دیا اس وقت میں خود مصروفِ عمل تھا۔ خیر! کبھی دوبارہ انشااللہ درس و تدریس کے حوالے سے ملاقات ہو ہی جائے گی۔

12 جولائی کی رات کو میں ''اوبر'' کے ایپ کے ذریعے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے اراولی مہمان خانے سے اندرا گاندھی بین الاقوامی ہوائے اڈے تک ٹیکسی کی جو وقتِ مقررہ سے پہلے ہی اراولی مہمان خانہ پر پہنچی۔ عام طور پر تو ہوتا یہ ہے کہ مسافر کو سواری کا انتظار کرنا پڑتا ہے لیکن یہاں معاملہ کچھ الٹا ہی ہوا۔ یہاں سواری کو ہی مسافر کا انتظار کرنا پڑا۔ اتفاق کے ساتھ ساتھ زمانی مطابقت بھی دیکھئے کہ راستے میں میرے فون کے یوٹیوب ایپ پر بی بی سی اردو سے نشر ہونے والی 'ٹیکنالوجی بلٹن' کی اس خبر نے دستک دی ''کہ 'اوبر' سڑکوں سے اُٹھ کر فضا کی طرف پہنچ گئی ہے۔ 'اوبر' کی پہلی ہیلی کاپٹر پرواز مسافروں کو جے آف کینڈی ہوائی اڈے سے من ہٹن لے کر گئی۔ اس پرواز کا کرایہ تقریباً دوسو (امریکی) ڈالر تھا۔ 'اوبر' مستقبل میں ہیلی کاپٹر کی جگہ بجلی سے چلنے والی خودکار گاڑیوں کا استعمال کرے گی۔'' چلئے اگرچہ ہمارے لئے فضائی گاڑیوں کی امید اور رسائی ممکن نہیں۔ البتہ 'اوبر' اور 'اولا' جیسی بین الاقوامی سطح کی ان کمپنیوں نے ہمیں ایک طرح کا ذہنی سکون یہ فراہم کیا کہ اب ہم کرائے کے لئے گھنٹوں ٹیکسی والے سے جھگڑ کر اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کر رہے ہیں۔

اللہ کے فضل و کرم سے میں تقریباً رات کے نو بج کر تیس منٹ پر دہلی کے اندرا گاندھی بین الاقوامی ہوائی اڈے کے ٹرمنل تین پر پہنچ گیا۔ ٹرمنل تین بین الاقوامی پروازوں کے لئے منتخب ہے۔ حالانکہ میری پرواز کا وقت 13 جولائی 2019ء رات کے 2 بجے کا تھا، جس کے لئے ابھی چار گھنٹے کا وقفہ تھا۔ لیکن اندر داخل ہونے کے فوراً بعد جب میں نے اپنی پرواز کے لئے

جانکاری حاصل کرنی چاہی، تو مجھے معلوم ہوا کہ سامنے ہی سیکشن ''بی'' میں مسافر قطار میں انتظار کر رہے تھے۔ اس کے باوجو میں مختلف کمپنیوں کے ملازمین سے پوچھتا رہا کہ ''مہان'' کی ٹکٹ کہاں سے حاصل کی جاسکتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ملازمین کے ضابطہ لباس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ ملازمین ''مہان'' کے نہیں ہوسکتے۔ اسی دوران سیکشن ''بی'' پر لگی ایک تختی پر نظر پڑی کہ جس پر لکھا ہوا تھا ''مہان ائر'' اور فارسی زبان میں لکھا ہوا تھا ''ہوا پیمائی مہان، ایران''۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا دھوکہ لباس سے ہوا۔ دراصل ہندوستان میں ''ہوا پیمائی مہان'' کے لئے ''ائر انڈیا'' کے ملازمین کام کر رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں جب ہمیں کسی بین الاقوامی ہوائی کمپنی کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہوں، تو ہمیں چاہئے کہ ہم لباس کو اپنا مطمع نظر نہ بنائیں، اس دھوکے سے ہمارا جہاز چھوٹ بھی سکتا ہے۔

بہرحال قطار بہت ہی مختصر تھی اس لئے میرا نمبر جلدی آیا۔ مجھ سے ٹکٹ دینے والے ملازم نے وہی اہم سوالات پوچھے کہ کہیں آپ کے سامان میں 'چارجر'، 'بیٹری'، 'لیپ ٹاپ'، 'سیل فون'، 'پاور بینک'، 'ناریل'، 'اسپرے' وغیرہ تو نہیں۔ میں نے جواب میں اسپرے کے بارے میں کہا ہاں میرے سامان میں 'ڈیوڈرنٹ' شامل ہے، تو اس نے جواب دیا' ٹھیک ہے۔ میرے سامان کے بستے (بیگ) پر پرچی باندھی گئی اور مجھے ٹکٹ دینے کے بعد میرے ساتھ ایک ملازمہ رکھی گئی اور مجھے 'امیگریشن' کی ایک جیسے نہ ختم ہونے والی لمبی قطار میں کھڑا کیا گیا اور متعلقہ ملازمہ دوسری جانب میرا انتظار کر رہی تھی۔ طویل وقت کے بعد جب میری باری آئی تو مجھے وہاں پر مامور 'امیگریشن آفیسر' نے پوچھا کہ آپ ایران کیوں جا رہے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ ایک ثقافتی ورکشاپ میں حصہ لینے کے لئے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ آپ کہاں کام کر رہے ہیں؟ میں نے جواب دیا کشمیر یونیورسٹی، سرینگر میں۔ اس کے بعد ان کا تیسرا سوال یہ تھا کہ آپ کس پوسٹ پر کام کر رہے ہیں؟ تو میں نے جواب دیا 'اسسٹنٹ پروفیسر'۔ آفیسر کا آخری سوال یہ تھا کہ آپ وہاں کیا پڑھا رہے ہیں؟ تو میں جواب دیا ''اردو''۔ اُنہوں نے کاغذات کی جانچ پڑتال کر کے میرے پاسپورٹ پر مہر ثبت کر کے مجھے آگے جانے کو کہا۔ جہاں میرا انتظار 'ائر

انڈیا' کی وہی ملازمہ کر رہی تھی (جو فی الحال 'مہان ائر' کے لئے اپنے فرائض انجام دے رہی تھی)۔انہوں نے مجھے اس کے بعد ایک کمرے کی جانب لیا۔ جہاں امیگریشن کا ایک اور آفیسر کاغذات کی جانچ پڑتال کر رہا تھا۔ یہاں مختصر وقت کے بعد میری باری آئی۔متعلقہ افسر نے بڑی خندہ پیشانی سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور پوچھنے لگے کہ آپ اپنے ساتھ پانچ ہزار ڈالر سے زیادہ کی رقم نہیں لے جاسکتے ہیں۔تو میں نے ہنس کر کہا کہ کیا آپ کو میری حیثیت اتنی معلوم ہوتی ہے۔تو اس نے ہنس کر کاغذات میرے ہاتھ میں دیئے اور مجھے جانے کا مشورہ دیا۔''ائر انڈیا'' سے وابستہ ملازمہ نے مجھ سے کہا اب آپ جاسکتے ہیں۔میں نے اندر جاکر اپنے سینے پر پتھر رکھ کر دوسو پچاس کی کافی کا ایک پیالہ لیا (جس کی قیمت ہوائی اڈے سے باہر زیادہ سے زیادہ پچاس روپیہ کی ہوتی ہے۔) اور اُسے پینے لگا ،اسی دوران کمرہ عبادت میں نماز ادا کی اور بعدازاں بے وجہ دکانوں پر پھرتا رہا۔کچھ وقت ان حجاج کو دیکھنے اوران سے ملاقاتیں کرنے میں بھی گزارا، جو ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے حج کرنے کے لئے جارہے تھےاوران سے دعا کی درخواست بھی کی ، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اندرا گاندھی بین الاقوامی ہوائی اڈہ سے وابستہ عملہ ان کی طرف خاص توجہ دے رہا تھا۔اسی رات ہمارے گاؤں سے وابستہ میرے ایک عزیز ڈاکٹر بشیراحمد ملک اوران کی بیگم بھی حج پر روانہ ہونے والے تھے۔لیکن کافی انتظار کے باوجودان سے وہاں پر ملاقات نہیں ہو پائی' شایدان کی پرواز 14 جولائی کو تھی۔

تقریباًرات کے دو بج کر تیس منٹ کے قریب ہماری بورڈنگ اندرا گاندھی بین الاقوامی ہوائی اڈے کے دروازہ نمبر 9 سے ہونی والی تھی ، کہ اچانک فلائٹ کے کچھ ملازمین ہمارے پاس آکر ہمیں مطلع کرنے لگے کہ ہماری بورڈنگ یہاں کے بجائے اب دروازہ نمبر 7 پر ہوگی اس لئے ہم فوراًوہاں سے اُٹھے اور دوسرے دروازے کی جانب جانے لگے۔ان دو دروازوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔اکثر لوگوں نے جانے کے لئے بجلی پر چلنے والی گاڑیوں کا سہارا لیا۔لیکن میں نے پیدل ہی چلنا مناسب سمجھا۔ایسے میں ہوتا یہ ہے کہ جو مسافر یہ سمجھ کر ادھر ادھر گھومتے رہتے ہیں کہ ہماری بورڈنگ دیئے گئے دروازے پر ہونی والی ہے اور پھر وہ مقررہ وقت پر ٹکٹ پر

دیئے گئے دروازے پر پہنچ جاتے ہیں اور یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں کہ وہاں دروزہ بند ہے اور پھر پریشانی کی حالت میں کبھی ایک اور کبھی دوسری جگہ جاتے ہیں، یہاں تک پھر اسپیکر کے ذریعے یا پھر انہیں فون کے ذریعے مطلع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اکثر غیر ملکی مسافر اسپیکر سے دی جانی والی اطلاع کو سمجھ نہیں پاتے اور اس پر طرہ یہ غیر ملکی مسافرین کے موبائل فون دوسرے ممالک میں کام نہیں کرتے اور جو 'سم کارڈ' وہ اس ملک میں استعمال کرتے ہیں، اکثر ہوائی اڈے پر پہنچ کر اسے یا تو وپس کرتے ہیں یا نکال دیتے ہیں، اس لئے ان حالات میں رابطے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اصل میں مذکورہ ہوائی کمپنی سے وابستہ عملے کو ٹکٹ دیتے وقت یہ طے کرنا چاہئے کہ ہم نے ٹکٹ پر جس دروازے کو منتخب کیا ہے، ہوائی جہاز اسی دروزے پر مسافروں کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ لیکن ایسا بعض اوقات نہیں ہو پاتا، اس طرح کئی ایک مسافروں کو ایسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ طیارہ چھوٹ جاتا ہے۔ اس لئے یہ سمجھ کر کہ یہ برصغیر ہے اور یہاں کچھ بھی ممکن ہوسکتا ہے' بہتر ہے کہ ٹکٹ پر لکھے ہوئے دروازے پر ہی وقت مقررہ سے پہلے پہنچا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دروازہ اچانک تبدیل کیا جائے اور طیارہ چھوٹ جائے۔

رات کے تقریباً 2 بج کر 30 منٹ سے ہماری بورڈنگ شروع ہوئی۔ میری سیٹ کھڑکی کی جانب تھی۔ لیکن اس سیٹ پر ایک کم عمر نوجوان پہلے سے بیٹھے تھے۔ بظاہر وہ ہندوستانی معلوم ہو رہے تھے۔ لیکن انہیں یہ محسوس ہوا کہ میں ایرانی ہوں اور مجھے یہ لگا کہ یہ سیستانی یا پھر جنوبی ایران جیسے بندر عباس کے علاقے سے ہوں گے۔ میں نے انہیں خموشی کی زبان میں کہا کہ یہ سیٹ میری ہے۔ لیکن انہوں نے خموشی کی زبان میں ہی کہا کہ یہ سیٹ ان کی ہے۔ بہر حال خموشی کی اس زبان سے یہ بات سامنے آئی کہ ہم دونوں ہندوستانی ہیں ان کا تعلق اتر پردیش کے کسی علاقے سے تھا۔ مختصر یہ کہ محترم اسی سیٹ پر بیٹھنے کے مشتاق تھے اس لئے میں نے بھی کوئی حجت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں چپ چاپ دوسری سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اُن کے بھائی ایران کے کسی مدرسے میں پڑھائی کر رہے تھے اور یہ انہیں ملنے والے تھے۔ اُنہوں نے مجھے کچھ

تجاویز (tips) دیں، جوان کے بھائی نے انہیں دی تھیں۔ جیسے کہ اکثر ہندوستانی ایران کے سفر کے دوران ''ویج'' کھاتے ہیں۔ اس لئے کھانا لیتے وقت ہمیں کھانے میں ''مرغ'' مانگنا چاہئے۔ ہوا یہ کہ جہاز سے وابستہ عملے کی خوبصورت لڑکی نے مجھے خود بخود ''نان ویج'' دیا اور ان سے پوچھا کہ آپ کیا کھانا چاہتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب میں کہا ''مرغ''۔ حالانکہ میں نے ابھی کھانا نہیں کھولا تھا۔ لیکن ان کے کھانے کی ظاہری صورت سے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے بھی ایسی ہی غذا دی گئی ہے۔

طیارے کی نشست پر بیٹھنے کے بعد جب میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے میں جنت کے سفر پر رواں دواں ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں یہ لکھنے جا رہا ہوں کہ طیارہ بین لاقوامی معیار کا حامل تھا۔ اس کی نشستیں اور دیگر چیزیں بہترین تھیں وغیرہ وغیرہ، یہ سب چیزیں تو ہر کسی بین الاقوامی سطح کے طیارے میں تو ہوتی ہی ہیں۔ لیکن یہاں بات دوسری تھی۔ وہ یہ کہ میرا دھیان آج سے تقریباً ایک سال قبل ''بی بی سی، لندن'' کی اردو نشریات سے نشر ہونی والی اس خبر کی طرف گیا، جس میں یہ انوکھی خبر سنائی گئی کہ تہران سے ایک طیارہ انڈونیشیاء یا پھر ملیشیاء جا رہا تھا جس میں مختلف مسافروں کے ساتھ ساتھ ایک میاں بیوی بھی سفر کر رہے تھے۔ دونوں ہنسی خوشی سفر کر رہے تھے کہ اچانک شوہر کو نیند آ گئی اور وہ سو گئے۔ چونکہ بیوی سو نہیں پا رہی تھی وہ اپنے شوہر سے بات چیت کرتی لیکن انہیں آرام آ گیا تھا۔ آخر کار جب وہ تنگ آ گئی تو بیوی کی نظر اپنے شوہر کے ہاتھ کی طرف گئی تو انہوں نے پایا کہ اس کا موبائل فون اس کے ہاتھ میں تھا۔ بیوی نے فوراً اپنے شوہر کا موبائل فون اٹھایا اور شوہر کی انگلیوں کی مدد سے اسے کھولنے میں کامیاب بھی ہوئی۔ اس نے موبائل کیا کھولا کہ اس کے شوہر کا ''پنڈورا بکس'' کھل گیا۔ بات سامنے یہ آئی کہ وہ کسی اور کے عشق میں گرفتار تھا۔ بات کھلتے ہی بیوی نے ایسا تماشا شروع کیا کہ پورے جہاز میں ہڑبڑی پھیل گئی۔ لڑائی اس قدر بڑھ گئی کہ جہاز کا تمام عملہ مذکورہ عورت کو چپ نہ کرا سکا، آخر کار عملے نے ''ایمرجنسی لینڈنگ'' کا فیصلہ کیا۔ اس طرح طیارے کو ہندوستان کے چنئی ہوائی اڈے پر اتارا گیا۔ جہاں پر میاں بیوی کو طیارے سے باہر نکالا گیا اور

ان کی مشاورت کی گئی۔

حالانکہ طیارے کا سفر 3 گھنٹے اور 30 منٹ کا ہوتا، اگر یہ طیارہ مقررہ ہوائی راستے کو اختیار کرتا جو کہ ہندوستان کے اندرا گاندھی بین الاقوامی ہوائی اڈے سے نکلنے کے بعد پاکستان اور افغانستان کی فضائی حدود سے ہوتا ہوا ایران کے مختلف علاقوں سے گزرتا ہوا تہران پہنچتا۔لیکن ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کے بموجب ہندوستان اور پاکستان نے ایک دوسرے کی فضائی حدود سے گزرنے پر پابندی عاید کردی تھی اس لئے اس طیارہ ہندوستان کے اندرا گاندھی بین الاقوامی ہوائی اڈے سے پرواز بھرنے کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے گجرات کے مغربی ساحل سے بحرعرب کے راستے کو اختیار کرتے ہوئے عمان کے ساحلی علاقوں سے گزرتا ہوا چہار بہار یا پھر بندر عباس سے ایران کی فضائی حدود میں داخل ہوا اور ایران کے مختلف علاقوں سے گزرتا ہوا تہران کے آیت اللہ خمینی ہوائی اڈے پر اُترا۔یہ طویل سفر قریباً 6 گھنٹے کا رہا۔لیکن طیارے کی اندرونی فضا نے بیرونی فضا کی مسافت کو محسوس نہیں ہونے دیا۔

طیارے میں مختلف مذاہب سے وابستہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔میرے آس پاس سکھ مذہب سے وابستہ ایک بڑی تعداد نظر آرہی تھی۔ چونکہ سکھ عورتوں کو الگ سے نہیں پہچانا جاسکتا ہے، اس لئے ہوسکتا ہے اُن کے ساتھ سکھ عورتیں بھی ہوں۔اس کے علاوہ طیارے میں ایسے افراد بھی موجود تھے جن کے لباس سے یہ معلوم ہورہا تھا کہ یہ لوگ ایران کی بجائے کسی اور ملک جانے والے ہوں۔طیارے سے اترتے وقت ہی یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ''روس'' جارہے ہیں۔ لیکن جو سکھ مذاہب لوگ تھے وہ سب ایران میں ہی اُترے۔ایک سکھ نوجوان جس کا تعلق لدھیانہ سے تھا۔جب اُسے میں نے پوچھا کہ کیا آپ سیاحت کی غرض سے ایران آئے ہیں؟ تو اُس نے جواب دیا کہ ہمارا یہاں تہران میں کاروبار ہے اور ہم یہی رہتے ہیں۔

طیارے سے اترتے ہی باہر اس طیارے اور ہوائی اڈے سے وابستہ عملہ مسافروں کا استقبال کرنے کے ساتھ ساتھ اُنہیں یہ بھی سمجھا رہا تھا کہ آپ کو کس طرح اور کہاں سے جانا ہو

گا۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ آپ ایران کے محکمہ ''امیگریشن'' کے پاس جائیں، جہاں پر غیر ملکیوں کے لئے مخصوص کاؤنٹرس (Counters) تھے۔ مختصر وقت تک لائن میں رہنے کے بعد میں ایک کاؤنٹر پر ایک آفیسر کے پاس پہنچا۔ اُس نے میرے پاسپورٹ کو اسکین کیا اور میرے ویزا سے متعلق تمام معلومات آفیسر کے بالمقابل کمپوٹر کے پردے پر نمودار ہوئی۔ میرے پاسپورٹ پر ایران کی امیگریشن نے کوئی مہر ثبت نہیں کی بلکہ ہندوستان میں ایرانی سفارت خانے نے بھی میرے پاسپورٹ پر کوئی مہر ثبت نہیں کی تھی بلکہ میرے حق میں ''ای۔ ویزا'' جاری کیا گیا۔ ایران کے سفارت خانے نے ویزا کی یہ سہولیات براہ راست (Online) مہیا رکھی ہے۔ اس لئے ہوائی اڈے یا پھر سفارت خانے سے وابستہ عملہ پاسپورٹ پر مہر یا دیگر کوئی بھی نشان چسپاں نہیں کرتے ہیں۔ اس کی ایک اور دلیل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ امریکہ اور ایران کے درمیان ایک طرح کی سرد جنگ اس وقت جاری ہے۔ ایسے میں یہ ہو رہا ہے کہ جو لوگ ایران جاتے ہیں ،انہیں پھر امریکہ کا ویزا ملنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایران کا سفارتی نظام مسافروں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں کل امریکہ جانے میں دشواری پیش آئے۔ اس بات کے پیش نظر ایران نے براہ راست سہولیات کو ہی ترجی دی ہے جو ایک بہتر طریقہ کار بھی ہے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے اگر کوئی شخص ایران جائے اور دوسرے ملک کو یہ سفری جانکاری نہ ہو۔

یہاں میں ویزا کے سلسلے میں یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ اگر آپ کسی یونیورسٹی یا دیگر کسی تعلیمی پروگرام کے لئے ایران جا رہے ہوں، تو ایسے میں آپ کو چاہئے کہ آپ خود ایرانی سفارت خانے جائیں یا پھر براہ راست سفارت خانے کی ویب گاہ پر رابطہ قائم کریں اور اُنہیں دانشگاہ کا دعوت نامہ اور دیگر لازمی دستاویز دکھا کر وہاں سے تدریسی (Academic) ویزا حاصل کریں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم جلدی میں اور پریشانیوں سے بچنے کے لئے ویزا حاصل کرنے کے لئے کسی ایجنسی کے ذریعے ایرانی سفارت خانے سے بلاواسطہ (Indirectly) ویزا حاصل کرتے ہیں اور یہ ایجنسیاں سفارت خانے کو ضروری دستاویز دکھانے کی بجائے وہاں سے آسان طریقے سے ''زیارت ویزا'' حاصل کرتے ہیں۔

جس سے بعد میں اکثر اوقات درس و تدریس کے حوالے سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں یہاں پر یہ بات باور کرانا چاہتا ہوں کہ ایران میں ہندوستان کی مانند یونیورسٹیوں میں جانا آسان کام نہیں بلکہ وہاں کے قانون کے مطابق یونیورسٹیوں میں جانے کے لئے ایران کی وزارت داخلہ یا پھر یونیورسٹی کی اعلیٰ انتظامیہ سے صداقت نامہ (clearance) حاصل کرنا پڑتی ہے، جو ایک مشکل عمل ہے اور اگر اس سلسلے میں آپ کے پاس ''زیارت ویزا'' ہو تو آپ کو یہ صداقت نامہ (Clearance) کی صورت میں جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ اس طرح آپ کسی بھی دانش گاہ کا دورہ نہیں کر سکتے ہیں۔

امیگریشن کے بعد میں اپنا سامان لینے کے لئے گیا۔ جب تک سامان آجاتا، میں یہ چاہ رہا تھا کہ میں ہوائی اڈے سے باہر میرا انتظار کر رہے ایک کشمیری طالب علم ''جناب امتیاز احمد نجار''، جس کا تعلق میرے ہی ضلع بانڈی پورہ کے سمبل علاقے سے ہے، سے بذریعہ فون رابطہ قائم کر سکوں۔ جس سے میں نے پہلے ہی رابطہ کیا تھا۔ وہاں پر میں نے پہلے ایک ایسے شخص سے فون مانگنا چاہا جو کہ ہندوستان سے میرے ساتھ تھا اور بار بار ہم ایک دوسرے کو دیکھتے بھی تھے۔ جیسے ایک دوسرے سے شناسا ہوں۔ لیکن اُس نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ میری بات ان سنی کر دی۔ پھر میں نے دوسرے ایک نوجوان شخص سے فون مانگا، تو اُس نے اپنے پاس بیٹھے ایک عمر رسیدہ شخص سے فون لیا اور جناب امتیاز احمد نجار کا نمبر ملایا۔ میری بات امتیاز احمد سے ہوئی۔ جوں ہی میں نے باہر کی طرف نظر دوڑائی مجھے شفاف شیشوں کے دوسری طرف امتیاز صاحب نظر آئے۔ ہم نے ایک دوسرے کا پہلا تعارف ہاتھوں کے اشاروں سے کیا۔

سامان حاصل کرنے کے بعد میں باہر آیا۔ باہر امتیاز احمد نجار صاحب میرا انتظار کر رہے تھے۔ پہلے ہم دونوں گلے ملے اور ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھی۔ تہران کے آیت اللہ خمینی ہوائی اڈے کے باہر امتیاز صاحب کے ذریعے لائی گئی ٹیکسی میرا انتظار کر رہی تھی۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھے اور قم کی طرف روانہ ہوئے جو تہران کے آیت اللہ خمینی ہوائی اڈے سے تقریباً 120 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ صبح کا وقت تھا راستے پر گاڑی اس طرح سے دوڑ رہی تھی جیسے رن وے پر ہوائی جہاز دوڑ رہا ہو۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ٹیکسی میں سو جاؤں۔ لیکن باہر کے خوبصورت مناظر

نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ سڑک کے دونوں اطراف دور دور تک صاف دکھائی دے رہے تھے۔ کئی میدانی علاقے اور کئی چھوٹے چھوٹے ٹیلے، جن پہ کسی کسی جگہ جھاڑیاں، کئی ایک جگہ چھوٹے چھوٹے درخت، دور کئی دریا یا جھیل جیسا منظر۔ یہ سب ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میدان اور ریگستان کی آمیزش سے قدرت نے ایک نئی ہی دنیا آباد کی ہو۔ مکمل ایک گھنٹے میں ہم نے 120 کلومیٹر کی مسافت طے کی اور اس طرح ہم قم پہنچ گئے۔ میں سمجھ رہا تھا شاید یہ سرینگر سے بانڈی پورہ کا راستہ ہوگا۔ جہاں 60 کلومیٹر طے کرنے میں کم از کم دو گھنٹے لگتے ہیں۔ میں حیران رہ گیا جب امتیاز صاحب نے کہا کہ اُتر جایئے ہم قم پہنچ گئے۔ میں ایک بار پھر سوچنے لگا۔ شاید انہوں نے راستے میں ناشتے کے لئے گاڑی روک دی ہو۔ لیکن جب مجھ سے کہا گیا کہ سامان بھی اُتارنا ہے۔ ہم اب قم پہنچ چکے ہیں۔ ایک گھنٹے میں ہندوستان کی سڑکوں پر ایسی مسافت طے کرنا میری نظر میں ممکن نہیں۔

اب میرے لئے ایک اور چونکا دینے والا واقعہ پیش آیا، وہ یہ کہ میں نے امتیاز صاحب سے کہا کرایہ کے لئے کتنی رقم ادا کرنی ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ میں نے کرایہ ادا کر دیا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے کتنا کرایہ ادا کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا ہندوستان کے 550 روپیہ۔ یہ میرے لئے حیران کن بات تھی۔ کیونکہ بانڈی پورہ سے سرینگر اگر ہم ٹیکسی میں جائیں گے تو ہمیں ایک طرف کا کرایہ تقریباً 1300 سو روپیہ ادا کرنا پڑے گا، جبکہ مسافت 60 کلومیٹر سے بھی کم ہے۔ اس پہ طرہ یہ کہ امریکی پابندیوں کے بموجب ایران میں کرنسی کی قیمت میں کافی گراوٹ آئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایرانی حکومت نے قیمتوں کو اعتدال میں رکھا ہے۔ یہاں ان حالات میں بھی قیمتیں آسمان کو چھونے کی بجائے ہندوستان کے مقابلے میں مناسب سے بھی کم تر ہے جو ایک بہتر حکمت عملی کا نتیجہ ہو سکتا ہے، جسے ان دشوار حالات میں بھی عوام خوش حال زندگی بسر کر رہی ہے۔

امتیاز صاحب الحکمہ کی اقامت گاہ کی بجائے مجھے اپنی اقامت گاہ لے گئے جو الحکمہ سے کافی قریب ہے۔ یہ اقامت گاہ ''امام خمینی ایجوکیشنل کمپلیکس'' جہاں غیر ملکی طلبہ کو خصوصیت کے ساتھ تعلیم فراہم کی جاتی ہے، اس کی اقامت گاہ میں تین طالب علم تھے جن کا تعلق مختلف

ممالک سے تھا۔ ان میں سے ایک کا تعلق پاکستان سے تھا۔ اس لئے انہوں نے مجھ سے اردو میں بات چیت کی۔ دوسرا طالب علم جو چین سے تعلق رکھتا تھا، اس وقت سو رہا تھا۔ امتیاز صاحب نے پاکستان کے اسی طالب علم کو روٹی لانے کے لئے باہر بھیجا، جب تک کہ وہ روٹی لاتا' امتیاز صاحب نے چائے بنانی شروع کی۔ میں امتیاز صاحب کے بیڈ پر کیا بیٹھا کہ مجھے یوں نیند آئی کہ انہوں نے مجھے آخر کار دوپہر کے بارہ بجے کے قریب جگایا۔ چائے اور ایک بڑی روٹی سامنے انتظار کر رہی تھی۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا اور بنا دودھ کے چائے پینی شروع کی جو مجھے بعد میں اسی طرز پر اگلے ایک مہینے تک پینی پڑی۔ روٹی بہت ہی لذیذ تھی اور اس میں ایسی شکم سیری تھی کہ ساری بھوک مٹ گئی۔ میں نے دوائی لے لی۔ اس کے بعد تقریباً ایک بجے کے قریب اسی کمرے میں نماز ادا کی اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ اب ہم آپ کو الحکمہ کی اقامت گاہ لے جائیں گے۔ انہوں نے میرا سامان اُٹھایا، اس سے پہلے یہ سامان اٹھاتے چونکہ یہ اردو جانتے تھے اس لئے میں نے انہیں اپنی تازہ تصنیف "اقبال: معروضی تجزیئے اور سائنسی مباحث" دی، تا کہ اگر انہیں وقت ملے تو اس کا مطالعہ کریں۔ انہوں نے خوشی خوشی میری کتاب قبول فرمائی۔ میں نے مختصراً اپنی کتاب کا تعارف پیش کیا تا کہ یہ کتاب کی افادیت سے واقفیت حاصل کریں۔ اس کے بعد انہوں نے میرا سامان اُٹھایا اور نیچے دو موٹر سائیکلوں پر سوار ہوئے۔ لیکن انہوں نے ہیلمٹ (helmet) نہیں پہنی۔ یہ بات میں نے اکثر جگہ دیکھی کہ ایران میں جہاں آمد رفت کے قوانین سخت ترین ہیں، وہیں لوگ موٹر سائیکلوں پر چلتے وقت ہیلمٹ نہیں پہنتے ہیں۔ موٹر سائیکلوں پر بیٹھنے کے دو منٹ میں ہی ہم الحکمہ پہنچ گئے۔

''موسستہ الحکمہ'' پہنچتے ہی پہلے میرا اندراج کیا گیا اور میرا پاسپورٹ ادارے کے عہدے داروں نے اپنے پاس سنبھال کے رکھا۔ ادارے میں داخل ہوتے ہی دروازہ خودکار انداز میں خود بخود کھل گیا اور مجھے اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا۔ سامنے دونوں جانب ادارے سے وابستہ اور باقی ماندہ کتابیں رکھی گئی تھیں۔ ان میں چند ایک اردو زبان میں لکھی گئی تھی۔ کچھ کتابوں کے بارے میں لکھا گیا تھا کہ انہیں آپ مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس حصے کو

بڑی ہی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا اور سامنے سیڑیوں کی دوسری اور الماریوں میں بھی نمائش کے لئے کچھ کتابیں رکھی گئی تھیں ان میں بھی اردو زبان میں لکھی گئی کچھ کتابیں نظر آرہی تھیں جن میں خصوصیت کے ساتھ ''تحریف قرآن کے بطلان کا جائزہ''، ''دعا کے آداب''، ''اطلاقِ معاشرت''، ''اسلام میں خانوادہ'' وغیرہ شامل تھیں۔ پہلی منزل میں ادارے سے وابستہ مختلف شعبوں کے دفاتر کام کررہے تھے۔

ادارے کی بالائی منزل میں جو کہ شرکاء کی رہائش کے لئے مختص رکھی گئی ہے، اس منزل میں مجھے کمرہ نمبر 407 دیا گیا۔ میں لفٹ کے ذریعے بنیادی منزل سے تیسری منزل تک پہنچا اور دیئے گئے کمرے کا دروازہ ساتھ میں آئے ملازم نے کھولا، میرا سامان اندر رکھ کر کمرے کی چابی میرے حوالے کی۔ اس کمرے میں تین لوگوں کے رہنے کی گنجائش تھی۔ کیونکہ اس میں تین بستر ے لگے ہوئے تھے۔ دو بستر ے ایک ساتھ ایک دوسرے کے اوپر اور ایک بسترہ دوسری جانب الگ سے۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو اس میں صرف دو لوگوں کے رہنے کی بہتر گنجائش تھی۔ پڑھنے کے لئے ایک ٹیبل اور کرسی جس پر لیپ ٹاپ وغیرہ رکھ سکتے تھے۔ کپڑے رکھنے کے لئے دو الماریاں موجود تھیں۔ ان الماریوں میں ہینگر بھی رکھے گئے تھے تاکہ کپڑے سلیقے سے رکھے جائیں۔ فی الحال میں پہلا شخص تھا جسے یہ کمرہ دیا گیا تھا۔ کمرے تک پہنچانے والے ملازم نے فارسی زبان میں مجھے یہ بتانے کی کوشش کی کہ اس وقت دوپہر کا کھانے کا وقت ہے اور آپ بھی جاکر کھالیجئے۔ کسی حد تک میں اس بات کو سمجھ پایا باقی بات ساتھ میں امتیاز صاحب نے سمجھائی۔ امتیاز صاحب پچھلے سات سال سے المصطفیٰ بین الاقوامی یونیورسٹی کے غیر ملکی طالب علموں کے شعبے ''امام خمینی ایجوکیشنل کمپلیکس'' سے تاریخ میں تعلیم حاصل کررہے ہیں اور فارسی اسی طرح سمجھتے اور بولتے ہیں جس طرح ایک مقامی ایرانی۔

اب ہم واپس لفٹ کے ذریعے بنیادی منزل تک پہنچے اور دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے اس منزل کی آخری حد تک چلتے گئے اور سیڑھیوں کے ذریعے زیرِ زمین والی منزل تک پہنچے جہاں پر پہلے دائیں جانب عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ نماز خانہ موجود تھا۔ لیکن بیت الخلا اور

غسل خانہ ایک ہی تھا، جس پر مردانہ یا زنانہ نہیں لکھا ہوا تھا۔اس کے بالمقابل دائیں جانب کتب خانہ اور داخلی کھیل کود (Indoor Games) کی سہولیات کے لئے دو کمرے مختص رکھے گئے ہیں اور باہر ٹیبل ٹینس کا ایک بڑا میز کھیلنے کے لئے رکھا گیا ہے۔کھانا کھانے کے ایک بڑے ہال سے پہلے، کچن اور کھانا وغیرہ ذخیرہ کرنے کے لئے ایک بڑا کمرہ موجود ہے۔اس ہال میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب پہلے ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے جو اس وقت کھلی تھی، اس کھڑکی سے دیکھا تو سامنے ایک بڑا کشادہ کمرہ نظر آیا۔لیکن اس کمرے کی آمد ورفت دوسری جانب سے ہے، جس کا تعلق الحکمہ سے نہیں بلکہ ''امام خمینی ایجوکیشنل کمپلیکس'' سے ہے۔اس میں ایک درزی کپڑے سیتا نظر آ رہا تھا۔وہاں پر طلباء کے لئے سستے داموں کپڑے اور دیگر ملبوسات دستیاب تھے۔پرانے کپڑوں کو بھی مناسب سے بھی کم قیمت پر ٹھیک کرایا جا سکتا تھا۔درزی بہت ہی خلیق تھا اور خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا۔

کھانے کے اس بڑے ہال کے دائیں جانب پیچھے کی طرف ایک بڑا باورچی خانہ (Standing Kitchen) جس میں ہر طرح کی جدید سہولیات موجود ہیں۔اس باورچی خانے میں صرف ایک ہی فرد بڑی خوش اسلوبی اور سلیقے سے کام کر رہا تھا۔کچن کے باہر ایک فریج رکھا گیا تھا جس میں مشروبات وغیرہ رکھی گئی تھیں اور ان پر قیمتیں درج تھیں تا کہ جو شخص کھانے کے علاوہ انہیں پینا چاہئے، وہ پیسے ادا کر کے خرید سکتا ہے۔کچن کے سامنے اس بڑے ہال میں چلنے پھرنے کے لئے ایک کھلی جگہ مختص رکھی گئی تھی اور اس کے بعد اس ہال کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا تھا۔دونوں جانب کھانا کھانے کے لئے کرسیاں اور میز بڑے سلیقے سے رکھے گئے تھے۔ایک حصہ عورتوں کے لئے مختص رکھا گیا تھا اور ایک مردوں کے لئے۔کبھی کبھار مرد اور خواتین ایک ساتھ بھی کھانا کھاتے تھے۔ہال کے آخر پر ایک اور کھڑکی نظر آ رہی تھی۔میں جب اس جانب گیا تو دیکھا وہ حصہ بھی آمد ورفت کے لحاظ سے 'الحکمہ' سے جڑا ہوا نہیں تھا بلکہ وہ بھی ''امام خمینی ایجوکیشنل کمپلیکس'' سے جڑا تھا۔یہ حصہ بہت ہی کشادہ تھا۔اس حصے میں کپڑے دھونے کی سہولیات موجود تھیں جو کہ کپڑے دھونے کی جدید اور بڑی بڑی مشینوں سے آراستہ تھا۔یوں

محسوس ہو رہا تھا کہ شاید کپڑے دھونے سے لے کر استری کرنے کی تمام خدمات مشینوں کے ذریعے ہی لی جاتی ہیں۔ اس میں ایک بزرگ شخص کام کر رہا تھا، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ وہ خود کپڑوں کی دھلائی تو نہیں کر سکتا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں پر کپڑے دھونے کی قیمت مناسب ہے۔ حالانکہ مہمانوں کو یہاں پر کپڑے دھونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ مہمان خانے کے غسل خانے میں ایک جدید طرز کی بہترین کپڑے دھونے کی مشین لگی ہوئی ہے جس کے ذریعے بڑے آرام سے خود کار طریقہ پر کپڑے دھوئے جا سکتے تھے اور ساتھ میں وہاں پر صابن بھی مہیا رکھا گیا تھا، تا کہ مہمان اپنے کپڑے آرام سے دھو سکیں۔ پھر بھی ہم نے قیمت اور کپڑوں کی دھلائی کے معیار کی جانکاری اور استری کو مدنظر رکھتے ہوئے ادارے کے اس دھوبی خانے سے اپنے کپڑے دھلوائے۔ میں نے جموں وکشمیر، حیدر آباد، دہلی، پنجاب، بنگلور اور جے پور وغیرہ سے کئی بار اپنے کپڑے دھوبیوں سے دھلوائے ہیں۔ قیمت اِن شہروں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھی اور دھلائی کا معیار اور پیکنگ بھی مناسب۔

یہاں پر کھانے کا طریقہ یہ تھا کہ کھانے والا اپنی مرضی کے مطابق پلیٹ میں کھانا اٹھا کر کھائے۔ [بوفے طریقہ کار]۔ کھانے میں کاٹے ہوئے کھیرے اور ٹماٹر، ایک قسم کا رس دار سالن جس میں پسی ہوئی چند ایک سبزیاں، پیاز، کچھ مسالے، پسا ہوا چاول، دال، چھوٹے چھوٹے مرغ کے گوشت کے ٹکڑے، اسے وہاں ''آب گوشت'' کہا جاتا ہے۔ ساتھ میں دہی، سیب وغیرہ کے ساتھ ساتھ چاول اور روٹی بھی شامل تھی۔ میں نے چاول کو چھوڑ کر سب میں سے تھوڑا تھوڑا اپنی پلیٹ میں رکھ دیا اور آب گوشت کو ایک چھوٹے سے کٹورے میں رکھ کر ایک کشادہ میز کی طرف چل دیا۔ جوں ہی میں نے کھانا شروع کیا میری نظر سامنے دیوار پر چسپاں ایک تختی کی طرف گئی جس میں فارسی، عربی، انگریزی اور اردو زبانوں میں کھانا کھانے کے آداب درج تھے، کہ اسلام میں کھانا کھانے کا کیا طریقہ کار ہے اور کھانا کیسا ہونا چاہئے وغیرہ۔

میں کھانا کھانے کے بعد پروگرام کورڈینیٹر پروفیسر مدحی کے کمرے میں گیا۔ چونکہ انہی کے ذریعے ہمیں دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ اس لئے یہ فرض بھی بنتا تھا کہ ان کا شکریہ ادا کیا

جائے۔ پروفیسر مدحی مجھ دیکھ کر نہایت خوش ہوئے، مجھے گلے لگایا اور میری خیر و عافیت پوچھی۔ وہ ایک نیک انسان ہیں اور ہر شخص سے خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مصروفیت کے باوجود میرے لئے کافی وقت نکالا اور مجھ سے میرے سفر، درس و تدریس اور کشمیری تہذیب و ثقافت کے تعلق سے گفتگو کی۔ میں نے بھی ان سے دورانِ گفتگو کئی ایک سوالات پوچھے، خاص کر المصطفیٰ بین الاقوامی یونیورسٹی اور اس کے ذیلی ادارے الحکمہ سے متعلق، جس کا جواب انہوں نے بڑی خوبصورتی سے دیا۔ وہ الحکمہ میں جہاں خارجی امور کے کورڈینیٹر ہیں، وہیں وہ حدیث کے بھی پروفیسر ہیں اور تاریخ حدیث پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

پروفیسر مدحی سے ملنے کے بعد میں اپنے کمرے کی جانب گیا۔ ایک بار پھر لفٹ کے ذریعے تیسری منزل تک گیا۔ لفٹ میں مجھے اپنا ادارہ، نظامتِ فاصلاتی تعلیم، کشمیر یونیورسٹی یاد آیا جو اتنا بڑا تو نہیں البتہ کئی ایک اعتبار سے اس ادارے سے مناسبت رکھتا ہے۔ لیکن اس میں لفٹ کی سہولیات دستیاب نہیں اور اب ہمارے ادراے کا ایک اور حصہ 'نیو ایجوکیشنل بلاک' کے بالائی منزل میں ہے، جہاں تک پہنچتے پہنچتے تندرست و توانا شخص کی سانس پھول جاتی ہے' معذور افراد کی تو بات ہی نہیں۔ اس میں بھی لفٹ کی سہولیات ندارد۔ کشمیر یونیورسٹی میں اب نئی تعمیرات میں بھی لفٹ کی سہولیات دستیاب نہیں رکھی گئی ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ بجلی کی عدم دستیابی ہو سکتی ہے۔ میں ایران میں، جہاں بھی گیا اور جب تک رہا بجلی ہر جگہ اور ہر وقت دستیاب تھی۔

بہرکیف اب کی بار راقم گرد و پیش کی ایک ایک چیز پر غور کرنے لگا۔ تیسری منزل پر پہنچ کر جوں ہی میں لفٹ سے باہر نکلا تو سامنے دائیں جانب پانی پینے کی ایک جدید مشین تھی۔ اس مشین سے جہاں نلکے سے پانی نکال کر گلاس کے ذریعے پی سکتے تھے، وہیں اس مشین کے ساتھ ایک ایسا آلہ بھی لگا ہوا تھا جسے ہاتھ میں پکڑ کر اس میں ایک چھوٹی سی نلکی پیوست کر کے آسانی سے پانی پیا جا سکتا تھا اور پانی پینے کے بعد نلکی پھینک دی جاتی تھی اور سامنے ہی پانی پینے کے ہدایات فارسی زبان میں تصویروں کے ذریعے بھی سمجھائی گئی تھیں۔ حالانکہ یہ باتیں لکھنا لازمی نہیں، باور یہ بات کرانی ہے کہ اہل فارس چھوٹی چھوٹی چیزوں پر کس قدر دھیان دیتے ہیں اور

صفائی ستھرائی کا کس قدر خیال رکھتے ہیں۔

کمرے میں جانے سے پہلے میں پانی پی کر غسل خانے کے اندر چلا گیا۔ اس غسل خانے کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا تھا، ایک حصے میں بیت الخلا اور بیت الخلا کے دروازہ پر ایک پلاسٹک پردہ لگا ہوا تھا۔ (یہ طریقہ کار ایران میں ہر جگہ نظر آئے گا) بیت الخلا کے باہر بالکل سامنے ہی ہاتھ دھونے کے لئے ''واش بیسن'' ہر ایک واش بیسن کے ساتھ سیال صابن کا ڈبہ۔ (یہ بات بھی آپ کو بتاتا چلوں کہ ایران کے ہر غسل خانے یا بیت الخلا میں سیال صابن کا ڈبہ موجود ملے گا) دوسری طرف نہانے کے لئے تین چھوٹے کمرے۔ یہ تینوں غسل خانے دو حصوں میں بانٹ دیئے گئے تھے، تاکہ ایک طرف کپڑے رکھے جائیں اور دوسرا کمرہ جو اس سے قدرے کشادہ تھا اس میں نہایا جائے اور نہانے کے بعد اس والے کمرے میں واپس آکر کپڑے بدلے جاسکیں۔ ان دو کمروں کے درمیان دروازہ بھی تھا، تاکہ انسان مطمئن رہے کہ نہانے کے دوران کپڑوں پر پانی کے چھینٹے نہ آئیں، حالانکہ اگر دروازہ کھلا بھی رکھا جائے، تب بھی پانی کے چھینٹے وہاں تک پہنچ نہیں سکتے تھے۔ غسل خانے اور بیت الخلا کے درمیان ایک کشادہ جگہ تھی جس میں کپڑے دھونے کی ایک خودکار جدید مشین رکھی گئی تھی اور اس کے اوپر کپڑے دھونے کی صابن پاوڈر کی شکل میں جس کا نام ''سپیدہ۔۵'' تھا، رکھا گیا تھا۔ اسی غسل خانے کے ایک طرف وضو کرنے کے لئے الگ سے مناسب انتظام تھا۔ یہاں سفید ماربل کے پتھر کی ایک نشست بنائی گئی تھی جس پر بیٹھ کر بہ آسانی وضو کیا جاسکتا تھا۔

بیت الخلا کے حصے کی طرف اوپر موٹے کاغذ کی ایک پرت دار ورق سازی (Laminated) تختی نصب کی گئی تھی جس پر فارسی، عربی، انگریزی اور اردو زبانوں میں بیت الخلا جانے کے اسلامی آداب درج کئے گئے تھے۔

اس طرز عمل نے مجھے پہلے ہی دن سے بہت متاثر کیا۔ تمام ایران جہاں جہاں بھی میں گیا وہاں پر میں نے پانی کو بیت الخلا میں استعمال کرنے کا ایک ہی طریقہ پایا۔ کسی بھی جگہ میں نے طہارت (استنجا) کے لئے جگ یا کسی برتن کو نہیں پایا بلکہ ہر جگہ طہارت کے لئے ایک مخصوص

نظام پایا اور وہ طریقہ نلکی کا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سرد گرم پانی کے لئے بھی الگ الگ نلکے نہیں لگے ہوئے ہیں بلکہ ایک ہی نلکے کو مختلف سمتوں میں گمانے کے ذریعے آپ سرد، گرم یا پھر نیم گرم پانی حاصل کر سکتے ہیں۔

میرے کمرے کے ساتھ ہی باہر درمیان میں ایک چھوٹا سا کچن بھی تھا، جس میں ضروریات کے برتن رکھے ہوئے تھے اور اس کچن میں نلکے سے مہیا گیس کی سہولت بھی دستیاب تھی۔ یہاں میں یہ بات بھی لکھنا چاہتا ہوں کہ ایران میں، جہاں بھی میں گیا وہاں نلکے کے ذریعے گیس کی سہولت دستیاب ہے۔ چاہے وہ سب سے دور دراز کا گاؤں ہی کیوں نہ ہو اور ہم جن مہمان خانوں میں مختلف علاقوں میں رہے، ہر ایک مہمان خانے میں کچن کی سہولیت میسر تھی اور ان میں جب تک ہم رہے، ہفتے میں سات دن اور چوبیس گھنٹے پانی، بجلی اور پائپ سے گیس کی سہولیات بھی دستیاب تھیں۔ بہر حال مہمان خانے کے اس کچن میں سامنے چائے کے پاکٹس رکھے ہوئے تھے تاکہ جب مہمان چاہے چائے پی سکے۔ برتنوں کو صاف کرنے کے لئے بھی تمام چیزیں جیسے برتنوں کا صابن، ساتھ میں (Wash Basin)۔ حالانکہ میں ہندوستان میں بھی مختلف یونیورسٹیوں کے مہمان خانوں میں گیا ہوں لیکن کسی بھی جگہ ایسی سہولیات دستیاب نہیں، دراصل یہ اس قوم کی تہذیب کا ایک حصہ ہے۔

اب میں اپنے کمرے میں واپس پہنچا یہ سوچ کر کہ تھوڑی دیر آرام کیا جائے کیونکہ تھکاوٹ سے سارے بدن میں ایک ہلکا سا درد محسوس ہو رہا تھا۔ جب میں اپنے بستر پر بیٹھنے لگا اچانک میری نظر سامنے دیوار پہ آویزاں ایک اور پرت دار کاغذ کی تختی کی طرف گئی، یہ تختی بھی بالکل انہی تختیوں جیسی تھی جو نیچے ڈائننگ ہال اور باہر بیت الخلا میں چسپاں تھیں۔ میں اٹھ کر اس تختی کی طرف بڑھا۔ اس تختی پر بھی فارسی، عربی، انگریزی اور اردو زبانوں میں سونے کے آداب درج تھے۔ سونے سے پہلے کیا طریقہ اختیار کیا جائے اور اسلام میں سونے کا کیا طریقہ ہے۔

ان باتوں نے مجھے بے حد متاثر کیا، ہم صفائی ستھرائی کے عمل میں ایران سے کوسوں دور

ہیں۔ اسلام میں صفائی ایمان کا نصف حصہ ہے۔ لیکن ایران والوں نے صفائی ستھرائی کو مکمل ایمان اس طریقے سے بنایا ہے کہ جیسے نماز، روزہ، زکوۃ، حج کے ساتھ ساتھ صفائی کو بھی ذہن ودل سے یہ لوگ ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں۔ تہران، اصفہان، شیراز، قم وغیرہ بڑے شہروں میں نالیوں سے گزرنے والا پانی بھی صاف وشفاف ہے۔ یہاں کی حکومت نے جگہ جگہ قرآنی آیات کے ذریعے صفائی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ جتنی تعداد میں پالی تھین کے لفافے ایران میں استعمال ہورہے ہیں، شاید ہی ہم اتنی تعداد میں پالی تھین یا پلاسٹک سے بنے لفافے استعمال کرتے ہوں گے۔ لیکن اس کے باوجود جنوبی ایران میں کسی بھی جگہ آپ پالی تھین کو نیچے پڑا نہیں پائیں گے۔ شمالی ایران خصوصاً ''کلاردشت'' کے علاقے اور گھنے جنگلوں سے جانے والی سڑکوں کے کنارے جنوبی ایران کے مقابلے میں کافی گندے ہیں اور ان پر پالی تھین کے لفافے اکثر ملتے ہیں۔

یہاں میں صفائی کے تعلق سے ایک واقعہ رقم کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ایک جگہ ہم ''کافی'' پینے کے لئے بیٹھ گئے۔ کافی کے چھوٹے لفافے کو کھولنے کے بعد ہم نے وہیں پر پھینک دیا۔ ہمارے ساتھ ہمارے سیاحتی رہنما اور ڈرائیور جناب محمد خیریان نے وہ دونوں لفافے اٹھائے اور ہمیں کچھ بھی نہیں کہا۔ اس بات پر ہم شرمندہ ہوگئے اور آگے ہم نے صفائی کو اپنے سفر کا حصہ بنایا۔ محمد خیریان کی گاڑی میں موٹے کپڑے سے بنا ایک کوڑے دان بھی تھا، جو گاڑی کے ''گیر بکس'' کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ یہ صفائی کے تئیں ان کا جذبہ پیش کررہا ہے۔ بڑی شاہراہیں ہوں یا چھوٹی سڑکیں، ریلوے اسٹیشن ہوں یا میٹرو پلیٹ فارم، ہوائی اڈے ہوں یا سمندر کے کنارے، بڑے شہر ہوں یا دور افتادہ دیہات، بڑے ہوٹل ہوں یا چھوٹے ریسٹورنٹ' ایران میں ہر جگہ آپ کو خواتین اور مردوں کے لئے الگ الگ غسل خانے اور بیت الخلا کے ساتھ ساتھ الگ الگ نماز خانے بھی ملیں گے۔ غسل خانے میں ہاتھ صاف کرنے کے لئے پانی کے نلکوں کے ساتھ ساتھ سیال صابن کی نلکیاں بھی دستیاب ملیں گی۔ بڑی شاہراہوں پر ادائیگی (paid) بیت الخلا کی سہولیات بھی دستیاب ہیں۔ اکثر جگہوں پر ہاتھ صاف کرنے کے

طریقے بھی تصویروں کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔

14 جولائی 2019ء کی صبح کو جب میں نیند سے بیدار ہوا تو میں اپنے سر اور گردن میں شدید درد محسوس کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے وضو بنایا اور نماز ادا کی لیکن رکوع اور سجدے کے دوران سر چکرا رہا تھا، یوں درد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرا فشارِ خون قابو میں نہیں ہے۔ کیونکہ میری ملاقات ادارے میں صرف پروفیسر مدجی سے ہی تھی۔ اس لئے میں اس بابت بھی ان ہی سے ملا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس سلسلے میں آپ جناب سعید مولائی صاحب سے ملیں۔ میں ان کے کمرے میں گیا۔ جناب سعید مولائی صاحب مالیاتی معاملات کے آفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ، غیر ملکی مہمانوں کے صلاح کار بھی تھے۔ انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا اور میری طبیعت کے بارے میں پوچھنے لگے۔ شاید ادارے میں طبی سہولیات موجود نہیں تھیں۔ اس لئے وہ مجھے ایک اعلیٰ قسم کی کار میں بٹھا کر ادارے سے تقریباً دو سے ڈھائی کلو میٹر کی دوری پر واقع ''خیابان 19 دی (باجک 2) بعد از کوی 71۔ ساختمان شمارہ 1311: قم'' کے ایک چھوٹے سے نجی طبی مرکز ''ڈے کلنک'' پر لے گئے جو نہایت ہی شفاف اور جہاں پر مریضوں کی زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ ایک مدت بعد میری باری آئی، میرے ساتھ آئے جناب سعید مولائی صاحب نے بڑی ہی خوبصورتی سے وہاں پر بیٹھے طبیب (جن کا نام شاید) ''ڈاکٹر رضا پیر حسینلو'' تھا۔ انہیں میرے درد کے بارے میں سمجھایا۔ انہوں نے مجھے ایک انجکشن اور کچھ دوایاں تجویز کی۔ میں آپ کو یہ بات بھی بتاتا چلوں کی اکثر مریضوں کے ہاتھ میں جو نسخے تھے، ان پر ادویات فارسی میں ہی لکھی ہوئی تھیں۔ شاید مجھے مطمین کرنے کے لئے مذکورہ طبیب نے میری ادویات رومن رسم الخط میں لکھی۔ اس کے بعد سعید مولائی صاحب نے کئی ایک بار میری خبر گیری کی۔ میں جناب سعید مولائی صاحب کا مشکور و ممنوں ہوں کہ وہ اپنا قیمتی وقت نکال کر میرے ساتھ شفا خانے تک آئے۔

جولائی 14، 2019ء کو میں نے اپنے کمرے میں ٹیلی ویژن آن کیا تا کہ میں نیوزی لینڈ بمقابلہ انگلینڈ کرکٹ میچ کا فائنل دیکھ سکوں۔ بسیار تلاش کے بعد مجھے کرکٹ کا کوئی چینل نظر نہیں

آیا۔ باہر جا کر میں نے ایک دو لوگوں سے اس حوالے سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن مجھے ایسا لگا جیسے یہ کرکٹ سے شناسا ہی نہیں ہیں۔ ایک شخص نے کہا فٹ بال فٹ بال، جیسے وہ فٹ بال کے حوالے سے بات کر رہا ہو۔ بہر حال میں ایک دلچسپ مقابلہ نہیں دیکھ پایا۔

المصطفیٰ بین الاقوامی یونیورسٹی، ایران کے ایک مذہبی شہر قم میں واقع ہے۔ یہ دانشگاہ اسلامی اور انسانی علوم کو اقوام عالم میں تربیتی، تحقیقی اور تعلیمی بنیادوں پر پھیلانے میں ایک اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ اس یونیورسٹی کے ساتھ منسلک تقریباً ایک سو ستر (170) آموزش، تحقیق اور تعلیم پر مبنی مراکز ایران اور دنیا کے دیگر حصوں میں کام کر رہے ہیں۔ المصطفیٰ بین الاقوامی یونیورسٹی ایران سے وابستہ مختلف اداروں سے اب تک 122 ممالک کے تقریباً پچاس ہزار کے قریب طلباء و طالبات نے مختلف اسلامی اور انسانی وسائل کے کورسز میں تعلیم و تربیت حاصل کی ہے۔ ان میں سے پچیس ہزار نے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی ہے۔ یہ یونیورسٹی ''دانش گاہوں کی بین الاقوامی انجمن''، ''عالم اسلام کی دانش گاہوں کی تنظیم''، ''ایشیاء اور پیسفیک کی دانش گاہوں کی انجمن''، ''بین الاقوامی انجمن برائے صدورِ جامعیات'' اور ''عالم اسلام کی طلباء یونین'' کی ممبر یا پھر ان بین الاقوامی انجمنوں سے تسلیم شدہ ہے۔

1.International Association of Universities(IAU)

2.The Federation of The Universities of Islamic World(FUIW)

3.Association of Universities of Asia & Pacific (AUAP)

4.Union of Islamic World Students(UIWS)

یہ دانش گاہ بالخصوص ایران اور بالعموم اقوام عالم کے لئے روشنی کا ایک مینارہ ہے۔

''موسستہ الحکمہ''، المصطفیٰ بین الاقوامی یونیورسٹی ایران کے ساتھ منسلک اس کا ایک ذیلی ادارہ ہے جس کی بنیاد 2005ء میں رکھی گئی۔ میں اس ادارے کی نوعیت ہندوستانیوں کو اس طرح سے سمجھا سکتا ہوں۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم سے وابستہ سبھی افراد اس بات سے واقف ہیں کہ ہندوستان میں وزارتِ انسانی وسائل کے تحت یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) کی طرز

کا مختلف یونیورسٹیوں کو دیا گیا کالج برائے ترقی انسانی وسائل(UGC HRDC) جس
میں مختلف طرز کے ریفریشر یا اوریئنٹیشن کورسز کرائے جاتے ہیں۔ ''موسستہ الحکمہ'' المصطفیٰ
بین الاقوامی یونیورسٹی ایران سے وابستہ اسی طرز کا ایک تربیتی ادارہ ہے لیکن اس ادارے کا دائرہ
کار عالمی سطح کا اور کافی وسیع ہے۔جس میں ایران کے تعلق سے ثقافتی پروگرام کے علاوہ اسلامی
تعلیمات جس میں خصوصیت کے ساتھ شیعہ تعلیمات کے ورکشاپوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہاں
پر مختلف قسم کے طویل مدتی، درمیانی درجے کے اور مختصر مدت کے کورسز کرائے جاتے ہیں۔ جن
تربیتی کورسز کی طرف یہاں زیادہ دھیان دیا جاتا ہے، ان میں سے چند ایک تربیتی کورسز کے نام
میں یہاں درج کر رہا ہوں۔ ''اسلامی اور انسانی وسائل کے کورسز'' ''سائنٹیفک تبادلہ خیال''
''ثقافتی و سیاحتی کورسز''۔ اس کے علاوہ ''ثقافتی پروگرام'' ''قرآنی تعلیمات کے
پروگرام'' ''سیاحتی پروگرام'' ''اسلامی اسکالروں اور فلاسفروں سے ملاقات''۔کورسز کے دوران
یہاں شرکاء کو مفت رہائش اور کھانے پینے کی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس وقت میں اسی
سوچ میں ڈوبا ہوا ہوں کہ انہوں نے کس قدر محنت کر کے اسلامی ثقافت اور جدید ٹیکنالوجی کو
سامنے رکھتے ہوئے اس ادارے کی بنیاد رکھی ہے۔ اس وقت علامہ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کے
یہ اشعار میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

15 جولائی 2019ء سے ہمارے باضابطہ کلاسز شروع ہونے والے تھے۔ چونکہ میں
14 جولائی 2019ء کو مقامی بازار دیکھنے نکلا اور ایک مقامی قہوہ خانے سے 'کافی' بھی
پی۔ چونکہ نہ وہ میری بات سمجھے نہ میں ان کی باتیں سمجھا۔ اس لئے جو کافی مجھے دی گئی وہ بغیر دودھ
کے نہایت ہی تلخ تھی۔ میں نے بھی آخر کار بڑی کراہت سے پی ہی لی۔ 14 جولائی کی شام کو
میں پاس میں ہی حضرت فاطمہ معصومہ کی زیارت گاہ کی طرف گیا اور زیارت سے پہلے وہاں کی
خوبصورت مسجد ''مسجد امام حسن عسکری'' میں مغرب کی نماز ادا کی۔ نماز ادا کرنے کے بعد میں
نے حضرت فاطمہ معصومہ کی زیارت کی طرف رخ کیا۔ وہاں پر لوگوں کا زبردست آنا جانا

تھا۔حضرت فاطمہ معصومہ شیعوں کے ساتھویں امام حضرت موسیٰ کاظم کی صاحب زادی ہے۔ یہ 210ھ کا واقعہ ہے جب حضرت فاطمہ معصومہ اپنے عزیز بھائی کے ہمراہ زیارت کے لئے خراساں کی طرف روانہ ہوئی کہ شہر ''ساوہ'' کے قریب بیمار ہوگئیں اور قم پہنچنے تک آپ کی رحلت ہوگئی اور آپ کو یہاں سپرد خاک کیا گیا۔آپ کی زیارت کو قم میں مرکزی حیثیت حاصل ہے بلکہ پورے ایران میں حضرت امام رضا جو کہ مشہد میں مدفون ہیں' کی زیارت کے بعد حضرت فاطمہ معصومہ کی زیارت گاہ دوسری اہم زیارت گاہ ہے۔ 15

19 جولائی 2019 صبح نو بجے سے باضابطہ ہمارے کلاسز شروع ہوئے۔ادارے کے عہدہ داروں نے جو پروگرام شیڈول ہمیں دیا، وہ دو تقویموں پر مبنی تھا۔ پہلا حصہ انگریزی جاننے والوں کے لئے عیسوی تقویم پر مبنی تھا اور دوسرا حصہ ایرانی تقویم پر مبنی تھا جس کی رو سے ہمارے کلاسز دوشنبہ 24 تیر 1397ھ ش (ہجری شمسی) سے شروع ہوتے تھے۔ یہاں میں آپ کی اطلاع کے لئے عرض کرتا چلوں، افغانستان اور ایران میری نظر میں دنیا کے واحد ممالک ہیں، جنہوں نے دفتری بنیادوں پر اپنا ایک الگ اور مقامی کلینڈر مقرر کیا ہوا ہے۔وگرنہ تمام اقوام عالم میں یکساں طرز پر عیسوی تقویم کو ہی اختیار کیا جاتا ہے۔ایرانی تقویم کی بنیاد قدیم فارسی تقویم اور جدید اسلامی تقویم کی آمیزش و آویزش پر رکھی گئی ہے۔تمام وسطی ایشیائی ممالک ،پاکستان کے شمالی علاقوں اور ہندوستان میں مکین پارسی مذاہب ماننے والے یا دنیا کے دیگر علاقوں میں رہنے والے پارسی ''نوروز'' 21 / مارچ کو نئے سال کی آمد تہوار کی صورت میں مناتے ہیں اور اسی دن سے ایرانی سال شروع ہوتا ہے۔کشمیر کے حوالے سے اگر بات کی جائے ،تو یہاں ''نوروز'' کو سرکاری سطح پر باضابطہ دفتری تعطیل بھی ہوتی ہے۔اس دن کشمیری باغبانی، بیج بونا یا پھر قدیم روایات کے مطابق جونک (Leech) لگاتے ہیں، جو اب بھی برابر کچھ مقامات پر جاری وساری ہے۔نوروز کو میرے بچپن میں خصوصاً یہاں کے دیہات کے لوگ صبح سویرے اٹھ کر بہتے ہوئے کھلے پانی میں بھی نہاتے تھے اور لوگوں میں ایک قسم کا اسطوری ذہن یہ بھی بن گیا تھا کہ اس دن کے پانی کے ساتھ تمام جنگلی جڑی بوٹیاں مل جاتی ہیں لیکن آج کل یہ پانی اتنا گندہ ہوگیا ہے کہ اسے ہاتھ دھونا بھی مناسب نہیں' نہانا تو دور کی بات۔ یہ تمام رسوم ہم

نے ایران سے ہی حاصل کئے ہیں۔

اسلامی تقویم اصل میں ہجرت سے شروع ہوتی ہے اور اس کی بنیاد چاند کی گردش پر رکھی گئی ہے اور اسلام میں تمام مذہبی اصول خصوصاً رمضان میں رکھے جانے والے روزے، عید اسی قمری تقویم کی بنیادوں پر رکھے جاتے ہیں۔ ایرانی جہاں مذہبی عقائد کے لئے قمری تقویم کو مکمل معنوں میں اختیار کرتے ہی وہیں یہ روزمرہ زندگی اور دفتری معاملات کے لئے اسلامی شمسی تقویم جس کی شروعات ایرانی قدیم تقویم نوروز سے شروع ہوتی ہے۔ 21 مارچ 2019ء سے امسال 1398ھ ش ایرانی سال شروع ہوا، جس کا پہلا مہینہ ''فروردین'' ہے۔ قمری اور شمسی ہجری تقاویم کی بنیاد حضرت محمد ﷺ کی مکہ سے مدینہ ہجرت کے واقعہ کے پیش نظر رکھی گئی ہے جو کہ 13 ستمبر 622 عیسوی، بروز پیر، بمطابق (۱/ ربیع الاول ۱/ ھ [قمری ہجری/ ق ھ]) کا ہے۔ قمری ہجری تقویم جسے فقط ہجری تقویم ہی کہتے ہیں۔ دوسرے خلیفہ عمر بن خطاب کے دور میں حضرت علی بن ابی طالب کی تجویز پر اس کی بنیاد رکھی گئی اور اسی واقعہ کو بنیاد بنا کر ایران میں شمسی ہجری تقویم کا آغاز کیا گیا۔ اس کی رو سے جمعہ 19 مارچ 622 عیسوی، بمطابق 29 شعبان ۱/ ھ جو کہ ہجرت کے واقعہ سے چھ ماہ چوبیس دن پہلے کا مقرر کیا گیا ہے۔ اِس طرح تقریباً سات ماہ قبل کی بنیاد پر ہجرت والے ہی قمری سال کو بھی شمسی ہجری کا پہلا سال مقرر کیا گیا۔ شمسی ہجری سال، شمسی عیسوی سال سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ عیسوی سال میں مہینے پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، اس کے برعکس شمسی ہجری سال میں مہینے ایک مقررہ ترتیب سے بنائے گئے ہیں، اس کی رو سے پہلے چھ مہینے لگاتار اکتیس دنوں کے ہوتے ہیں اور اس کے بعد پانچ مہینے تیس دنوں کے ہوتے ہیں۔ بارھواں اور آخری مہینہ عام طور انتیس دن کا اور لیپ سال کو مدنظر رکھتے ہوئے تیس دنوں کا ہوتا ہے۔

حالانکہ اکثر اسلامی ممالک میں شمسی تقویم' عیسوی تقویم پر ہی اختیار کی گئی ہے۔ جیسے ہمارے سامنے پاکستان اور بنگلہ دیش کی مثال دی جاسکتی ہے۔ ان ممالک میں شمسی تقویم و عیسوی تقویم سرکاری تقویم کے بطور اپنائی جارہی ہے۔ اس کے برعکس بہت سارے اسلامی

ممالک ہجری شمسی تقویم کو غیر عیسوی تقویم پر ترجیح دیتے ہیں جن میں افغانستان اور ایران سرِ فہرست ہیں۔ اِن ممالک کی تقویم ہزار ہا برس سے چلی آرہی تہذیب پر مبنی ہے۔ یہ تقویم اسی طرح کی تقویم ہے جس طرح ہندوستان کی اپنی ایک علاحدہ تقویم ہے۔ لیکن آج ہندوستان کی نئی نسل کو اس کی خبر بھی نہیں۔ اس کے برعکس ایران نے اپنی تہذیب کو زندہ رکھتے ہوئے اسی زرتشتی تقویم کو اسلامی شمسی ہجری تقویم میں بدل دیا، جو ہزاروں سال سے وہاں اپنائی جارہی ہے۔ اس طرح ایرانی اسلامی شمسی تقویم کے سال کی عربی شمسی ہجری سال کی شروعات 19 مارچ کے بجائے قدیم ایرانی تقویم کے اصولوں کے مطابق 21 مارچ سے ہوتی ہے۔ جو دراصل زرتشتی سال کے آغاز ''نوروز'' جو کہ ماہ فروردین کی پہلی تاریخ سے ہوتی ہے۔ قدیم تقویم کو جدید تقویم کے ہجری شمسی کا جامہ پہنا کر قدیم تہذیب میں جدید اسلامی تہذیب کی روح پھونک دی گئی ہے۔ اس طرح ایرانیوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زندہ قومیں ہی اپنی تہذیب کو زندہ رکھنے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔

میں واپس لوٹتے ہوئے اپنے ورکشاپ کی طرف آرہا ہوں۔ جیسا کہ پہلے بھی میں نے رقم کیا ہے کہ 15 جولائی 2019ء بمطابق ایرانی کلینڈر دوشنبہ 24 تیر 1398ھ ش صبح کے نو بجے سے باضابطہ ہمارے کلاسز شروع ہوئے۔ اس سے پہلے کلاسز شروع ہوتے، ہمیں ساڑھے آٹھ بجے کے قریب پروگرام کے آخر پر دی جانے والی سند کے لئے تصویر کھینچنے کے لئے بنیادی منزل کے اس سیکشن میں لیا گیا، جس کے ذمہ صرف تصویر سازی کا کام ہے۔ یہاں پر ہماری تصویر سند کے لئے کھینچی گئی۔ باقی معلومات انہوں نے ہمارے پاسپورٹ سے حاصل کی ہوں گی۔ اس کے فوراً بعد ہمارا پہلا کلاس شروع ہوا۔ ابتدائی کلاس میں شرکاء نے اپنا اپنا تعارف پیش کیا۔ اس بین الاقوامی سطح کے ورکشاپ میں مختلف ممالک سے مندوبین شریک ہوئے تھے۔

جو لوگ اس ورکشاپ میں شریک ہوئے ان میں ہندوستانی نژاد قطر سے تعلق رکھنے والی محترمہ ثروت صاحبہ، جنھوں نے لکھنو یونیورسٹی سے اقتصادیات میں ماسٹرس کیا ہے، ان کے ساتھ ان کا بیٹا محمد رضا بھی تھا جو نہایت ہی ذہین اور ہر دل عزیز تھا۔ عرب امارات سے کیمیائی

انجینرنگ سے وابستہ محترمہ یاسمینہ نقوی، ہسپانیہ قرطبہ سے کارلوس مینڈویز جو کہ ''سماجی نقطہ نظر سے شیعہ تعلیمات کا تقابلی مطالعہ'' کے عنوان پر ہسپانیہ کی کسی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے اسکالر ہیں۔ وہ ہسپانوی، انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ اچھی عربی بھی بولتے اور سمجھتے ہیں۔ محترمہ شاہین اسماعیل کا تعلق انگلینڈ سے ہے، انہوں نے قانون میں ڈگری حاصل کی ہے اور وہاں پر بہ حیثیت قانونی صلاح کار کام کر رہی ہیں۔ جناب سجاد نقوی امریکہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی پیدائش حیدرآباد دکن، ہند میں ہوئی ہے۔ لیکن وہ اردو زبان سے اتنے ہی واقف ہیں، جتنا کہ ہم فارسی زبان سے۔ جناب سید امین کا تعلق قطر سے ہے اور وہ کیمیائی انجینرنگ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے اسکالر ہیں۔ محترمہ مریم طاہری افغان نژاد کینیڈا کی شہری ہیں۔ وہ کینڈا میں فارسی کی استاذ ہیں۔ محترمہ فرحانہ بقادیہ کا تعلق یونائٹیڈ کنگ ڈم کے لیسٹی سے ہے۔ وہ لیسٹی کے مقامی مدرسے میں قرآن کی استاذ ہیں۔ ڈاکٹر جسمینا کا پیٹیک کا تعلق بوزنیاہرزی گونیا سے ہے، وہ نظم کی شاعرہ ہیں اور اب تک ان کے بوزنین زبان میں دو مجموعہ کلام بعنوان ''سحرہ کی خوبصورتی'' اور ''جنگ کے بچے'' شائع ہو کر وہاں کے ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے ''ڈرامہ عالیہ اسکروچ' کا مابعد جدید مطالعہ'' کے عنوان پر اپنا مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ محترمہ تحریم رضا کا تعلق قطر سے ہے۔ وہ ماسٹرس کی طالبہ ہے۔ محترمہ معصومہ کا تعلق کینیڈیا سے ہے۔ وہ نفسیات کی طالبہ ہیں۔ سعید قاضی کا تعلق امریکہ سے تھا اور وہ ہارپر کالج پالٹیوالوینس امریکہ سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر حبیب اللہ صاحب کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ وہ کشمیر یونیورسٹی حضرت بل، سرینگر میں شعبہ تعلیم کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ انہوں نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ تعلیمی میدان میں وہ کئی ایک بین الاقوامی اور قومی سطح کی انجمنوں کی نمائندگی کر رہے ہیں اور ان دانشوروں کے ساتھ ساتھ راقم الحروف نے بھی اس ورکشاپ میں شرکت کی۔

''موسستہ الحکمہ'' کی پہلی منزل سمینار اور لکچر ہالوں کے لئے مختص رکھی گئی ہے۔ اس منزل میں کئی ایک چھوٹے، بڑے اور درمیانی درجہ کے دیدہ زیب لکچر اور سمینار ہال بنے ہوئے ہیں۔

ہر ایک ہال جدید ٹیکنالوجی سے لیس ، سمعی اور بصری آلات سے آراستہ ہے۔ ہمارے کلاسز مختلف گول میز ہالوں میں منعقد کرائے جاتے تھے۔ دن میں 2 گھنٹے کی تین کلاسز، 2 گھنٹے کا وقفہ اور ایک دورہ/مختصر سفر (جس کی معیاد مقرر نہیں تھی) ہوتا تھا۔ ہر کلاس دو گھنٹے کے وقت پر مبنی ہوتا تھا اور اس میں پندرہ منٹ چائے کے وقفے کے لئے وقف رہتے تھے۔ لیکن چائے پینے کی کوئی قید بھی نہیں تھی۔ آپ کلاس کے دوران بھی چائے پی سکتے تھے۔ اس پر نہ کوئی پابندی تھی اور نہ ہی چائے ملنا دشوار تھا۔ گرم پانی اور چائے ہر وقت دستیاب رہتے۔ شرکاء اپنے اپنے مزاج کے مطابق کبھی کبھی گرم پانی لے کر الگ بھی چائے بناتے تھے۔ پہلی کلاس ٹھیک صبح کے 9 بجے سے شرع ہو کر صبح کے 11 بجے ختم ہوتی تھی۔ دوسری کلاس 11 بجے سے 1 بجے تک۔ دوپہر کے 1 بجے سے دن کے 3 بجے تک دوپہر کے کھانے، ظہر کی نماز اور آرام کا وقفہ رہتا تھا۔ اس کے بعد 3 بجے سے 6 بجے تک ایک اور کلاس ہوتی تھی اور 6 بجے سے 8 یا 9 بجے تک اہم مقامات کا دورہ بھی کرایا جاتا تھا۔ کبھی کبھار دورے دن کے مختلف اوقات میں بھی کرائے جاتے تھے۔ یہ دورے ان جگہوں کے لئے دن کے دوران مقرر کئے گئے تھے، جہاں دفتری اوقات مقرر ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ایران کے دور دراز اہم، خوبصورت اور تاریخی مقامات کی سیر بھی شیڈول میں شامل تھی۔ ورکشاپ کے دوران ہفتے میں جمعہ یا اتوار کی کوئی بھی چھٹی نہیں دی گئی۔

''موسستہ الحکمہ'' کے مذکورہ ورکشاپ میں جن اساتذہ نے مختلف موضوعات پر مختلف اوقات میں جو خطبے دیئے، ان میں خاص طور پر پروفیسر شیخ علی عباس براتی، پروفیسر سعید عباس مسعودی، پروفیسر سعید جواد حسینی، پروفیسر سعید محمود موسوی، ڈاکٹر رضا بخش، پروفیسر محمد علی سوادی، پروفیسر شیخ محمد رضا محدث، جناب آیت للہ تاباسی، ڈاکٹر مہدی رستغفر، پروفیسر عباسی پسندیدہ، جناب آغا شفیعی وغیرہ شامل تھے۔ اس کارواں کے روح رواں پروفیسر مدہی تھے اور جناب محمد خیریان نے بہ حیثیت مترجم (فارسی سے انگریزی میں) اپنے فرائض انجام دیئے۔ قارئین کی معلومات کے لئے یہ بات رقم کرتا چلوں کہ ان دانشوروں نے جو خطبے مختلف اوقات میں اس ورکشاپ کے دوران پیش کئے، ان کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں میں صرف اجمالاً ان

خطبات کا تعارف پیش کرنے کی کوشش کروں گا، کہ کن موضوعات کو موضوع بحث بنایا گیا۔

پروفیسر شیخ عباس علی براتی نے بین المذاہب مکالمہ اور اہل بیت کے حوالے سے اور شیعہ، سنی تعلقات اور Rationality of Religion کے موضوعات پر اپنی بات سامنے رکھی۔ پروفیسر سعید عباس مسعودی نے ''قرامہ'' کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ پروفیسر سعید جواد حسینی نے علوم اِسلامیہ کے ساتھ ساتھ المصطفیٰ بین الاقوامی یونیورسٹی ایران کی کارکردگی پر بھی معلومات بہم پہنچائی۔ پروفیسر سعید محمود موسوی نے مذہبی فلسفہ، اجتہاد، اجماع اور فارسی تاریخ فقہ پر مفصل گفتگو کی۔ ڈاکٹر رضا بخش صاحب نے اسلامی اور مغربی فلسفہ، تھیولوجی اور فلسفہ کے ساتھ ساتھ شیعہ تھیولوجی نیز نظریہ دینیات، خدا کے قریب کیسے پہنچیں وغیرہ پر بحث کی۔ پروفیسر محمد علی سوادی نے مذہب کے معروضی اصولوں کو سامنے رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلام میں سیاست اور جمہوریت، نہج البلاغہ، والیاتِ فقہی، زکواۃ اور خمس کی اہمیت پر سیر حاصل گفتگو کی۔ پروفیسر شیخ محمد رضا محدث نے اسلام میں روحانیت اور تصوف کے حوالے سے بنیادی باتیں سمجھانے کی کوشش کی۔ جناب آیت اللہ تاباسی سے ملنے ہم ان کے گھر گئے، وہ ایک عمر رسیدہ شخص ہیں، ان کے گھر میں ایک بڑا کتب خانہ بھی موجود ہے۔ انہوں نے ہمیں نصیحتوں کے ذریعے مذاہب خصوصاً اسلام میں اتفاق کا درس دیا۔

18 جولائی 2019ء کی صبح کے دس بجے کے قریب ہم یونیورسٹی باقر العلوم گئے۔ یہ یونیورسٹی قم کے مضافاتی علاقے میں واقع ہے۔ اصل میں اس یونیورسٹی کی بنیاد دار العلوم کے طرز پر 1984ء میں رکھی گئی تھی اور اس کا نام باقر العلوم رکھا گیا۔ 2005ء میں اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ دار العلوم سے وابستہ طلاب کو بھی جدید طرز تعلیم کی ضرورت ہے اس مدرسے کو دانش گاہ کا درجہ دیا گیا۔ دانش گاہ کا درجہ دینے کے بموجب اس کا نام باقر العلوم یونیورسٹی رکھا گیا۔ یہاں پر مختلف کورسز کی سہولیات موجود ہیں، جیسے ''انڈر گریجویٹ''، ''گریجویٹ'' اور ''پوسٹ گریجویٹ''۔ فارسی کے ساتھ ساتھ کئی دیگر زبانوں جیسے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولیات بھی موجود ہیں۔

یہاں پر مختلف علوم (Faculties) پر مبنی شعبے کام کر رہے ہیں۔ فیکلٹی برائے ثقافت ،سماجیات اور Sciences Behavioral، کے تحت کئی ایک شعبے کام کر رہے ہیں جیسے ''سماجی علوم کے شعبے'' میں ''سماجیات''، ''مسلم سماجی تعلیم''، فلسفہ برائے سماجی علوم''۔ ''شعبہ برائے حکمت عملی انتظامیہ'' (Stragetic Administration) میں ''ثقافت کی حکمت عملی''، ''مستقبل کی تعلیمات''، ''اسلامی ثقافت اور تعلیم'' وغیرہ۔ اسی طرح ایک اور شعبہ ''شعبہ برائے ثقافتی تعلیم و ترسیل'' کے ذریعے '' ثقافتی ترسیل اور تشہیر'' کے کورسز کرائے جاتے ہیں۔ باقر العلوم یونیورسٹی نے ''تاریخی اور سیاسی علوم'' کے لئے بھی ایک اور الگ فیکلٹی قائم کی ہے۔ جس کا نام ''فیکلٹی برائے تاریخ وسیاسی علوم'' رکھا گیا ہے، اس فیکلٹی کے تحت بھی مختلف شعبے کام کر رہے ہیں جیسے ''شعبہ برائے سیاسی علوم''، اس شعبے میں ''سیاسی علوم''، ''اسلامی سیاسی تخیل''، ''اسلامی سیاسی فلسفہ''۔ یہاں کے ایک اور شعبے کا نام ''شعبہ برائے تاریخ و تہذیب'' ہے، اس شعبے کے ذریعے ''تاریخ برائے اسلامی ایران'' اور ''اسلامی تاریخ'' پڑھائی جاتی ہے۔ اسی طرح سے یہاں کئی ایک شعبے ہیں جن کی ایک طویل فہرست ہے۔ اس یونیورسٹی سے اب تک مختلف کورسز میں ایک ہزار کے قریب طلاب نے پوسٹ گریجوشین کی ڈگریاں حاصل کی ہیں اور تقریباً ایک سو کے قریب طلاب نے مختلف کورسز میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ اِس یونیورسٹی نے اب تک کئی ایک قومی اور بین الاقوامی سمینار اور کانفرنسیں منعقد کروانے کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے ثقافتی پروگرام بھی منعقد کئے ہیں۔

باقر العلوم یونیورسٹی کے ایک خوبصورت سمینار ہال میں یہاں کے ایک معروف استاذ پروفیسر فیروز جاہی نے بڑے ہی خوشگوار انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور یونیورسٹی کی کار کردگی کے بارے میں مفصل انداز میں معلومات فراہم کی۔ اس کے بعد ہمیں یونیورسٹی کے مختلف شعبے اور مرکزی کتب خانہ دکھایا گیا۔ اس یونیورسٹی میں ہر طرح کی جدید سہولیات موجود ہیں۔ باقر العلوم یونیورسٹی ایک وسیع و عریض احاطے پر پھیلی ہوئی ہے۔ چونکہ ہم ایک ثقافتی ورکشاپ سے وابستہ تھے، اس لئے ہمیں ایران کو ہر طرح سے جاننے کا موقع ملا۔ مقصد یہی تھا

کہ ہم دیکھیں کہ ایران کے دینی مدرسوں کا معیار اور حال کیسا ہے۔ یہاں پہنچ کر ہم حیران رہ گئے کہ ایران اس سلسلے میں بھی بہت آگے بڑھ چکا ہے۔

موجودہ تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے لئے اسے ٹیکنالوجی سے جوڑنا، اس میں نئی روح سمونے کے مترادف ہے۔ اس وقت ہر ادارہ اس بابت سوچنے کی کوشش میں ہے کہ ہم کس طرح نئی ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھا کر تعلیم کے معیار کو بہتر بنائیں۔ لیکن جو تعلیمی نصاب آج سے سو سال پہلے مدرسوں میں رائج کیا گیا تھا یا جس طریقے سے ان مدرسوں نے پڑھانے کا عمل شروع کیا تھا ، یہ ابھی بھی اسی ارتقائی عمل سے گزر رہے ہیں، اس میں آج بھی کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ ایران میں مدرسے جس طرح جدید کاری کی صف میں آگے ہیں ہمیں بھی چاہیئے کہ ہم اس رول ماڈل کو اپناتے ہوئے اپنے مدرسوں میں نئی روح پھونکنے کی ٹھان لیں۔ ''ندوۃ العلما، لکھنؤ'' اس معاملے میں ہمارے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوسکتا ہے یا کچھ جنوبی ہندوستان کے مدرسے بھی اس سَمت میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم اس معاملے میں ایرانی مدرسوں کے طریق کار سے فائدہ اٹھائیں، ان مدرسوں کی نئی پرواز دیکھنے کے لئے ہمارے مدرسوں کے ذمہ داروں کے لئے لازمی ہے کہ وہ ایران کا رختِ سفر باندھیں اور ان مدرسوں کے بدلتے طریق کار کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

جب تک ہم تعلیمی نظام میں جدید طریق کار اپنانے میں مکمل طور کامیاب ہو جائیں ' تب تک ہمیں اپنے طرزِ عمل میں فوری اور بنیادی تبدیلی لانے کی اشد ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ ہم اپنے مدرسوں میں پیشہ ورانہ طریقہ کار اختیار کریں۔ جو والدین صاحب ثروت اور فیس ادا کر سکتے ہیں، ان سے فیس طلب کریں، اگر وہ فیس نہیں دے رہے ہیں تو ان کے بچوں کا داخلہ نہ کریں۔ کیونکہ پہلی بات تو یہ کہ وہ بچے زکواۃ یا صدقے کی رقم سے کیونکر ایسی سہولیات حاصل کر سکتے ہیں جو غریب بچوں کا حق ہے۔ اس سے مدرسے میں بچوں کے ہجوم پر بھی قابو پایا جاسکتا ہے۔ ہم کیونکر دنیا کو یہ دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس مدرسے میں ایک ہزار بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مقدار سے معیار حاصل نہیں کیا جاسکتا! ۔ اپنا اپنا کام پیشہ ورانہ بنیادوں پر

کرنے کی کوشش کریں۔ جیسے صفائی، صفائی کرنے والے کے حوالے کریں۔ حساب وکتاب کے لئے ماہرین شمار کنندہ یا حساب دان کو منتخب کریں۔ تمام انتظامی امورات ماہر منتظمین کے حوالے کریں۔ پڑھانے میں بھی اچھے استاذ کو منتخب کریں۔ اس کے برعکس ہمارے مدرسوں میں ہر کام کے لئے صرف مولوی صاحبان مامور ہوتے ہیں۔ کچن میں آشپازوں کی ضرورت ہے نہ کہ مولوی صاحبان کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مدرسے ویسے ہی مدرسے ہیں جیسے پیدا ہوئے تھے۔ اگر انہیں بڑھنا ہے اور بالغ ہونا ہے تو انہیں ایرانی مدرسوں کے طریق کار کو اپنانا پڑے گا۔ جہاں مدرسوں کی تعلیم اور نظم ونسق میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔

17 جولائی 2019ء کی شام سات بجے کے قریب ہم ''مسجد جمکران'' گئے۔ پہلے ہم اس مسجد سے منسلک میوزیم دیکھنے کے لئے گئے، جو نہایت ہی شاندار میوزیم ہے۔ اس میوزیم میں سب سے پہلے جمکران کا مکمل نقشہ، حضرت معصومہ کی زیارت کا نقشہ، خانہ کعبہ کا نقشہ، مدینہ منورہ کا نقشہ ایک شیشے میں ٹھوس صورت میں رکھے گئے ہیں۔ ایک جگہ وہ دروازہ رکھا گیا ہے جو اصل میں جمکران کی مسجد کے کے لئے تیار گیا تھا۔ لیکن اُس پر کندہ قرآنی آیات کے احترام کو مدنظر رکھتے ہوئے، اُسے اب میوزیم میں رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں طرح طرح کی چیزیں رکھی گئی ہیں جن میں قدیم زمانے کے ہر طرح کے گھریلو، کاشتکاری اور مختلف قسم کے آلات سے لے کر آج کے زمانے میں استعمال ہونے والی چیزیں شامل ہیں۔ اس میوزیم کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ الگ الگ طریقے سے لوگوں کو کس طرح مختلف چیزوں سے متعارف کرایا جائے۔ ایک حصے میں وہ گاڑی رکھی گئی ہے جو جناب امام خمینی استعمال کر رہے تھے۔ اس میوزیم میں حلال اور حرام جانوروں کی شناخت کے طریقے بھی تصویروں کے ذریعے دکھائے گئے ہیں۔ ان میں خرگوش کو حرام جانوروں میں رکھا گیا ہے اور گھوڑے کے گوشت کے کھانے پر کراہت ظاہر کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مما لک میں حلال رزق کی شناخت کے نشانات (Logo) بھی ایک بڑی تصویر کے ذریعے دکھائے گئے ہیں۔ ایک تصویر میں مختلف مما لک کی کرنسیاں دکھائی گئی ہیں۔ ایک حصے میں سمندری اور

دیگر آبی جانور دکھائے گئے ہیں۔ایک اور حصے میں موسیقی کے آلات رکھے گئے ہیں۔ایک حصے میں تصویری نمائش رکھی گئی ہے۔آخر پر ملکِ شام سے دائش سے ضبط کئے گئے ہتھیار نمائش کے لئے رکھے گئے ہیں۔

ایک جگہ پر کچھ لوگ بیٹھے ایک بڑے ایل،سی،ڈی ٹیلی ویژن پر وہ دستاویزی فلم دیکھ رہے تھے جس میں یہ دکھایا جارہا تھا کہ مسجد جمکران کی بنیاد کس طرح رکھی گئی تھی۔ان واقعات کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔جن واقعات کو مدنظر رکھ کر یہ مسجد تعمیر ہوئی ہے۔بنیادی قصہ کچھ اس طرح کا ہے۔17 رمضان 373ھ کی رات کی بات ہے کہ ایک مقامی شخص جس کا نام حسن بن مثلہ تھا،سو رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا (اس بات کی تصدیق نہیں کی گئی ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے یا حقیقت کا۔چونکہ وہ سو رہے تھے۔اس لئے اسے خواب گرادننا بہتر رہے گا،لیکن واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عالمِ بیداری کا واقعہ ہے۔) ایک گروہ ان کے سرہانے آکر کھڑا ہوا،انہیں جگایا اور ان سے کہا اٹھو حضرت امام مہدی آپ کو بلا رہے ہیں۔وہ اٹھ کر تیار ہوئے۔باہر نکلے تو کچھ اور لوگ ان کا انتظار کر رہے تھے اور انہوں نے اسے اس مقام تک پہنچایا،جہاں اس وقت مسجد جمکران ہے۔وہاں پر انہوں نے دیکھا کہ ایک تخت ہے جس پر خوش نما فرش بچھا ہوا تھا اور اس تخت پر تیس سال کی عمر کا ایک نوجوان تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا اور ان کے پاس حضرت خضر جو عمر رسیدہ تھے' بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ساتھ میں بہت سارے لوگ جن کی تعداد پچاس سے زیادہ ہوگی،خوبصورت سبز وسفید لباس میں نماز ادا کر رہے تھے۔حضرت خضر نے جناب حسن بن مثلہ کو بیٹھنے کو کہا اور اس کے بعد حضرت امام مہدی نے انہیں نام سے پکار کر فرمایا ''کہ جاؤ حسن بن مسلم سے کہو یہ ایک پاک جگہ ہے اور اس جگہ پر مسجد تعمیر کرو''۔یہ سن کر حسن بن مثلہ نے جواباً عرض کیا،''کہ مجھے کوئی نشانی دے دیجئے،تاکہ لوگ میرا بھروسہ کریں اور مجھے غلط یا جھوٹا نہ سمجھیں''۔اس کے جواب میں حضرت امام مہدی نے انہیں کہا،''آپ جائیں اور اپنا فریضہ انجام دیں،اس کی تصدیق کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔'' وہ یہ بات سن کر جا ہی رہے تھے کہ حضرت امام مہدی نے انہیں پھر آواز دی اور کہا،''جعفر کاشانی کے ریوڑ میں سے

ایک بکری خرید کر اسے ذبح کر کے لاعلاج بیماروں میں تقسیم کر دینا، جو بھی اس کا گوشت کھائے گا خدا اس کو شفا دے گا"۔

حسن بن مثلہ جب گھر لوٹے تو رات بھر نہیں سو پائے بلکہ اسی فکر کے عالم میں رہے۔ سحری کھانے اور فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد اپنے ایک رفیق علی المنذر کو سارا واقعہ بیان کیا۔ پھر یہ دونوں صبح کے وقت اس مقام کی طرف گئے، جس مقام کی رات کو نشاندہی کی گئی تھی۔ وہاں انہوں نے پایا کہ حضرت امام مہدی کے فرمان کے مطابق اس احاطے کی نشاندہی زنجیر لگا کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد بنا کوئی وقت ضائع کئے بغیر یہ قم کی طرف نکلے اور حسن بن مسلم کے گھر پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی باہر ان کے ملازم نے کہا کیا تم جمکران سے آئے ہو؟ اس نے جواب دیا ہاں۔ ملازم نے کہا کہ سید صبح سے آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔ اندر جانے کے بعد سید نے انہیں احترام سے بٹھایا اور کہا، "کہ رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی مجھے کہہ رہا ہے کہ جمکران سے حسن بن مثلہ نامی شخص آپ کے پاس صبح کو آئے گا، ان کی بات کو میری بات سمجھ کر ان کا اعتماد کرنا"۔ اس کے بعد حسن بن مثلہ نے پورا قصہ سنایا۔ سید ابوالحسن الرضا نے فوراً تیاری کی اور جمکران کی طرف نکلے۔ راستے میں جعفر کاشانی کے ریوڑ کو دیکھا، ان میں سے ایک بکری خود بہ خود ان کی طرف آئی اور اسے خریدا۔ جمکران میں جس جگہ پر مسجد بنانے کی نشاندہی کی گئی تھی وہیں پر مسجد کی تعمیر شروع کی گئی۔ بکری کو ذبح کر کے بیماروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ خدا کا کرنا تھا کہ جس بھی بیمار نے اس گوشت کو کھایا وہ شفایاب ہو گیا۔ وہاں پر مامور ایک شخص نے کہا کہ صدر جناب احمدی نژاد کے دور حکومت میں اس مسجد کو وسعت دی گئی۔

18 جولائی کو ہم نے بین الاقوامی اسکول برائے اسلامی تعلیمات کا دورہ کیا' جہاں ڈاکٹر مہدی رستغفر نے امام مہدی کے ظہور، غیبت صغریٰ اور غیبت کبریٰ کے حوالے سے تکنیکی بنیادوں پر اپنی دلیلیں پیش کی۔ جناب آغا شفیعی نے مختلف زیارات پر جانے سے پہلے ان کی اہمیت کو اجاگر کیا اور انہوں نے گلزار شہدا کے حوالے سے ہم تک معلومات پہنچانے میں بھی ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس پروگرام کی ہمہ جہت شخصیت اور جن کی کاوشوں سے یہ ورکشاپ منعقد ہوا

پروفیسر مدحی نے اپنے لیکچروں میں حدیث کے مختلف اصولوں اور شواہد کی بنیادوں نیز حدیث کی تاریخی حقیقت پر مدلل اور مفصل انداز میں اپنی رائے سامنے رکھی ۔ انہوں نے شیعہ اور سنی احادیث پر کھل کر اظہار خیال کیا۔

ہر لیکچر دو دو گھنٹے کے طویل وقت پر ہونے کے بموجب ہر ایک لیکچر پر کھل کر اور بے خوف انداز میں بحث ہوتی رہی۔ مقررین نے سوالوں کا جواب بڑی ہی خوبصورتی اور خندہ پیشانی سے دیا۔ باوجود اس کے کہ ہم نے کئی بار مقررین کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور کھلے انداز میں اس بات کو سامنے رکھا کہ ہم اس بات پر آپ کی رائے سے متفق نہیں ہیں۔ مقررین نے بڑی خندہ پیشانی سے ہماری رائے کا احترام کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہر کوئی اپنی رائے رکھنے کا حق رکھتا ہے اور ہم کسی پر اپنی بات تھوپنا نہیں چاہتے ہیں۔ مجھے ان کا یہ طریقہ کار نہایت ہی پسند آیا۔ اس سے مکالمہ کے در وا ہو سکتے ہیں اور مکالمے کے در کھلنے سے آپسی رنجشیں ختم ہونے کے امکانات بڑھ سکتے ہیں۔

18 جولائی کو ہم نے ''کتب خانہ آیت اللہ مرعشی نجفی (موسسہ مطالعاتِ اسلامی) کا دورہ کیا۔ یہ کتب خانہ اپنے آپ میں ایک ایسا ادارہ ہے، جس کا کوئی ثانی نہیں۔ مرحوم آیت اللہ مرعشی نجفی نے اس کتب خانے کی بنیاد رکھی۔ وہ خود بھی ان کی اپنی وصیت کے مطابق اسی کتب خانے کے بنیادی دروازے کے دائیں طرف مدفون ہیں۔ اس کتب خانے کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں صرف قلمی مخطوطات محفوظ رکھے گئے ہیں۔ کتب خانے میں قلمی نسخوں کو پہلے جدید کیمیائی مشینوں کے ذریعے محفوظ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد انہیں کتب خانے میں رکھا جاتا ہے۔ اس کتب خانے کے پاس اپنا جدید مشینی نظام موجود ہے جس کے ذریعے سے قلمی نسخوں کو محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ مرحوم آیت اللہ مرعشی نجفی نے اپنی تمام عمر قلمی نسخوں کو جمع کرنے میں صرف کی۔ مرحوم نے قلمی نسخے حاصل کرنے کے لئے کیسے کیسے طریقے اختیار کئے، یہ قلمی نسخوں کے تئیں اُن کے جنونی عشق کی داستاں بیاں کر رہا ہے۔

مرحوم آیت اللہ مرعشی نجفی نے اپنے قوم کے علمی سرمائے کو بچانے کی ٹھانی۔ کتب خانے

کے منتظم نے یہ بتایا کہ مرحوم نے عبادت کے بطور مختلف قلمی نسخے حاصل کیے۔ ایران بہت لوگوں کے پاس قلمی نسخے تھے لیکن وہ انہیں کسی ادارے کو دینا نہیں چاہتے تھے اور مرحوم آیت اللہ مرعشی نجفی اس بات سے واقف تھے کہ اگر یہ قلمی نسخے کسی کی تحویل میں رہے، تو وہ اسے محفوظ نہیں کر پائیں گے۔ اس طرح یہ قلمی نسخے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ضائع ہو جائیں گے۔ اس طرح انہوں نے قلمی نسخے حاصل کرنے کے لئے اس کے بدلے قلمی نسخے کے اصل حق دار کے لئے ختم اوراد پڑھ کے قلمی نسخے کو محفوظ کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ وہاں پر موجود منتظم نے جب مختلف قلمی نسخوں کو دکھانے کے بعد یہ بتایا کہ ان کو حاصل کرنے کے لئے مرحوم آیت اللہ مرعشی نجفی نے کتنی عبادت کی ہے تو ہم دھنگ رہ گئے۔ ایک ایک قلمی نسخہ حاصل کرنے کے لئے مرحوم نے اس کے بدلے اس کے اصل مالکوں کے لئے دو، تین، چار ماہ کے روزے رکھے ہیں۔ کسی کے لئے چالیس دن کی عبادت کی ہے۔ کسی کے لئے ایک ہزار نوافل پڑھے ہیں وغیرہ وغیرہ (لکھتے وقت مجھے صحیح یاد نہیں رہا کہ کس قلمی نسخے کے بدلے کتنی عبادت کی گئی۔ البتہ یہ اندراج مثال کے بطور پیش کی گئی ہے۔ اصل حقیقت جاننے کے لئے آپ کتب خانہ آیت اللہ مرعشی نجفی کے منتظمین سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں)۔

اس کتب خانے میں ایسے نادر قلمی نسخے بھی موجود ہیں، جن کا تعلق زرتشتی اور اس سے پہلے کے عہد سے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن کے قدیم نسخوں کے علاوہ انجیل وغیرہ کے بھی قلمی نسخے ملتے ہیں۔ اس کتب خانے میں قرآن کے ایسے قلمی نسخے بھی محفوظ رکھے گئے ہیں جن کا تعلق کشمیر سے ہے۔ کیونکہ ان قلمی نسخوں کے حاشیوں پر کشمیری نقشہ نگاری دور سے پہچانی جا سکتی ہے۔ اس کتب خانے میں تصویر کھینچنا منع ہے۔

19 جولائی کو ہمیں تہران کے مختلف ثقافتی اور تاریخی مقامات کی سیر کروائی گئی۔ ہم صبح 6 بجے کے قریب تہران کی طرف نکلے۔ تقریباً صبح کے 7 بجے ہم پہلے ''حرم امام خمینی'' پہنچے۔ حرم کے قریب کا منظر یوں لگ رہا تھا جیسے یہ کوئی سیاحتی مقام ہو (حالانکہ یہ کوئی سیاحتی مقام نہیں ہے) لیکن اس کی تزئین بڑی ہی باریکی سے کی گئی ہے۔ کھلی سڑکیں، گاڑیوں کے لئے مناسب

پارکنگ کا انتظام، بیٹھنے کے لئے کھلی اور پاک وصاف جگہ، بچوں کے کھیلنے کے لئے بہترین سہولیات۔صبح کے اس منظر کو کن الفاظ میں بیان کروں۔گردوپیش کی منظرنگاری کے ساتھ ساتھ مجھ پر آفتاب کی خوبصورتی پہلی بار واضح ہورہی تھی کہ جیسے یہ منظر ''نکلتا آئے ہے آفتاب آہستہ آہستہ'' والے شعر کو پیش کرتا ہو۔چونکہ ایران میں ہندوستان کے مقابلے میں ماحولیاتی آلودگی نہ ہونے کے بموجب آفتاب سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ایران میں آفتاب ہر جگہ خوبصورت کیوں نظر آرہا ہے۔اس وقت میں آفتابی شعاعوں سے بچنے والے چشمے سے آفتاب کے اس دلکش حسن کا بے خوف دیدار کررہا تھا۔شاید یہاں ماضی میں آفتاب کو دیکھ کر ہی لوگ خداپرست سے آتش پرست ہوئے ہوں۔طلوع آفتاب کی آتشی شعاعوں سے بچنے کے لئے لوگ چھوٹے چھوٹے درختوں اور مختلف قسم کے پھولوں کی جھاڑیوں کے سائے میں اور جوق در جوق چھوٹے چھوٹے تنبوؤں کے سائے میں باہر ٹولیوں کی صورت میں صبح کا ناشتہ کررہے تھے۔یوں محسوس ہورہا تھا کہ جیسے انہوں نے رات ان ہی تنبوؤں میں کھلے آسمان کے نیچے گزاری ہو۔اب یہ کچھ ہی دوری پر واقع ایک بڑے غسل خانے، جہاں پر غسل کرنے کا بہترین انتظام موجود تھا، سے نہا دھو کر ناشتے سے لطف اندوز ہورہے تھے۔

''حرم امام خمینی'' شہر رئے پر واقع ہے۔یہاں امام خمینی کی آخری آرام گاہ ہے۔اس جگہ ایک عالیشان اور دیدہ زیب مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے۔اس عمارت کے مرکز میں امام خمینی مدفون ہیں، ان کے ساتھ ان کے بیٹے شہید احمد خمینی، مرحوم برجردی اور مرحوم آیت اللہ توسیلی دفن کئے گئے ہیں۔امام خمینی کی آرام گاہ کے باہر ان کی بیگم مرحومہ خدیجہ ثقفی، مرحوم اکبر ہاشمی وغیرہ دفن ہیں۔لیکن جس سادگی کا استعارہ ان کی زندگی کو سمجھا جاتا ہے اور جن حالات میں امام خمینی نے اپنی زندگی گزاری ہے۔یہ مقبرہ اس کے برعکس ہے۔یہ مقبرہ کسی تاج محل سے کم نہیں ہے۔

''حرم امام خمینی'' سے کچھ ہی دوری پر ''شہر رئے'' میں ہی واقع عبدالعظیم حسن کا مقبرہ ہے۔بتایا جاتا ہے کہ آپ حضرت امام حسین کی چوتھی نسل سے تھے۔اندر مقبرے تک جاتے جاتے نیچے فرش پر بہت سارے لوگوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ایک مقامی شخص سے پوچھنے پر

پتہ چلا کہ یہاں پہلے قبرستان تھا۔لیکن بعدازاں زیارت میں لوگوں کے زیادہ آنے کے بموجب اس جگہ کی ازسرنوتزئین کرنے کی وجہ سے قبرستان کو ہموار کر کے زائرین کے لئے بہتر آمدرفت اور کھلی جگہ کی سہولیات رکھی گئی۔ چونکہ جولوگ وہاں پر دفن تھے،اُن کی قبروں کو ہموار کر کے اُن کے نام کی تختیاں وہاں پر نصب کی گئیں تاکہ وہاں پر مدفون اشخاص کے قبروں کی پہچان کی جا سکے۔آپ کی اطلاع کے لئے بتادوں کہ آپ اس زیارت پر جہاں بھی قدم رکھیں گے آپ کے قدم کسی نہ کسی شخص کی قبر پر ہی پڑیں گے۔اس پہ طرہ یہ کہ قبروں پر نام لکھے گئے ہیں اس لئے یہ بھی خیال رکھیں کہ اندر جاتے وقت قبروں کے اوپر سے تو گزرتے ہی ہیں،لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسمائے گرامی کی بھی بے حرمتی ہو جاتی ہے۔مگر کیا کیجئے کہ حضرت عبدالعظیم حسن کے مقبرہ تک پہنچنے کے لئے اس قبرستان کےاوپر سے گزرنا لازمی ہے۔

حضرت عبدالعظیم حسن کے مقبرے کے ساتھ ہی اندر ایک خوبصورت مسجد ہے۔ہوسکتا ہے کہ اس مسجد کے اندر جانے کے لئے اور بھی کوئی راستہ ہو۔لیکن ہمیں اندر جانے کے لئے یہی ایک راستہ اختیار کرنا پڑا۔اس مسجد میں ہم نے ''تبریز'' سے آئے ہوئے ایک نوجوان سے بات کی جوانگریزی میں بات کرسکتا تھا۔وہ تبریز یونیورسٹی سے منسلک کسی طبی کالج میں ایم بی بی ایس کا طالب علم تھا،اس کے ساتھ اس کے رشتہ دار چھوٹے بچے بھی تھے۔ہم نے ان کے ساتھ خوب باتیں کی اوران کے ساتھ کچھ تصویریں بھی بنائی۔

''شہررئے'' اصل میں کسی زمانے میں ایران کا دارلخلافہ تھااور تہران شہررئے کے قریب ایک گاوں ہوا کرتا تھا۔لیکن وقت نے ایسی کروٹ لی کہ قاجار دور کے حکمران آغا محمد قاجار کو یہ گاوں اتنا پسند آیا کہ اس نے تہران نامی اس گاوں کوایک بڑے شہر میں تبدیل کرتے ہوئے اسے ایران کا دارالخلافہ بنایااور آج یہ ایران کا سب سے مہنگا شہر تصور کیا جاتا ہے۔

شہررئے سے نکلنے کے بعد ہم تہران کے ''پنز دا ہکر داد اِسکائر'' یا ''ارگ اسکائر''، ''کاخ گلستان'' یا ''گلستان محل'' پہنچے۔''کاخِ گلستان'' کے معنی پھولوں کی جگہ کے ہیں۔چارسوسال پہلے صفوی دور میں اس گلستان کی بنیاد رکھی گئی تھی ،بعدازاں کریم خان زندہ کے دور حکومت میں

اس کی از سرِ نو تعمیر کی گئی۔ جب قاجاریوں نے تہران کو اپنا دارالخلافہ بنایا تو اس ''کاخِ گلستان'' پر انہوں نے زیادہ توجہ دی اور اسے اپنا مسکن بنایا۔ پہلوی دور میں اسے اور بھی اہمیت حاصل ہوئی اور تمام اعلیٰ اور اہم دفتری کارروایاں اسی محل میں ہوتی رہیں۔ ''کاخِ گلستان'' میں جو اہم دیکھنے کی چیزیں ہیں ان میں سب سے اہم 1802ء میں بنایا گیا ''تختِ مرمر'' ہے۔ یہ تخت ایران کی ہنرمندی کی ایک زندہ مثال ہے۔ سنگِ مرمر اور لکڑی میں کندہ کیا گیا کام اور اس پر خوبصورت پچکاری، دروازوں اور کھڑکیوں کی تزئین و آرائش اور بیچ میں یزد کے خاص قسم کا زرد سنگ

مرمر سے بنایا گیا ایوان۔ ہمارے ساتھ یہاں کے سیاحتی

رہنما جناب حبیب نے بتایا کہ یہ تخت سنگ مرمر کے 65 بڑے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے جسے سنگ مرمر سے بنے ہوئے تمثیلی مجسموں نے سہارا دیا ہوا ہے جو دیوؤں، پریوں اور بھوتوں کی شکل کے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں کی ہر چیز ایران کی کاری گری کی داستاں بیان کر رہی ہے۔ یہاں پر شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے شہزادوں اور بادشاہوں کی تاج پوشی کی جاتی تھی۔ رضا خان پہلوی آخری بادشاہ ہیں جن کی 1965ء میں یہاں تاج پوشی کی گئی۔

''کاخِ گلستان'' میں ایک خوبصورت اور درمیانی درجے کا ایک ایسا کمرہ ہے، جس کو شیشوں سے خاص کر عکس نما شیشوں یا آئینوں سے سجایا گیا ہے۔ اس کمرے کو گلستان میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اسے ''تالارِ آینہ'' کہا جاتا ہے۔ یہاں پر داخل ہوتے ہی مجھے مشہور و معروف بالی وڈ فلم ''مغل اعظم'' کے گانے ''جب پیار کیا تو ڈرنا کیا'' کا وہ منظر آنکھوں میں چھا سا گیا کہ جب بادشاہ کو ہر آئینے میں انارکلی کا ہی عکس نظر آجاتا ہے۔

یہاں کبھی کبھار ایسا معلوم ہوتا کہ ایرانی بادشاہ شیشوں کی تزئین کاری میں بے حد دلچسپی رکھتے تھے۔ کیونکہ ''کاخِ گلستان'' کے جنوبی حصے میں ایک وسیع و عریض کمرے کی آرائش شیشوں سے اس طرح کی گئی تھی کہ اس میں لگے شیشوں کی مخصوص اور دل چھو لینے والی شیشہ گری نے اسے ''تالارِ آینہ'' کے بجائے ''تالارِ الماس''، یعنی ''ہیروں کے محل'' کا نام دینے کے لئے مجبور کیا۔ 1806ء میں ''تالارِ الماس'' کی بنیاد بادشاہ فتح علی شاہ نے رکھی۔ لیکن اسے حقیقی معنوں

میں ہیروں کے جیسا تصور دینے کا خیال نصیر الدین شاہ کو آیا اور انہوں نے اپنے عہد میں اس کی ازسرنو شیرازہ بندی کرتے ہوئے، اسے جہاں رومی نقش ونگاری میں تبدیل کر دیا۔ وہیں اس کی دیواروں کو خوبصورت بنانے کے لئے یورپ سے ایک مخصوص قسم کا دیوارِ کاغذ منگا کر ان دیواروں پر چسپاں کروایا گیا۔ پورے کے پورے ''کاخِ گلستان'' کا یہ حصہ اس وقت اتنا خوبصورت تھا کہ اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگانے کے لئے اس میں بادشاہوں کو مختلف اوقات پر دیئے گئے انعامات اور دیگر ہاتھ سے بنی ہوئی قیمتی مصنوعات وغیرہ کو اس کمرے میں سجا کر رکھا گیا تاکہ محل میں آنے والے اور بادشاہ سے ملنے والے مہمانوں کا دل خوش کرنے کے لئے ان کو خصوصیت کے ساتھ اس کمرے کی زیارت کرائی جائے۔

''کاخِ گلستان'' کے ایک حصے میں مختلف قسم کے کھانے پینے کے قیمتی برتن رکھے گئے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر برتن چینی مٹی سے بنے ہوئے ہیں جن پر زری سیاہی سے نقش ونگاری کی گئی ہے۔ یہ برتن بادشاہوں کو تحفے کی صورت میں خاص کر یورپی ممالک کے بادشاہوں نے دیئے ہیں۔ ان میں سے جو چینی برتن ملکہ وکٹوریہ نے دیئے ہیں ان برتنوں کی تزئین کاری خاص طور پر ہیرے جواہرات سے کی گئی ہے۔ اسی طرح جو برتن اسکندر اعظم سوم نے تحفے میں دیئے ہیں وہ خاص قسم کے پتھر سے بنائے گئے ہیں۔ یہ کمرہ دراصل کھانے پینے کے شاہی سبک کو پیش کرتا ہے۔ اس کمرے کو ''تالارِ ظروف'' کا نام دیا گیا ہے۔

ایک وسیع وعریض کمرہ جس کی آرائش بڑی ہی خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ اس میں بیٹھنے کے لئے آرام دہ کرسیاں، صوفے اور نقش کئے گئے میز رکھے گئے ہیں جو بڑے ہی دیدہ زیب نظر آتے ہیں۔ اسے بادشاہ طعام خانہ (Dinning Hall) کے بطور استعمال کرتے تھے۔ عام طور اس کمرے کو ''تالار ادج'' (Hall of Ivory) کہا جاتا ہے۔

''کاخِ گلستان'' کی ''عمارتِ بادگیر'' اور ''تالارِ الماس'' کے درمیان ایک بڑا کمرہ بنایا گیا ہے۔ اس کمرے کو ''چادر خانہ'' کہتے ہیں۔ اس کمرے میں بادشاہوں کے شامیانے وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ قاجار حکمران سیر وسیاحت کے دلدادہ تھے اور سال میں کئی مرتبہ

گھومنے کے لئے نکلتے تھے۔اس لئے اُن کے سیر وسیاحت کے شاہی سامان کو سنبھالنے کے لئے اسی کمرے یعنی ''چادر خانہ'' میں رکھا جاتا تھا۔آج کل یہ ''چادر خانہ'' بند ہے۔البتہ بتایا جاتا ہے کہ اس وقت اس پر تعمیری کام چل رہا ہے اور اسے اب میٹنگ اور لیکچر ہال میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

''کاخِ گلستان'' میں ایک اُنچی عمارت بھی موجود ہے لیکن اس کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ہمارے ساتھ موجود مترجم جناب حبیب صاحب نے بتایا کہ یہ عمارت ایرانی اور یورپی طرز تعمیر کو مدنظر رکھتے ہوئے بنائی گئی ہے۔اسے تعمیر کرنے کے پس پشت واقعہ یہ ہے کہ ایک زمانے میں نصیرالدین شاہ یورپ کے دورے پر گئے اور وہاں کی اونچی اونچی عمارتوں کی تعمیر دیکھ کر ان کے دل میں خیال میں آیا کہ یہاں بھی اسی طرز کی عمارت تعمیر کی جائے۔اس سلسلے میں انہوں نے 1865ء میں یہ عمارت تعمیر کروائی۔اسے تعمیر کرانے کا ایک اور مقصد یہ بھی تھا کہ یہاں سے بادشاہ شہر کا وسیع وعریض پیشِ نگاہ (Panoramic) نظارہ کر سکے۔چونکہ یہ عمارت ''کاخِ گلستان'' کی عمارتوں میں سب سے اونچی ہے اس لئے اس کا نام ''شمس العمارت'' رکھا گیا۔

''کاخِ گلستان'' کے مختلف حصوں کو سرد رکھنے یا یہاں کے مختلف حصوں تک تازہ ہوا پہنچانے کے لئے ایک اور عمارت بنوائی گئی جس پر اونچے چار ''ہوا برج'' تعمیر کئے گئے اور انہیں مختلف رنگوں جیسے زرد، نیلے یا آسمانی، کالے رنگ کے بلاط (Tiles) لگائے گئے۔چونکہ اس عمارت کے تعمیر کرنے کا مقصد تازہ اور سرد ہوا ''کاخِ گلستان'' تک پہنچانے کا تھا' اس لئے اس عمارت کو ''عمارتِ بادگیر'' کا نام دیا گیا۔''عمارتِ بادگیر'' کے نیچے ایک وسیع وعریض بہاری کمرہ بنایا گیا جو گرمیوں میں سرد رہے، اس بہاری کمرے کو زیادہ سرد رکھنے کے لئے اس کے اندر سرد پانی کا حوض بنایا گیا۔لیکن یہ طریقہ کارکامیاب نہیں رہا۔آخر کار یہ کمرہ تصویروں کے لئے مختص رکھا گیا اور اس کا نام ''سرد خانے'' کے بجائے ''عکس خانہ'' رکھا گیا۔

اگر آپ حقیقت میں ''کاخِ گلستاں'' دیکھنے کے شوقین ہیں تو آپ کو چاہئے اس کے لئے

کم از کم مکمل ایک دن تقریباً آٹھ سے دس گھنٹے کا وقت نکالیں یا پھر آرام سے دو دن میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ایک دن میں نصف حصہ دیکھیں اور دوسرے دن میں باقی نصف۔اپنے ساتھ ایک اچھا سا کیمرہ رکھیں تا کہ اچھی تصویریں لے سکیں۔کیونکہ آئینوں کی وجہ سے موبائل کیمرہ یا عام کیمرہ سے اچھی تصویریں لینا یہاں ایک مشکل عمل ہے۔

''کاخِ گلستان'' سے نکلنے کے بعد ہم صاف شفاف سڑکوں سے گزرتے ہوئے کچھ ہی دوری پر واقع 'سارواسٹریٹ ،شاہد حقانی شاہ راہ،وانک اسکائیرے' کی طرف گئے جہاں ''اسلامی انقلاب اور پاک دفاعی میوزیم'' ہے۔سارو اسٹریٹ کے آخر پر میوزیم کی بنیادی رہداری پر ایک بڑے دروازے کی مانند محراب نما عمارت کھڑی ہے جس کا محراب آسمان کی جانب توجہ مرکوز کرا رہا ہے اور اس محراب کے نیچے تین چھوٹے چھوٹے محراب نما لیکن خوبصورت جھالیوں سے بند دروازے ،جن کے سامنے ایک گول دروازے نما عمارت تعمیر کی گئی ہے۔اس کے نیچے جہاں کچھ گمنام شہداء دفن ہیں ،وہیں وہ دو شہید بھائی بھی مدفون ہیں جن کی اصل نشاندہی ڈی۔این۔اے ٹیسٹ کرانے کے بعد کی گئی۔

میوزیم کے اندر جانے سے پہلے ہم نے میوزیم کے احاطے میں ہی نیچے بنے ''یاس ریسٹورنٹ'' میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ یہ ریسٹورنٹ بڑا ہی دلکش تھا۔کھانا کھانے کے لئے کافی جگہ موجود تھی اور سکون بھرا ماحول میسر تھا۔کھانے میں ہمیں ہندوستانی یا پھر پاکستانی برآمد شدہ باسمتی چاول اور اسے سجانے کے لئے سفید چاول کے اوپر ایک طرف ہلکا سا زعفرانی رنگ کا چاول رکھا گیا تھا، اس کے ساتھ آدھا مرغا ، دہی ،سلاد (مختلف اقسام کی سبزیاں)بوتل بند پانی پیش کیا گیا۔میرے بغیر سبھی لوگوں نے ''کوکا کولا'' پیا۔کھانا بہت لذیذ تھا اور بڑے ہی سلیقے سے پروسا گیا۔کوکا کولا پر ہلکی سی بحث یہ ہوئی کہ اگر یہ امریکی کمپنی ہے تو پھر ایران میں کس طرح سے اس کی رسائی ممکن ہو پا رہی ہے۔لیکن بوتل پر لکھا گیا تھا کہ یہ شہر تہران میں ہی تیار ہوئی ہے۔اس پر وہاں پر بیٹھے مترجم جناب حبیب صاحب نے یہ جواب دیا کہ ہو سکتا کہ اس کمپنی کے ساتھ معاہدہ بہت پہلے ہوا ہو۔اس لئے اس کے فروخت پر کوئی پابندی یا اعتراض نہیں ہونا

چاہئے۔

کھانا کھانے کے بعد ہم نے ظہر کی نماز ادا کرنے کے لئے ''یاس ریسٹورنٹ'' کے صاف وشفاف غسل خانے میں وضو کیا اور اس کے بعد میوزیم کے ساتھ ہی بنی ایک خوبصورت مسجد ''خرم شہر جامع مسجد'' میں نماز ادا کی۔ ایران کی اکثر مساجد میں جوتوں یا چپل کے لئے پالی تھین سے بنے لفافے استعمال کئے جاتے ہیں اور وہاں یہ رواج عام ہے کہ آپ اپنے ساتھ انہی لفافوں میں جوتے یا چپل مسجد کے اندر لے جا کر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ میوزیم کی اس مسجد میں پالتی تھین لفافوں کے بجائے، موٹے کپڑے سے بنے جوتے رکھنے کے لئے مخصوص قسم کے سبز بیگ مسجد کے دروازے پر رکھے گئے تھے تاکہ انہی میں جوتے یا چپل رکھ کر آرام سے نماز ادا کی جاسکے۔

''اسلامی انقلاب اور پاک دفاعی میوزیم'' کی سب سے بڑی بات مجھے یہ پسند آئی کہ اس کا نام بڑی ہی سوجھ بوجھ اور سوچ سمجھ کر رکھا گیا ہے۔ ہر ملک میں جنگ اور شہیدوں کی یاد میں اپنے اپنے طریقے سے کوئی نہ کوئی یادگار بنائی جاتی ہے لیکن اکثر ممالک میں اِس طرح کی یادگار کو ''جنگی یادگار'' جیسے ''وار میموریل'' (War Memmorial) کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر ہم سرینگر سے کرگل کی طرف جائیں گے تو ہمیں دراس کے قریب کرگل جنگ کے بعد اس جنگ کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے ایک یادگار بنائی گئی ہے۔ جس کا نام ''کرگل وار میموریل'' یا دوسرے معنوں میں ''کرگل جنگی یادگار'' رکھا گیا ہے۔ ایران نے اپنی اس یادگار کا نام ''جنگی'' رکھنے کے بجائے ''دفاعی'' رکھا ہے جس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہم جنگ کے خواہش مند نہیں۔ لیکن جب جنگ ہم پر تھوپی گئی تو ہم نے اپنا دفاع کیا۔ ان معنوں میں انہوں نے یہاں بھی ایک پرامن قوم ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے اور اس کے پس پشت یہ دلیل بھی دی گئی ہے کہ اسلام ہمیں امن کا سبق دے رہا۔ ایسے میں مسلمان جنگی ذہن کا نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے برعکس اکثر ممالک جنگی ساز وسامان یا پھر جنگ میں جیت کے طریقہ کار کو دکھانا اپنا اہم کارنامہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ایران نے جنگ جیتنے کے باوجود جنگ کی جیت پر خوشی ظاہر نہیں کی بلکہ اس

''دفاعی یادگار'' میں جانے کے بعد ایسا کہیں بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ جنگی جنون کو پیش کرنے کی علامت ہے بلکہ اس کے برعکس یہ جنگ میں ہو رہی تباہ کاریوں کو بیان کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جنگ تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں دیتی۔

میوزیم کی ''خرم شہر جامع مسجد'' میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہم ''اسلامی انقلاب اور پاک دفاعی میوزیم'' دیکھنے کی طرف بڑھے۔ اندر داخل ہونے سے پہلے مرکزی دروازے اور مزار شہداء کے قریب ہی ''سلام اسکائر'' بنایا گیا ہے۔ آفتاب کی مانند بنایا گیا یہ اسکائر ان شہیدوں کو سلام پیش کر رہا ہے، جنہوں نے ایران کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ میں ہی دوسری جانب ''پرچم برج'' (Flag Tower) بنایا گیا ہے۔ اس برج کی لمبائی 210 میٹر اور یہ تقریباً ایک ہزار مربع میٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس برج پر اسلامی جمہوریہ ایران کا سہ رنگی پرچم لہرا رہا تھا اور یہ رنگ اس بات کی وضاحت کر رہے ہیں کہ ہم نے یہ ملک خون سے سینچ کر حاصل کیا ہے اور ہم ایک اللہ کو ماننے والے اس سرسبز زمین کے پر امن لوگ ہیں۔

ایران نے ماحولیات کی جانب خاص توجہ دی ہے۔ یہاں چاروں طرف سرسبز درختوں کے ساتھ ساتھ پھولوں کے چھوٹے بڑے خوش نما باغ نظر آئیں گے۔ اس معاملے میں ''اسلامی انقلاب اور پاک دفاعی میوزیم'' بھی پیچھے نہیں۔ میوزیم کے منتظمین نے میوزیم کے ایک طرف ایک وسیع وعریض باغ کی بنیاد رکھی ہے۔ اس باغ میں لاکھوں کی تعداد میں درخت، جھاڑیاں اور مختلف اقسام کے پھول اور پھل دل کو چھو جاتے ہیں۔ اس باغ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے جنوبی حصے میں حضرت امام حسینؑ اور کربلا کے 72 شہداء کی یاد میں 72 کھجور کے درخت لگائے گئے ہیں۔

''اسلامی انقلاب اور پاک دفاعی میوزیم'' جتنا دلکش باہر سے نظر آرہا ہے اندر سے اس سے کہیں زیادہ دلکش نظر آرہا ہے۔ میوزیم کی تقریباً آٹھ منزلیں اب تک بنائی گئی ہیں اور اس پر اب بھی کام جاری وساری ہے۔ میوزیم کی سب سے بڑی خصوصیت ''محسوس'' کرانے کی یا

''احساس'' دلانے کی وہ کوشش ہے، جسے انسان کے اندر سعدی کے شعر کے مصداق یہ احساس پیدا ہو جائے:

بنی آدم اعضای یکدیگرند — کہ در آفرینش زیک گوہرند
چو عضوی بہ درد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار
تو کز محنت دیگران بی غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی

(ترجمہ) ''بنی آدم ایک دوسرے کے اعضا کی مانند ہیں اور اگر ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو دوسرے اعضاء میں درد پیدا ہونا چاہیئے''۔ دراصل اس میوزیم کا بیانیہ یہ نہیں کہ ہم جنگ جیت گئے ہیں بلکہ ایران جنگ کی جیت کے بعد اس بات کو دل و ذہن سے محسوس کروانا چاہتا ہے کہ جنگ تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مترجم جناب حبیب کے مطابق اصل میں انقلاب کے فوراً بعد جو جنگ عراق کی ''باتھ'' پارٹی کے ذریعے ایران پر مسلط کی گئی، یہ میوزیم اس جنگ کے غیر یقینی مضمرات کو ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اسے حقیقی رنگ میں محسوس کروانے کی کوشش کرتا ہے۔ میوزیم کے جس بھی حصے میں جائیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ جاری ہے اور ہم اس وقت جنگ زدہ بستی سے ایک حقیقی صحافی کی مانند گزرتے ہوئے اس کی عکس بندی کر رہے ہیں یا یہ سب معمہ ہمارے ساتھ ہمارے آس پاس ہو رہا ہے۔ ایک حصے (سیکشن) میں خستہ حال اسکول کو اس طرح سے دکھایا گیا ہے کہ جیسے ابھی ابھی اس پر بم گرا ہو اور بچے پڑھ رہے تھے۔ کلاس میں میز اور کرسیاں بکھری پڑی ہیں، بلیک بورڈ پر استاد سفید چاک سے لکھنے کی کوشش میں تھا کہ صورت حال سیاہ ہوگئی۔ بم اور گولیوں نے اسکول کو تہس نہس کر ڈالا۔ بچے کہاں گئے ہوں گے، یکا یک دیواریں سرخ کیوں ہوگئیں!۔

ایک اور حصے (سیکشن) میں دکھایا جا رہا ہے کہ کس طرح لوگ ہڑ بڑی میں ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ ایمبولینس آرہی ہے اور زخمیوں کو لے جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ماں بچوں کو اور بچے ماں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ جدید تکنیکی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے صوتی اثر (Sound Effect) کے ذریعے چیخ و پکار کا ایسا قدرتی ماحول پیدا کیا گیا کہ دیکھنے والا کچھ

پل کے لئے خود کو اسی ماحول میں پا کر اس منظر میں گم ہو جاتا ہے۔ کچھ سیکشنوں میں جنگ کے ماحول کی ایسی منظرکشی پیش کی گئی ہے کہ آوازوں نیز حرکت پذیری یا حیویۃ (Animation) کی مدد سے اسے حقیقی جنگی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان ایسے مناظر کو دیکھ نہیں پاتا اور وہاں سے فوراً باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ مقصد یہاں ڈر پیدا کرنا نہیں بلکہ یہ احساس دلانا ہے کہ ان پر کیا گزری ہوگی جو ایسے ماحول سے گزرے ہوں گے۔

اسی طرح سے اس میوزیم میں ایسے بھی حصے بنائے گئے ہیں کہ جہاں سے گزرتے وقت وہاں کے موسم کی یاددہانی کرائی جاتی ہے۔ مقصد یہ بات باور کرانی ہے کہ افواج وطن کی حفاظت کے لئے کس طرح کے ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک حصے سے گزرتے وقت وہاں کا درجہ حرارت منفی درجہ حرارت کے ماحول کا بنایا گیا تھا کہ اس وقت تہران میں باہر تقریباً 47 ڈگری سیلشیس کی گرمی تھی لیکن اس کمرے میں چند پل رہنے کے بعد اتنی سردی محسوس ہوئی کہ جی چاہتا تھا کہ ہم کب اس سردی سے باہر نکلیں۔ باوجود اس کے کہ میرا تعلق کشمیر سے ہے اور مجھے سردی میں رہنے کی عادت ہے لیکن میں اس شدت کی سردی کو برداشت نہیں کر سکا۔ اسی طرح اس سے آگے والا کمرہ زبردست گرم بنایا گیا تھا کہ سرد کمرے سے نکلنے کے باوجود اتنی شدت کی گرمی محسوس ہوئی کہ پسینے چھوٹ گئے۔ ان کمروں میں یہ دکھایا گیا کہ فوجی اس ماحول میں بھی اپنی ڈیوٹی نبھا رہے ہیں۔ شاید انہوں نے یہاں ''شمال'' اور ''جنوب'' کے موسم کو مدنظر رکھتے ہوئے ان موسموں میں رہنے کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔

میوزیم کے کئی ایک کمروں کو سنیمائی صورت دی گئی تھی۔ ایسے ہی ایک کمرے میں اندھیرے کا سماں تھا، کرسیاں لگی ہوئی تھیں، کرسیوں کے آگے ایک بڑا پردہ لگا ہوا تھا۔ جوں ہی میں ایک نشست پر بیٹھا، سامنے پردے پر خودکار طریقے سے ایران اور عراق جنگ کے تعلق سے ایک دستاویزی فلم شروع ہوگئی۔ میں نے کچھ پل اس فلم کو دیکھنے کی کوشش کی۔ چونکہ وقت بہت کم تھا اس لئے میں اسے مکمل طور نہیں دیکھ پایا۔ آپ کی اطلاع کے لئے یہ بھی رقم کرتا چلوں کہ ہم نے اکثر تین ابعادی 3D سنیما کے بارے میں سنا ہے۔ لیکن اس میوزیم میں پانچ ابعادی

5D سینما کی سہولیات بھی موجود ہیں۔ جہاں جنگ میں ہونے والی تباہ کاریوں کو جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے سامعین کو دکھایا جاتا ہے۔ آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ جہاں میوزیم میں سینما کی جدید تر سہولیات مہیا رکھی گئی ہیں وہی یہاں پر اسلامی انقلاب اور پاک دفاع کے تعلق سے ایک ٹیکنیکل کتب خانہ بھی بنایا گیا ہے جس میں کتابی اور ڈیجیٹل شکل میں دفاع سے متعلق مواد دستیاب رکھا گیا ہے۔ یہ کتب خانہ محققین کو نادر علمی سرمایہ مہیا کرانے میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

''اسلامی انقلاب اور پاک دفاعی میوزیم'' کے ایک حصے میں ان شخصیات کے مجسمے بنائے گئے ہیں جنہیں عراق ایران جنگ کے بعد شہید کیا گیا۔ ان میں سائنس دان اور خصوصاً وہ ایٹمی سائنس دان شامل ہیں، جنہیں گھر سے دفتر نکلتے وقت یا دفتر سے گھر جاتے وقت شہید کیا گیا۔ ان سائنس دانوں کی وہ نجی چیزیں جیسے کمر بند، شلوار قمیض، بٹوہ، قلم، کتاب، عینک وغیرہ شیشے کے فریم میں ان کی مختلف گھریلو تصویروں کے ساتھ رکھی گئی ہیں۔ یہ منظر کشی خوبصورتی سے ان کے زندگی گزارنے کے طریقے کو پیش کر رہی ہے۔ انہیں اکثر اپنی گاڑیوں میں ہی شہید کیا گیا تھا۔ اس لئے میوزیم کے باہری حصے میں ان گاڑیوں کو بھی نمائش کے لئے رکھا گیا ہے جن میں ان سائنس دانوں کو شہید کیا گیا۔ میوزیم کے ایک حصے میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ عراق ایران جنگ کے دوران گرفتار شدہ ایرانی فوجی کس طرح سے عراقی اذیت، بربریت اور تفتیش سے گزرتے تھے۔ ان زیادتیوں کے دوران انہیں کن جان لیوا مراحل سے گزرنا پڑا' اس منظر کو بیان کرنے کے لئے وہاں میوزیم میں ایک گرفتار شدہ سبکدوش فوجی بیٹھا ہوا تھا اور وہ وہاں پر آنے والے لوگوں کو اپنے ان دنوں کی خوفناک داستان بیان کر رہا تھا کہ کس طرح کا برا برتاؤ عراقی فوجیوں نے ان کے ساتھ کیا۔ اس کی داستان سن کر سب خون کے آنسو رونے لگے، انہیں گلے لگایا اور ان کے اس عزم کو سلام کیا۔

ہمارے ساتھ جو سیاحتی رہنما اور مترجم جناب حبیب تھے، انہوں نے کہا کہ چونکہ آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس لئے آپ میوزیم میں پیش کئے جانے والے ایک اہم پروگرام کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ اس پروگرام کے لئے یہاں دیر تک رکنا لازمی ہے۔ کیونکہ اس کی

شروعات شام کے بعد ہی ہوتی ہے۔ اگر آپ رات گئے تک رکتے تو یہاں پر روزانہ منعقد ہونے والے اس خوبصورت اور انوکھے پروگرام سے لطف اندوز ہو جاتے۔ رات دیر گئے میوزیم کے باغ کا فوارا موسیقی کی تال پر بجلی اور پانی کی مدد سے ایسا دلکش رقص پیش کرتا ہے جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں اور اس کے ساتھ اونچی آواز میں اسپیکروں کے ذریعے ایک دل چھو لینے والا فارسی گانا گایا جاتا ہے، جس کے پہلے مصرعے کا اردو ترجمہ میں نے کچھ یوں کرنے کی کوشش کی ہے:

اے صبح کے پرندے، تتلی سے سیکھ کہ کیسے عشق کیا جاتا ہے

''اسلامی انقلاب اور پاک دفاعی میوزیم'' سے نکلنے کے بعد ہم حضرت امام خمینی کے گھر ''جماران'' کی جانب گئے جو وہاں سے کچھ دوری پر ایلبر وز پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ یہاں جانے کے لئے ڈھلوان سڑک اختیار کرنی پڑتی ہے۔ پہلے امام خمینی یہاں کرایہ پر رہتے تھے۔ 17 مئی 1980ء کو یہ گھر باضابطہ امام کی ملکیت میں دیا گیا یا انہوں نے اسے خریدا۔ یہ گھر بہت ہی سادہ ہے۔ جس کمرے میں امام رہتے تھے اسے ہم نے دیکھا۔ اس گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا آنگن اور اس آنگن کے تقریباً دس بیس قدم کے فاصلے پر ایک حُسینیہ (جسے کشمیر میں ''امام باڑہ'' کہا جاتا ہے۔) ہے۔ اس حُسینیہ کا اصل دروازہ سڑک کی طرف سے کھلتا ہے جہاں سے زائرین آتے جاتے تھے۔ جس دروازے سے امام خمینی اس حُسینیہ میں داخل ہوتے تھے، وہ دروازہ اوپر کی جانب سے ان کے گھر کے سامنے سے کھلتا ہے۔ اوپر والے دروازے جو کہ امام کے آنگن سے کھلتا ہے کے سامنے ہی بیٹھنے کے لئے ایک چبوترہ بنایا گیا ہے اور چبوترے پر وہ کرسی رکھی گئی ہے جس پر امام بیٹھ کر خطبہ یا درس وغیرہ دیا کرتے تھے۔ چبوترے کے بائیں جانب نیچے والے دروازے سے داخل ہوتے ہی بائیں جانب ایک بڑا ایل۔سی۔ڈی لگا ہے۔ آج کل آنے والے زائرین کے لئے اس پر وہ خطبات دکھائے جاتے ہیں جو امام خمینی نے اس حُسینیہ میں دیئے تھے۔

حُسینیہ کے نچلی جانب ایک اور بڑا کمرہ ہے جس میں امام خمینی کے گھر پر مامور ملازمین کا

دفتر اور ساتھ میں ایک جانب امام خمینی کی تصویروں پر مبنی گیلری بھی موجود ہے۔ یہاں امام کی کتابیں بھی رکھی گئی ہیں جنہیں آنے والے زائرین میں مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ بات مجھے وہاں معلوم ہوئی کہ امام مفسرِ قرآن بھی تھے اور ان کی لکھی گئی تفسیر ''تفسیر وشواہد قرآنی'' امام خمینی کے آثار میں (پہلی جلد) کا اردو ترجمہ مجھے وہاں کے منتظمین نے مفت عنایت فرمایا۔ یہ بات بھی مجھ پر وہیں کھلی کہ امام خمینی شاعر بھی تھے ان کے کلام کا نام ''دیوانِ امام'' ہے اور اس کا اردو زبان میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ لیکن وہاں پر اس وقت اس ترجمے کا کوئی بھی نسخہ موجود نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ اسے انشا اللہ دوبارہ شائع کیا جائے گا۔

حضرت امام خمینی کی رہائش گاہ جمارن سے نکلنے کے بعد ہم ''برج میلاد، تہران'' دیکھنے کے لئے نکلے۔ وہاں جانے کے لئے ہم نے جو راستہ اختیار کیا، ہمارے سیاحتی رہنما نے کہا کہ یہ راستہ وسطی ایشیاء کا سب سے طویل راستہ ہے۔ اس راستے کا نام ''خیابانِ ولیعصر'' (جس کا تلفظ کچھ اِس طرح اردو میں ادا کیا جاسکتا ہے 'ولی عصر') ہے۔ حالانکہ ہم ایک مختصر وقت تک اس شاہراہ سے گزرے۔ لیکن جہاں تک ہم اس شاہراہ سے گزرے وہاں تک یہی محسوس ہوا کہ یہ شاہراہ کشادہ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی خوبصورت ہے اور سب سے بڑی بات یہ شاہراہ سایہ دار ہے۔ شاہراہ کے بیچ میں چھوٹے چھوٹے خوش نما درخت اور جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ کئی اقسام کے پھول لگے ہونے کے علاوہ شاہراہ کے دونوں جانب مختلف قسم کے سایہ دار رخت لگائے گئے تھے۔ گزرتے وقت یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے آفتاب کی کرنیں ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔ ایسے میں ہم آفتاب کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے اب آفتاب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے لئے تہران کے مشہور ومعروف 435 میٹر اونچے بُرج ''بُرج میلاد، تہران'' پہنچے۔

پہلی بات تو یہ کہ، یہ اونچی عمارت تہران کی اس جگہ پر بنائی گئی ہے جو شہر تہران میں قدرے انچائی پر ایک چھوٹے مگر ہموار ٹیلے رپر واقع ہے۔ یہاں پر اس کے بنانے کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اول تو یہ کہ یہ جگہ تمام تہران میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ دوم یہ کہ زمین

کی انچائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عمارت کی اونچائی کم کی جائے تاکہ عمارت کی اونچائی کو زمین کی اونچائی میں ضم کرکے آسانی سے تہران کے زیادہ تر حصے کا نظارہ کیا جاسکے۔

یہ برج ایران کے فنکاروں اور انجینئر وں کے کمالِ فن کو ظاہر کر رہا ہے۔ یہی وجہ کہ اقتصادی پابندیوں کے باوجود ایران نے ایسی عمارتیں بھی بنائی ہیں کہ جن کا شمار دنیا کی بہترین عمارتوں میں کیا جاسکتا ہے۔ 2019ء کے اعداد وشمار کے مطابق اس برج کا شمار دنیا کی سات اونچی عمارتوں میں چھٹے نمبر پر ہوتا ہے۔ وہیں اسی اعداد وشمار کے مطابق یہ خوب صورت عمارت دنیا کی بہترین اونچی عمارتوں میں انیسویں نمبر پر شمار کی جاتی ہے۔

''بُرج میلاد''، تہران میں داخل ہوتے ہی ہمارے لئے داخلے کے لئے جو ٹکٹیں ہمارے رہنمائے سفر نے خریدی تھیں، وہ ہمیں دی گئیں تاکہ ہم لفٹ کے اندر جاتے وقت ان کا استعمال کرسکیں۔ لفٹ میں جانے سے پہلے ہمیں پہلی منزل میں کرسیوں پر بٹھایا گیا اور سامنے ایک خوبصورت حسینہ بڑے دلکش انداز میں زبانِ فارسی میں تہران کے اس ''بُرج میلاد'' کی خصوصیات نیز اس بُرج میں داخل ہونے کے طریقہ کار اس طرح سے بیان کر رہی تھی کہ فارسی سے ناواقفیت ہونے کے باوجود دل چاہ رہا تھا کہ اس کے خوبصورت اندازِ بیان کو بار بار سنا جائے۔ میں سوچ رہا تھا کہ عرصہ دراز سے ''بی بی سی'' کی ''اردو سروس'' سے نشر ہونے والے پروگرام خاص کر عالمی خبریں کیونکر روز بہ روز مقبولیت حاصل کرتے جا رہے ہیں، اس کے بجائے ہندوستانی میڈیا کی نشریات سرمایہ ہونے کے باوجود اس طرح کی مقبولیت حاصل کر نہیں پا رہی ہیں۔ میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی وجہ خبر پہنچانے کا طریقہ کار ہے۔ بی بی سی کے طریقہ کار میں آوازیں یا انداز بیان ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستانی میڈیا کے طریقہ کار میں ڈرامائیت زیادہ نظر آرہی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ میں فارسی زبان سے واقف نہیں لیکن ناوقفیت ہونے کے باوجود طرز ادا نے یہاں کام کیا۔ اسی طرح اس مصوری پر زیادہ توجہ کیوں مرکوز کر کے اسے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو دیکھنے والے کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے۔ میری نظر میں اس کے پس پشت سب سے بڑی دلیل سادگیِ اظہار ہے۔ بے

زبانی یہاں زبان کا کام کر ہی جاتی ہے۔

قدرتی ماحول سیاحت کے لئے موزوں ہوتا ہے۔ مقامی شعبہ سیاحت کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ اس قدرتی ماحول کے لئے ایسا سازگار اور پرلطف ماحول تیار کیا جائے کہ سیاح خود بہ خود اس کی طرف کھنچتے چلے آئیں۔ ایران کی وزارت یا شعبہ سیاحت اس ضمن میں کافی حد تک کامیاب ہے۔ اقتصادی پابندیاں ہونے کے باجود ایران نے دنیا بھر کے سیاحوں کو اپنی جانب کھینچنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ اس ضمن میں ایران کے شعبہ سیاحت نے باقی چیزوں کے ساتھ ساتھ بہترین انسانی وسائل کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ سیاحتی رہنما (Tour Guides) ہوں، ہوٹل میں کام کرنے والے لوگ ہوں، کسی جگہ ٹکٹ دینے والے لوگ ہوں، ٹیکسی والے ہوں یا پھر اسی طرح سے کسی سیاحتی مقام کے ملازمین' ہر کوئی شخص با اخلاق ہے اور ہر طرح کی خوبیاں اس میں نظر آ ہی جائیں گی۔

میں یہاں پر تہران کے "بُرج میلاد" کی اس خوش گلو لڑکی کی گفتگو کی طرف واپس لوٹ رہا ہوں کہ اس کا اندازِ بیان کتنا نرالا تھا۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انتظار کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور ایسی جگہوں پر جہاں زبردست بھیڑ بھاڑ ہو، وہاں پر انتظار کروانا وہ بھی بنا کسی حفاظتی دستے کے' ایک بڑی ہی فنکاری ہے اور یہاں پر یہ فنکاری اس لڑکی کی آواز میں پوشیدہ تھی کہ آپ اسے سننا پسند کرتے تھے اور یوں بھیڑ کم ہوتی ہی جا رہی تھی اور دوسری بات یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اگر وہ محترمہ اپنی گفتگو بند نہ کرتی اور جانے کا اشارہ نہ کرتی کوئی اٹھنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا۔ میں اسے آواز اور ادائے اظہار کی سحر کاری سمجھتا ہوں جو اللہ نے اسے عنایت فرمائی ہے۔

اس اہم معلومات کو سننے کے بعد تھوڑی دیر تک ایک قطار میں انتظار کرنے کے بعد ہم دائیں جانب لگے لفٹ (Elevator) میں داخل ہوئے۔ میرے اندازے کے مطابق اس لفٹ میں تقریباً چالیس افراد کے جانے کی گنجائش تھی اور جس وقت ہم اس میں داخل ہوئے اس وقت بھی قریب قریب اس لفٹ میں چالیس افراد ہی سفر کر رہے تھے۔ اس لفٹ سے بُرج کی سب سے وسیع و عریض ساتھویں منزل تک پہنچنے میں ایک منٹ کا وقت لگا ہوگا جو کہ تقریباً زمینی

سطح سے 280 میٹر کی اونچائی پر واقع ہے اور اس دوران باہر کے مناظر لفٹ کے شفاف شیشوں سے اپنی طرف اس نوعیت سے کھینچتے تھے کہ خوشی اور خوف کا انمول امتزاج ظاہر ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ ڈر کو چھپانے کے لئے خوشی ظاہر کر رہے تھے اور اکثر عورتیں تھوڑی بہت چیخ اور پکار بھی کرتی نظر آئیں۔ آنکھ جھپکتے ہی ہم بنیادی منزل سے ساتھویں منزل تک پہنچ گئے۔

لفٹ سے باہر آتے ہی محسوس ہوا کہ جیسے ہم آسمان کے قریب ہوں۔ یہ جگہ بُرج کی سب سے وسیع اور کھلی جگہ تھی۔ آگے موٹے لوہے کی یکساں مربع والی جالی لگی ہوئی تھی۔ جس طرح سے تہران کے اکثر مقامات سے اس بُرج کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سے یہاں سے پورے تہران کا کھل کر نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ لوگ اپنی تصویریں بنا رہے تھے۔ محفوظ اور سازگار جگہ کے بموجب اِس سلسلے میں زیادہ تر لوگ سیلفی کھینچنے میں مست تھے۔ ہم نے بھی اپنے موبائل فون کے کیمرے کے ذریعے تصویریں کھینچی۔ میں نے موبائل فون کے کیمرے کو جالی دار تار کے اس کھلے مربع والے حصے پر رکھا جہاں سے کیمرے کو باہر دیکھنے کی مکمل آزادی تھی۔ یوں میں نے اپنے طریقے سے تہران شہر کو اپنے کیمرے میں قید کرنے کی کوشش کی۔ اس منزل میں دو ایک جگہ دوربینوں کو بھی نصب کیا گیا تھا تاکہ ان دوربینوں کی مدد سے بھی آپ شہر کا کھل کر صاف اور قریبی نظارہ کر سکیں۔

تہران کے اس ''بُرج میلاد'' میں کئی ایک اعلیٰ درجے کے وسائل دستیاب ہیں۔ مترجم کے مطابق یہاں پر دنیا کا سب سے بڑا 360 ڈگری گھومنے والا ریسٹورنٹ موجود ہے جو ایک گھنٹے میں ایک چکر مکمل لگا لیتا ہے اور اس دوران سیاح ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے باہر تہران کا ہر سَمت سے نظارہ کر سکتے ہیں۔ اس ریسٹورنٹ کی تمام دیواروں پر فردوسی کے ''شاہنامہ'' کی کہانیاں لکھی گئی ہے۔ یہ دراصل اپنے علمی سرمائے اور تہذیبی ورثے کی تشہیر کا ایک عمدہ طریقہ ہے۔ اس کے ساتھ یہاں پر کافی اور چائے پینے کے لئے ''کیفے'' کی سہولیات بھی دستیاب ہیں۔ یہاں پر ''شہر داری تہران میوزیم'' (Tehran Municipality Museum) بھی موجود ہے جس میں ہاتھ سے لکھے گئے دو سو سالہ قدیم ایران کے مختلف اعلیٰ

عہدہ داروں کے دستاویز شامل ہیں جو اس بات کو تاریخی شواہد سے ثابت کرتے ہیں کہ اصل میں ایران اور عرب کے درمیان سمندری حصے کا اصل نام ''خلیج فارس'' ہے، نہ کہ ''خلیج عرب''۔اس لئے اس میوزیم کے فرش کو سترھویں صدی سے بیسوی صدی تک کے جارج پومپیڈو (George Pompidou) کے بنائے گئے لکڑی سے بنے تاریخی گلوب سے سجایا گیا ہے۔

اس بات کو اس طرح سے پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ ہر کوئی اس بات سے واقف ہے کہ اس کا اصل نام خلیج فارس ہی ہے۔ایک حصے میں ایران کی تاریخ کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس بُرج میں سنیما کی سہولیات کے علاوہ سات ابعادی 7D سنیما کی طرز کا کھیل بھی دستیاب ہے۔بچوں کے کھیلنے کے لئے طرح طرح کی سہولیات مہیا رکھی گئی ہیں۔ہم نے یہاں کئی لوگوں سے بات چیت کی، ان میں ہمدان سے آیا ہوا ایک خاندان اس بھی شامل تھا، جو ایران کے شعبہ صحت سے وابستہ تھے۔ان کے بچوں کے ساتھ ہم نے تصویریں بھی کھینچی۔

آج 20 جولائی کو ہم ''بیت الامام خمینی'' یا ''بیت امام'' یعنی ''امام کے گھر'' کو دیکھنے کے لئے گئے۔ یہ گھر شہر قم کے ''یخ چال قاضی'' کے محلّہ میں واقع ہے۔ یہ گھر امام نے 1956ء میں تیرہ ہزار تمان میں خریدا جو کہ انہوں نے ''خمین'' میں موجود ان کی آبائی وراثت کو فروخت کرنے کے بعد حاصل کئے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ امام پہلے اس میں بطور کرایہ دار کے بھی رہتے تھے۔یہ گھر نہایت ہی سادہ اور قدیم طرز تعمیر کا نظر آرہا ہے۔اس گھر کے دو حصے ہیں ایک سرداب اور دوسرا ہمکف۔اس گھر کے جنوب میں اس کا آنگن ہے جس کے مرکز میں پانی کے فوارے جیسے ایک چھوٹا سا (گھڑا) بنایا گیا ہے، جو شاید گھر کی تزئین کے وقت بنایا گیا ہو۔جنوب کو چھوڑ کے باقی سَمتوں میں سائبان ہے اور اس کے بیچ میں زینہ کا راستہ ہے یہ زینہ اس عمارت کو اندرونی اور بیرونی حصے میں تقسیم کر دیتا ہے۔اسے اب شاید اسلامی جمہور یہ ایران کی وازارتِ اقتصادی نے مرمت کی ہے۔لیکن اس گھر کی دوبارہ تعمیر نہیں کی گئی ہے بلکہ اسی ڈھانچے کی تزئین وآرائش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جب ہم اس گھر میں داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ اس گھر کے باہری دروازے پر دو طرح کی قدیم طرز کی ہاتھ سے بجنے والی گھنٹیاں موجود تھیں۔ یہاں پر ہمارے سیاحتی رہنما جناب محمد خیریان نے انہیں بجا کر دکھایا کہ ان دو گھنٹیوں کو بجاتے وقت الگ الگ طرح کی آوازیں آتی ہیں۔ دراصل دو گھنٹیاں رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک گھنٹی امام سے ملنے کے لئے آنے والے مرد اور ایک آنے والی خواتین استعمال کرسکیں اور باہر سے ہی پتہ چلے کہ کون آیا ہے تاکہ خواتین پردے کے پیچھے رہ کر امام سے ملاقات کرسکیں یا اس معاملے میں ملاقات کے لئے کوئی اور طریقہ کار بھی اپنایا جارہا تھا۔ یہاں سے اندر داخل ہوتے ہی ایک بڑا کمرہ ہے۔ امام اسی کمرے میں رہ کر مہمانوں اور زائرین سے ملتے تھے۔

آج کل اندر آنے اور جانے کے لئے دو الگ الگ راستے بنائے گئے ہیں۔ اندر پہنچتے ہی مہمانوں اور زائرین کو چائے پلائی جاتی ہے اور لوگ بیٹھ کر یہاں چائے پینا پسند بھی کرتے ہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ ہم نے امام کے گھر میں چائے پی۔ فرش پر ایک خوبصورت ایرانی قالین بچھایا گیا ہے۔ باہر جانے والے راستے کے ایک طرف کمرے میں ایک عالم دین اور امام کی زندگی سے واقف کار ایک بزرگ شخص بھی بیٹھتے ہیں جن سے امام کی زندگی سے متعلق آپ سوالات پوچھ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ''بیت امام'' میں ایک شخص جو کہ انتظامیہ کی جانب سے مقرر کیا گیا ہے، انگریزی زبان میں غیر ملکی سیاحوں اور زائرین کو اس گھر کے مختلف حصوں نیز امام کی اس گھر میں بسر کی گئی زندگی کے ایام کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کر رہا تھا۔ یہاں لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

''بیت امام'' سے نکلنے کے بعد ہم ''مرکز بین المللی ترجمہ ونشر المصطفیٰ'' جس کا ہم اردو زبان میں کچھ یوں ترجمہ کرسکتے ہیں ''مرکز برائے دارالترجمہ ونشر اشاعت جامعہ المصطفیٰ

(Al Mustafa International Centre for Translation & Publication) سے وابستہ کتابوں کی دکان پر گئے جو کہ بلوار امین، سہ راہ سالاریہ، قم میں واقع ہے۔ المصطفیٰ بین الاقوامی یونیورسٹی کے ''مرکز برائے دارالترجمہ ونشر واشاعت جامعہ

المصطفیٰ'' کا مرکزی دفتر میدان شہداء، خیابانِ حجتی میں واقع ہے۔ یہاں پر مختلف کتابوں کا فارسی زبان اور فارسی زبان میں لکھی گئی کتابوں کا دیگر عالمی زبانوں میں بھی ترجمہ کرایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں دوسری زبانوں سے وابستہ اہم کتابوں کو بھی شائع کیا جاتا ہے۔ میں نے اس دارالترجمہ کے ''اردو سیکشن'' میں جہاں اردو میں ترجمہ کی گئی مختلف کتابیں دیکھی، وہیں میں نے ایک کشمیری مصنف جناب غلام محمد متو المعروف غلام محمد گلزار کی اردو میں لکھی گئی کتاب ''تاریخ شیعانِ کشمیر'' بھی وہاں پر دستیاب تھی جو کہ ادارے نے شائع کی تھی۔ یہاں سے اردو زبان میں لکھی گئی کتابیں اور وہ کتابیں جو فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ کی گئی ہیں، دستیاب تھیں۔ میں نے وہاں پر رکھی گئی اردو کتابوں کی طویل فہرست میں چن کر چند ایک کتابیں خریدی۔ اِن کتابوں کو خریدنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کی موضوع کی مناسبت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے یہ کتابیں خریدی تاکہ تقابلی مطالعہ کی راہ ہموار ہو جائے۔

راقم نے جو کتابیں وہاں سے خریدی اُن میں جناب سید عباس رضوی (مونس) کی کتاب ''تفسیر القرآن وھوالھدیٰ والفرقان' کا تنقیدی جائزہ''۔ حسین شیر افگن کی کتاب جسے ریاست حسین نے اردو میں ترجمہ کیا ہے ''تجزیہ و ترکیب''۔ آیت اللہ جواد آملی کی تصنیف کردہ کتاب ''امام علی کی عارفانہ زندگی'' اس کتاب کے مترجم اقبال حیدر حیدری ہیں۔ اخلاق حسین کی ترجمہ کردہ حسین مہدی زادہ کی کتاب ''قانون عقل و وحی'' ایک فارسی کتاب جو ڈاکٹر حبیب صاحب کے پاس ہے۔ اس کے علاوہ ''معاونت تحقیق مجتمع آموزش عالی فقہ'' کی ترتیب دی گئی کتاب ''دینی سوالات کے جوابات'' پر مبنی کتاب ''شعاعِ تحقیق: دینی سوالات کے جوابات'' اس کتاب کے مترجم سید حسین اختر رضوی اعظمی ہیں۔

اِن کتابوں کے علاوہ قارئین کی معلومات کے لئے میں مرکز سے شائع شدہ کتابوں کی فہرست یہاں پر رقم کرنا لازمی سمجھتا ہوں، جو کتابیں ''مرکز برائے دارالترجمہ ونشر واشاعت جامعہ المصطفیٰ'' کی کتابوں کی اس دوکان پر ''اردو زبان'' میں دستیاب ہیں تاکہ اگر کوئی اردو پڑھنے والا ان کتابوں کے مطالعہ میں دلچسپی رکھتا ہو تو وہ انہیں اس فروشگاہ سے حاصل کر سکتا ہے۔ زبان

وادب سے تعلق رکھنے والوں کے لئے عرض کرتا چلوں کہ اس سلسلے میں یہاں کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔اس فہرست میں آپ کو زبان وادب کے حوالے سے دوایک کتابیں ہی ملیں گی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ فارسی زبان و ادب خصوصاً جدید فارسی زبان وادب میں لکھی گئی ادبی کتابوں کا اردو ترجمہ مل سکے۔ مگر تمام بڑی کتابوں کی دکانوں پر تلاشِ بسیار کے باوجود مجھے کوئی بھی کامیابی ہاتھ نہیں آئی اور اس سلسلے میں راقم نے تہران یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے اساتذہ خصوصاً پروفیسر علی بیات صاحب اور ڈاکٹر علی کاوسی نژاد صاحب سے بھی اس بارے میں استفسار کیا کہ فارسی ادب سے وابستہ کتابیں اردو میں ترجمہ کیوں نہیں ہو پا رہی ہیں؟ بہر کیف ''مرکز برائے دارالترجمہ ونشر واشاعت جامعہ المصطفیٰؑ'' سے شائع شدہ اردو کتابوں کی فہرست کچھ اس طرح سے ہے:

نمبر شمار	کتاب کو عنوان	مصنف/مرتب/مترجم	نوعیت
1	علم صرف	حمید جزائری/ ذاکر حسین طاہری	زبان وادب
2	تجزیہ وترکیب	حسین شیر افگن/ ریاست حسین	زبان وادب
3	الکوہی فضیلت	ابراہیم امینی/حمید حسن زیدی	اخلاق وتربیت
4	ادب اسلامی جلد(1)	محمد عندلیب/سید اصغر کمیل زیدی	اخلاق وتربیت
5	ادب اسلامی جلد(2)	محمد عندلیب/سید اصغر کمیل زیدی	اخلاق وتربیت
6	آسمان علم تک قدم بہ قدم	محمد عابدی/سید وجیہ اکبر زیدی	اخلاق وتربیت
7	اخلاقِ معاشرت	جواد محدثی/ افسر علی عترتی مظفر نگری	اخلاق وتربیت
8	تبلیغ ومبلغ	محمد موحدی نژاد/سید نسیم عباس کاظمی	اخلاق وتربیت
9	اتحاد الفریقین	سید شجاعت حسین رضوی	ادیان ومذہب
10	وہابیت: مبانی فکری وکارنامہ عملی	جعفر سبحانی تبریزی/محمد سبطین	ادیان ومذہب

11	وہابیت ایک نظر میں	ناظم حسین اکبر	ادیان و مذہب
12	بازار سرمایہ اسلامی (2)	سید اختشام رضا نقوی	اقتصادیات
13	امتیازات علوی	ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی/ سید شاہد حسین رضوی ہندی	سیرت و تاریخ
14	تاریخ وسیرت معصومین: جلد 2	سید منذر حکیم/سید کمیل اصغر زیدی	سیرت و تاریخ
15	خطبہ حضرت زینب در کاخ یزید	سید توقیر عباس کاظمی	سیرت و تاریخ
16	تاریخ سیاسی اسلام	رسول جعفریان/ طارق حبیب/سید کمیل اصغر زیدی	سیرت و تاریخ
17	اہل بیت کی سیاست میں جذب مخالفین	سید محسن مہدی زیدی	سیرت و تاریخ
18	تاریخ فلک	وزیر عباس حیدری مظفر نگری	سیرت و تاریخ
19	تاریخ فرہنگ وتمدن اسلامی	محمد رضا کاشفی	سیرت و تاریخ
20	تاریخ شیعان کشمیر	غلام محمد گلزار	تاریخ عمومی
21	سنن نبی	محمد حسین طباطبائی/ کرار حسین اظہری مبارک پوری ہندی	حدیث و رجال
22	تعلیمات علوی	موسسہ فکر اسلامیہ	حدیث و رجال
23	گزید غرر الحکم و درر الکلام	عبدالواحد بن محمد تمیمی آمدی / محمد فائض باقری	حدیث و رجال
24	سیری در صحیحین	محمد صادق نجمی/محمد منیر خان	حدیث و رجال
25	حقوق فرزندان در مکتب اہل بیت	محمد جواد طبسی مروجی/سید علی افضل زیدی	حقوق و قضا

26	اسلام کا عادلانہ نظام	غلام اکبر حیدری	حقوق وقضا
27	آئندہ انسان واسلام	محمد حکیمی/ اخلاق حسین پکھناری	علوم اجتماعی
28	فرہنگ وتمدن غرب در پاکستان	سید عابد رضوی	علوم اجتماعی
29	مسجد میں خواتین کا حضور	امجد علی ننگرو	علوم اجتماعی
30	آزادی اور دین سالاری	جعفر سبحانی تبریزی/ سید مُراد رضا رضوی	علوم سیاسی
31	انیشہ سیاسی شہید مطہری	مجموعہ مولفان/ عون علی کریمی	علوم سیاسی
32	اتحاد الفریقین	محمد بشیر	علوم سیاسی
33	نظریہ ولایت فقیہ کے بنیادی اصول	مصطفیٰ جعفر پیشہ فرد/ محسن رضا جعفری	علوم سیاسی
34	امام خمینی کے سیاسی افکار	یحییٰ فوزی تویسر کانی/ معصومہ بتول نقوی	علوم سیاسی
35	آشنائی با معارف القرآن ، مفاہیم اعتقادی، تفسیر موضوعی	صالح قنادی	علوم قرآن وتفسیر
36	کیف تحفظ القرآن	شہر یار پرہیز گار/ سید کمیل اصغر زیدی	علوم قرآن وتفسیر
37	حفظ موضوعی قرآن کریم	سید علی میر داماد نجف آبادی	علوم قرآن وتفسیر
38	درس نامہ علومِ قرآن	حسین جوان آراستہ/ سید ہادی حسن	علوم قرآن وتفسیر
39	تعلیمات قرآن	موسسہ قرآن وعترت	علوم قرآن وتفسیر
40	قرآن وامام حسین	محسن قراشتی/ سید نصرت علی جعفری	علوم قرآن وتفسیر

40	علامہ طباطبائی اور المیزان کی تفسیری روش	علی اوسی/ رجب علی حیدری	علوم قرآن وتفسیر
41	آشنائی با معارف قرآن، قصہ ہائے قرآنی، تفسیر موضوعی	اقبال حیدر حیدری	علوم قرآن وتفسیر
42	تحریف قرآن کے بطلان کا تحلیلی جائزہ	محمد ہادی معرفت/ عارف حسین مبارک	علوم قرآن وتفسیر
43	تاریخ تفسیر ومفسرین	سید علوی مہر/ سید بہار علی زیدی	علوم قرآن وتفسیر
44	نقوش فقیہ در غیبت امام زماں	سید شمشاد حسین رضوی	فقہ واصول
45	کلیاتِ فقہ اسلامی	حسن قاسمیان/ سید مبین حیدر رضوی	فقہ واصول
46	احکامِ حجاب وعفت	حمید جلفائی/ سید ہادی حسن رضوی	فقہ واصول
47	احکام ازدواج دائم و موقت مطابق بافتاوای مراجع عظام	سید حجت موسیٰ خوئی/ فیروز علی بنارسی	فقہ واصول
48	نماز کے بارے میں ایک سو سوالات وجوابات	مجتبیٰ کلباسی/ اخلاق حسین پکھناری	فقہ واصول
49	احکام بانوان	محمد وحیدی/ سید شمع محمد رضوی	فقہ واصول
50	قانون منکحات (کتاب نکاح)	سید افتخار حسین نقوی نجفی	فقہ واصول
51	نماز جمعہ کا فقہی اور تاریخی پس منظر	عزیز الدین رضا نژاد/ محسن رضا جعفری	فقہ واصول

52	تقیہ از نگاہ اسلام	غلام مرتضیٰ انصاری	فقہ واصول
53	قانون عقل ووحی	حسن مہدی زادہ/ اخلاق حسین پکھناری	فلسفہ ومنطق
54	خطوط کلی حکمت متعالیہ	عبدالرسول عبودیت	فلسفہ ومنطق
55	جوابات سخنان سپاہ صحابہ	علی کورنی عاملی/ سید ابو محمد نقوی	کلام وعقائد
56	غدیر شناسی و پاسخ بہ شبہات	علی اصغر رضوائی/ اقبال حیدر حیدری	کلام وعقائد
57	فی رحاب عقیدہ۔ جلد 1،2،3	سید محمد سید حکیم/ شاہ مظاہر حسن	کلام وعقائد
58	امام حسن وامام حسین از نظر اہل سنت	سید محمد علی موسوی	کلام وعقائد
59	شعیہ شناسی	علی ربانی گلپاپگانی/ سید منظر صادق زیدی	کلام وعقائد
60	خلقت اہل بیت کا راز	سید محمد علی موسوی/ اقبال حیدر حیدری	کلام وعقائد
61	آفتاب فقاہت (زندگی نامہ مقام معظم رہبری)	محمد یعقوب بشوی	معارف اسلام
62	اسرار نماز	رجب علی حیدری مظفر نگری	معارف اسلام
63	تعلیماتِ نہج البلاغہ	موسسہ فکری اسلامی انگلستان	معارف اسلام
64	اہل بیت : کشتی نجات	محمد باقر مقدسی	معارف اسلام
65	اہل بیت: سفینۃ النجاۃ	غلام محمد فخر الدین نجفی	معارف اسلام
66	آثار وبرکات نماز	رجب علی حیدری مظفر نگری	معارف اسلام

67	سید رضی: زندگی و کارنامہ	زاہد علی ہندی	معارف اسلام
68	آداب دعا	رجب علی حیدری مظفر نگری	معارف اسلام
69	پرتو پژوہش جلد 1	مجتمع آموزش عالی فقہ	معارف اسلام
70	صحیفہ شہادت فرمودات امام حسین	محمد صادق نجمی	معارف اسلام
71	سوال وجواب قیام امام حسین	مجموعہ مولفان/ سید نجم الحسن نقوی	معارف اسلام
72	پیغمبر اکرم سے متعلق دفاعی مباحث کا سلسلہ	علی اصغر رضوائی	معارف اسلام
73	مولفہ ہائے حیات طیبہ در قرآن	امجد علی ننگرو	معارف اسلام
74	ہدیہ مبلغین	ناظم حسین اکبر	معارف اسلام
75	بازار کوفہ میں حضرت زینب کا خطبہ	سید توقیر عباس کاظمی	معارف اسلام
76	مفلسی اور ثروت مندی	سید توقیر عباس کاظمی	معارف اسلام
77	صبح انتظار	ثامر ہاشم العمید ی/ اخلاق حسین پکھناری	مہدویت
78	درسنامہ تاریخ عصر غیبت	سید اخلاق حسین پکھناری	مہدویت
79	یک کام بہ سوی ظہور	سید توقیر عباس کاظمی	مہدویت
80	نقد احادیث مہدویت از دید گاہ اہل سنت	محمد یعقوب بشوی	مہدویت
81	عصر غیبت میں وجود امام مہدی کے فوائد	سید توقیر عباس کاظمی	مہدویت

جیسا کہ میں نے پہلے بھی رقم کیا کہ میں اردو زبان وادب کے تعلق سے کتابیں تلاش کرنے کی میں مصروف تھا کہ اسی دوران ہم 22 شہداء اِسٹریٹ، قم ایران پر واقع ایک کتب

فروش کے پاس پہنچے جس کی دکان بڑی سڑک سے اندر جانے والی چھوٹی سڑک بلکہ ایک بڑی گلی کے عقب پر واقع تھی۔ اس کتب فروش کا نام ''انصاری پبلی کیشنز'' تھا۔ اس کے پاس زیادہ تر دینی کتابیں موجود تھیں۔ لیکن جس بات کے لئے میں نے یہاں اس کتب فروش ''انصاری پبلی کیشنز'' کا ذکر چھیڑا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس بھی اردو زبان میں دینیات کی کتابوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ساتھ میں اردو صرف ونحو سے متعلق بھی ایک کتاب موجود تھی۔ لیکن کتاب کی یہ آخری کاپی دستیاب تھی، اس لئے کتب فروش ان جلدوں کو فروخت کرنے کے لئے رضا مند نہیں ہوا، اس پہ طرہ یہ کہ کتاب ''ہارڈ باوئنڈ'' میں تھی، اس لئے اس کا وزن کافی تھا جو سفری شرائط کے لئے صحیح نہیں ہے۔ جب میں نے ان سے یہ سوال کیا کہ کیا اردو کی کتابوں کو بھی کوئی خریدتا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ظاہر ہے کہ جب ہماری دکان پر اتنی تعداد میں اردو کی کتابیں دستیاب ہیں انہیں ہم نے شوقیہ طور نہیں رکھا ہے بلکہ فروخت کرنے کی غرض سے ہی یہ کتابیں یہاں رکھی گئی ہیں اور ہر روز ہم اردو زبان کی کتابیں فروخت کرتے ہیں۔ میں نے ان سے دوسرا سوال یہ کیا کہ خریدنے والے کہاں سے آتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اس سلسلے میں زیادہ تر خریداروں کی تعداد ہندوستان اور پاکستان سے آنے والے زایرئین کی ہوتی ہے۔ ''انصاری پبلی کیشنز'' صرف کتابیں فروخت ہی نہیں کرتا تھا بلکہ وہ باضابطہ کتابوں کو شائع بھی کرتا تھا۔

ہمارے ساتھ اِس ورکشاپ میں حصہ لینے آئی انگلستان سے وابستہ محترمہ فرحانہ بقادیہ صاحبہ اور شاہین اسماعیل صاحبہ نے یہاں ''انصاری پبلی کیشنز'' سے 'سلطان الواعظین شیرازی' کی تصنیف کردہ فارسی کتاب ''شبہائے پیشاور'' (پیشاور کی راتیں) جس کا انگریزی میں 'حامد توینلین اور چارلس علی کیمبل' نے ''پیشاور نائٹس'' (Peshawar Nights) کے نام سے ترجمہ کیا تھا اور اس کتاب کو 'انصاری پبلی کیشنز'' نے ہی شائع کیا تھا، خرید کر ہمیں تحفے میں دے دی۔

(جاری)

..........●●● ....

افسانے

● ......سلام بن رزاق

ندی

ندی بہت بڑی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا پاٹ کافی چوڑا رہا ہوگا۔ مگر اب تو بے چاری سوکھ ساکھ کر اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب اس کے دونوں کناروں پر تاڑ اور ناریل کے آسمان گیر درخت اگے ہوئے تھے جن کے گھنے سائے ندی کے گہرے، شانت اور شفاف پانی میں یوں ایستادہ نظر آتے جیسے کسی پر جلال بادشاہ کے دربار میں مصاحب سر نیوڑھائے کھڑے ہوں۔ مگر اب درختوں کی ساری شادابی لٹ چکی تھی اور ان کے ٹنڈ مُنڈ خشک صورت تنے کسی قحط زدہ علاقے کے بھوکے کنگال لوگوں کی طرح بے رونق اور نادار لگ رہے تھے۔

ندی بہت بڑی تھی اور اس کا پاٹ اب بھی گزری ہوئی عظمت اور وسعت کی غمازی کرتا نظر آتا۔ مگر اب اس طرح خشک ہوگئی تھی کہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے بے ڈھنگے ٹاپو ابھر آئے تھے۔ حدِ نظر تک چھوٹے بڑے بے شمار ٹاپو۔

اب ان ٹاپوؤں پر کہیں کہیں خودرو گھاس اور جنگلی جھاڑیاں بھی اگ آئی تھیں جن میں ہزاروں لاکھوں ٹڈے اور جھینگر شب و روز پھدکتے رہتے۔ گھاس کے نیچے کیچڑ میں لاکھوں کیڑے رینگتے کلبلاتے رہتے اور جب دوپہر کی تپا دینے والی دھوپ میں کم کم گدلا بدبودار پانی تپنے لگتا تو ندی کی مچھلیاں اس طرح ادھر ادھر منہ چھپاتی پھرتیں جیسے کسی پردہ دار گھرانے کی بہو بیٹیاں بھرے بازار میں بے نقاب کردی گئی ہوں۔ مچھلیوں کی تعداد دن بہ دن کم ہوتی جارہی تھی اور ٹڈے،

جھینگر، کیڑے مکوڑوں اور مینڈکوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ دوپہر ڈھلے ندی کے نیم گرم، گدلے پانی سے چھوٹے بڑے بے شمار مینڈک نکلتے اور ان ٹاپوؤں پر بیٹھ کر ٹراتے رہتے۔ ہر ٹاپو پر ایک بڑے مینڈک کا قبضہ تھا اور ہر ایک کے چھوٹے چھوٹے سیکڑوں معتقد یا حلقہ بگوش تھے جو ہر دم اس کی ٹراہٹ کی تائید میں خود بھی ٹراتے رہتے۔

''میں اس ندی کا وارث ہوں۔'' بڑا مینڈک۔

''ہاں! آپ اس ندی کے وارث ہیں۔'' چھوٹے مینڈک۔

''اس ندی کے ایک ایک ٹاپو پر میرا اختیار ہے۔''

''اس ندی کے ایک ایک ٹاپو پر آپ کا اختیار ہے۔''

''میں۔۔۔میں۔۔۔چاہوں تو۔۔۔''

بڑا مینڈک مناسب دعوے کے لیے آنکھیں مٹکا کر ادھر ادھر دیکھتا اور ذرا سے توقف کے بعد کہتا۔

''میں چاہوں تو ایک جست میں اس چمکتے سورج کو آسمان سے نوچ کر پاتال میں پھینک دوں۔''

''آپ چاہیں تو۔۔۔'' چھوٹے مینڈک دھوپ سے اپنی آنکھوں کو مچماتے ہوئے حسبِ عادت بڑے مینڈک کی تائید کرتے کہ بڑے مینڈک کی خوشنودی ان کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔

پھر پاس ہی کے کسی ٹاپو سے ایک موٹے پیٹ اور پتلی ٹانگوں والا کوئی مینڈک گمبھیر آواز میں اپنے معتقد سے پوچھتا۔

''کون ہے یہ؟ کون ہے یہ احمق؟''

ایک طرار مینڈک پُھدک کر کہتا۔

''وہی ہمارا ذلیل پڑوسی ہے جس کے اجداد حضور کے کفش بردار رہ چکے ہیں۔''

''اوہو، اس نمک حرام سے کہو کہ سورج پر کمند ڈالنے سے پہلے ہمارے قدم چومے کہ خورشید ہمارے نقشِ کفِ پا کے سوا کچھ نہیں۔''

اس کی لن ترانی کے جواب میں کسی تیسرے ٹاپو سے آواز آتی۔

''یہ کون گستاخ ہے۔اسے آگاہ کردو، اپنی زبان کو قابو میں رکھے کہ ہم زبان درازوں کی زبانیں یوں کھینچ لیتے ہیں جیسے ملک الموت جسم سے روح۔''

''خاموش، خاموش، اس ندی کا ایک ایک ٹاپو ہماری زد میں ہے۔''

اس کے بعد ہر ٹاپو سے ایک نئی آواز بلند ہونے لگتی۔ ہر آواز پہلی آواز سے زیادہ تیز ہر دعویٰ پہلے دعوے سے زیادہ بلند و رافع۔ ایسا شور مچاتا کہ بے چاری مچھلیاں خوفزدہ ہوکر چہ بچوں کی تہوں میں جا چھپتیں۔ درختوں کی شاخوں پر بیٹھے پرند پھڑ پھڑا کر اڑتے اور جدھر جس کا سینگ سماتا چلا جاتا ٹرّ اٹرا ٓکر مینڈکوں کے گلے رُندھ جاتے، پھول پھول کر پیٹ پھٹ جاتے اور بیسوں مینڈک اپنے ہی بلند بانگ دعووں کے وزن تلے دب دب کر کچل جاتے اور پھر دھیرے دھیرے تمام ٹاپوؤں پر ایک خوفناک سکوت طاری ہو جاتا نہ کسی مینڈک کی ٹرٹر نہ کسی جھینگر کی جھائیں جھائیں۔ مگر یہ سکوت ایک مختصر سے وقفے کے لیے ہوتا۔ دوسرے دن پھر مینڈک اپنے اپنے ٹاپوؤں پر جمع ہوتے اور پھر وہی لاف گزاف۔ ایک دن اسی طرح بڑے چھوٹے مینڈک اپنے اپنے ٹاپوؤں سے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے، ایک دوسرے پر کیچڑ اچھال رہے تھے۔ ایک دوسرے کو ذلیل کررہے تھے، گالیاں بک رہے تھے۔ مچھلیاں چھوٹے چھوٹے چہ بچوں میں اوپری سطح پر تیرتی اس لڑائی کو خوف اور حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے گھاس اور پودوں کی جڑوں میں دبک گئے تھے۔ ندی کے کنارے پھدکتی چڑیاں دم بخود اس بحث کو سن رہی تھیں۔

تبھی ندی کے ایک گوشے میں کچھ ہلچل سی ہوئی۔ پہلے تو سطح آب پر بڑے بڑے بلبلے پیدا ہوئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کوئی پانی کی سطح پر نمودار ہوا۔ یہ ایک بیحد بوڑھا مگرمچھ تھا۔ اتنا بوڑھا کہ اس کی کیچلیاں جھڑ چکی تھیں۔ ڈم کے دانتے کندے پڑ گئے تھے اور اس کی پشت پر باریک باریک سبزہ اگ آیا تھا۔ اس نے اپنی پوری قوت سے ڈم کو اس کیچڑ آلود پانی کی سطح پر دے مارا۔ ایک زور کا چھپاکا ہوا اور پانی کے چھینٹے اڑ کر دور دور تک پہنچے۔ مختلف ٹاپوؤں پر شور مچاتے مینڈک یک بیک چپ ہو گئے۔ سب اپنی پچھلی ٹانگوں پر اچک اچک کر اس آواز کی سمت دیکھنے

لگے۔ آخر سبھوں نے بوڑھے مگر مچھ کو دیکھ لیا۔ سبھی مینڈک بوڑھے مگر مچھ کا بے حد احترام کرتے تھے بلکہ بعض اس سے خوف زدہ بھی رہتے تھے۔ کیوں کہ ان کے آباواجداد کے مطابق بوڑھا مگر مچھ اس ندی کی بدلتی ہوئی تاریخ کا چشم دید گواہ تھا۔

اس کی عمر کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی ہستی صدیوں کے دوش پر قرنوں کا فاصلہ طے کر چکی تھی۔ تمام مینڈکوں نے ٹرا ٹرا کر بوڑھے مگر مچھ کی جے جے کار کی۔ بوڑھے مگر مچھ نے اپنی بھاری دُم پٹک کر اور اپنا لمبا چوڑا جبڑا کھول کر خوشی کا اظہار کیا۔ پھر رینگتا ہوا ایک اونچی چٹان پر چڑھ گیا۔ چٹان پر پہنچ کر اس نے ندی کے اطراف نگاہ ڈالی۔۔۔اب ندی۔۔۔ندی کہاں تھی؟ وہ تو بس چند ٹاپوؤں اور چہ بچوں کا مجموعہ ہو کر رہ گئی تھی۔ جگہ جگہ ریت کے خشک تودے ابھر آئے تھے۔ کہیں کہیں گڈھوں میں پانی کے بجائے صرف کیچڑ تھا۔ ندی کے دونوں کناروں پر خودرو گھاس ضرور اگی ہوئی تھی مگر پانی کی کمی کے کارن گھاس کا رنگ بھی زرد پڑتا جا رہا تھا۔ ناریل، سپاری اور تاڑ کے درخت بانس کے جنگل کی طرح خشک اور ویران لگ رہے تھے۔ ندی کی اس بدلی ہوئی کیفیت کو دیکھ کر مگر مچھ کا دل بھر آیا۔ قریب تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے بہہ نکلتے۔ اس نے کمالِ ضبط سے ان آنسوؤں کو روکا۔ مبادا ندی کے یہ بے ضمیر باسی انھیں حسبِ روایت مگر مچھ کے آنسو کہہ کر ان کی تضحیک نہ کریں پھر اس نے اپنے دیدے گھما کر ادھر ادھر ٹاپوؤں پر بیٹھے مینڈکوں کو دیکھا۔ سارے مینڈک دم سادھے بیٹھے تھے۔ مگر مچھ نے پھنکار کر گلا صاف کیا، پھر بھرائی آواز میں بولا:

''اے ندی کے باسیو! کبھی تم نے اس بلند چٹان سے ندی کو دیکھا ہے؟''

تمام مینڈک ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر سبھوں نے بیک زبان اعتراف کیا۔

''نہیں۔۔۔ہم نے اس بلند چٹان سے کبھی ندی کو نہیں دیکھا۔''

''دیکھو! یہاں سے ندی کو دیکھو تو تم پر تمہارے بے بضاعت ٹاپوؤں کی حقیقت آشکار ہو جائیگی۔''

''مگر ہم وہاں سے ندی کو کیوں دیکھیں کہ ندی تو ہمارے لہو میں جاری وساری ہے۔''

''عریاں حقیقتوں کو سیمابی لفظوں کا لباس نہ پہناؤ کہ الفاظ جذبے کے اظہار کا بہت ادنیٰ ذریعہ

ہیں۔ خود تسلّی، عارضی اطمینان کی سبیل ضرور ہے مگر یہی اطمینان مکمل تباہی کا پہلا بگل بھی ہے۔"

تبھی ایک کونے سے ایک پستہ قد زرد فام مینڈک نے ٹرا کر کہا:

"میں دیکھ سکتا ہوں۔ بلندی سے میں ندی کا نظارہ کر سکتا ہوں۔"

تمام مینڈک اس زرد فام مینڈک کی طرف مڑے۔ وہ پندرہ بیس مینڈکوں کے کاندھوں پر چڑھا سینہ پھلائے نہایت حقارت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے مگر مچھ سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے دانائے راز! کیا میں ان تمام سفالی ہستیوں سے سربلند نہیں ہوں کہ یہ ندی کراں تا کراں میری نگاہ کی زد میں ہے۔"

ابھی اس کے الفاظ فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ مینڈکوں کا اہرام لرزا اور ایک دوسرے کے کاندھوں پر چڑھے ہوئے مینڈک دھپ دھپ نیچے لڑھک گئے۔ دو چار کمزور مینڈکوں کی تو آنتیں نکل آئیں۔ بعض وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اردگرد کے ٹاپوؤں کے مینڈک بے تحاشا قہقہے لگانے لگے۔ ہنسی قہقہے، فقرے بازی اور شوروغوغا سے تھوڑی دیر تک کان پڑی آواز سنائی نہیں دی۔

آخر مگر مچھ کو مداخلت کرنی پڑی۔

"خاموش، خاموش اے ندی کے باسیو! خاموش، یہ جائے مسرت نہیں مقام عبرت ہے کہ تمہاری چھوٹی چھوٹی نفرتوں نے تمہارے قد گھٹا دیے ہیں اور تم۔۔۔ تم سب اپنی ہی لاشوں پر قہقہے لگانے کے لیے زندہ ہو۔"

"اے صاحب عقل و دانش! کیا ہمیں اپنے دشمن کی مات پر خوش ہونے کا حق نہیں۔ یہ فتنۂ حرام عرصۂ دراز سے دوسروں کے کاندھوں پر چڑھ کر ہمیں دھمکاتا رہتا تھا۔"

"دشمن!"، مگر مچھ نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"تم نہیں جانتے کہ بعض اوقات دشمنی بھی تمہارے ظرف کا پیمانہ بن جاتی ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو مرنے والے کی صورت میں تمہیں اپنی صورت دکھائی دیگی۔ کان کھول کر سنو۔ اس کی آواز میں تمہیں اپنی آواز سنائی دے گی۔ دشمن کی شناخت مشکل ہے اس لیے کہ دوست کی شناخت مشکل ہے۔"

"اے مدّ بر وقت! تو ہی ہمیں کوئی تدبیر بتا کہ ہمارے دل نفرتوں کے غبار سے ڈھل جائیں اور ہمارے سینے محبتوں کے نور سے معمور ہو جائیں۔ تجھے ہم عقل وفہم کا پتلا اور تجربات کا مرقع جانتے ہیں۔"

"اگر ماحول ساز گار نہ ہو تو تدّبر تضحیک کا نشانہ اور تجربہ تہمت کا بہانہ بن جاتا ہے یاد رکھو گھورے پر کبھی گلاب نہیں کھلتے۔ تم نے نفرت بوئی تھی نفرت ہی کاٹو گے۔۔۔"

"مگر تیرے سوا کون ہماری رہنمائی کر سکتا ہے کہ ہم بالاتفاق رائے تجھے اپنا مرّبی سمجھتے ہیں۔"

ایک چت کبرا مینڈک پھدک کر مگرمچھ کے قریب ہوتا ہوا مکھن چپڑے لہجے میں بولا اور پھر اس انداز سے چاروں طرف دیدے گھمائے جیسے اپنے ہم جلیسوں سے کہہ رہا ہو۔ میرا کاٹا کبھی بھولے سے نہ پانی مانگے۔

بوڑھا مگرمچھ اس چالاک مینڈک کی نیت بھانپ گیا۔ ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی اور پھر دوسرے مینڈکوں سے مخاطب ہوا۔

"مرّبی ایک ایسے بدطینت شخص کو کہتے ہیں جو زیردستوں کی دست گیری محض اس لیے کرتا ہے کہ وہ تاحیات اس کی غلامی کا دم بھرتے رہیں۔"

مگرمچھ کے اس کرارے جواب نے مختلف ٹاپوؤں میں ایک غلغلہ ڈال دیا۔ دیر تک مینڈک ٹراتے اور قہقہے لگاتے رہے اور وہ چت کبرا مینڈک غصے اور ندامت سے پیچ وتاب کھانے لگا۔ جب شور ذرا کم ہوا تو چت کبرا مینڈک ہوا میں قلابازی کھاتا ہوا چیخا۔

"اَنا۔۔۔ اے ناصح نامہربان، تیری تلخ نوائی نے میری انا کو لہولہان کر دیا۔ اپنی انا کی حفاظت میری زندگی کا مقصد اعلیٰ ہے۔ میں تلوار کا گھاؤ سہہ سکتا ہوں۔ اپنی انا پر ضرب نہیں سہہ سکتا۔"

"اَنا"۔۔۔ مگرمچھ نے اس چھوٹے سے مینڈک کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے حقارت سے کہا۔

"چیونٹی اپنے منہ میں شکر کا دانہ لیے چلتی ہے تو اپنی دانست میں سات پہاڑوں کا بوجھ اس پر لدا ہوتا ہے۔ تم اپنی ڈیڑھ انچ کی انانیت کو آخر اس قدر اہمیت کیوں دیتے ہو جو پانی کے ایک ریلے سے بہہ جاتی ہے، ہوا کے ایک معمولی جھونکے سے اڑ جاتی ہے۔ جب تک تمہاری انانیت

تمہارے وجود کا حصہ نہیں بنتی، وہ چھپکلی کی کٹی دم کی مانند بے حقیقت اور حقیر ہے۔ تمہاری مشکل یہ ہے کہ تم سب چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بٹے ہو اور ہر کوئی اپنے جزیرے کو کرۂ ارض کے برابر سمجھتا ہے۔''

مگرمچھ کا یہ وار بہت صاف اور تیکھا تھا۔ شدید تکلیف سے ان کے لہو میں گرہیں پڑ گئیں۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ غصہ ذلّت اور ندامت نے ان کی عجیب کیفیت کر دی تھی۔ انھیں لگ رہا تھا کوئی انھیں رسّی کی طرح بٹتا جا رہا ہے۔ مگر وہ کیا کر سکتے تھے کہ ان کے پاس نہ سانپ کا سا پھن تھا، نہ بچھو کا سا ڈنک۔ البتہ وہ چیخ سکتے تھے کہ اب ان کی چیخ ہی ان کے وجود کی گواہی بن سکتی تھی۔ لہٰذا ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بیک زبان ٹرّانے لگے۔ اپنی ہستی کی انتہائی بنیادوں سے ٹرّانے لگے۔ مگرمچھ ضبط و تحمل سے ان کی ٹراہٹ سنتا رہا۔ اور خاموشی سے ان کے گلوں کی پھولتی پچکتی جھلیوں کو دیکھتا رہا۔ جب ٹراتے ٹراتے ان کی گردنوں کی جھلیاں لٹک گئیں، پیٹ پچک گئے۔ تب مگرمچھ نے آہستہ سے گردن اٹھائی۔ یہاں سے وہاں تک بکھرے ہوئے مینڈکوں پر ایک متاسفانہ نگاہ ڈالی، چھوٹے بڑے، نیلے پیلے، کالے، سفید، دبلے پتلے، موٹے تگڑے۔ سارے کے سارے مینڈک منہ کھولے، گردنیں ڈالے گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ اب ان کی آخری چیخ بھی ان کے سینے کی لحد میں سو چکی تھی۔ آخر ایک طویل وقفے کے بعد مگرمچھ گویا ہوا۔

''اے ندی کے باسیو! تم میں سے ہر کوئی خود غرضی کے محور پر پھرکی کی طرح گھوم رہا ہے۔ تمہاری نظروں میں سارے رنگ یوں گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ اب رنگوں کی تمیز ممکن نہیں۔ لہٰذا اب میرے پاس تم سب کے لیے ایک سفّاک دعا کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں دعا مانگتا ہوں۔ دعا کے اختتام پر باآوازِ بلند 'آمین' کہنا۔ یہی تمہاری نجات کا آخری حیلہ ہے۔''

مینڈکوں نے مگرمچھ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اپنے کرچی کرچی وجود کے ساتھ ٹکر ٹکر اسے گھورتے رہے۔ اب اجالے کے پر سمٹنے لگے تھے۔ سورج ایک کیکر کے دوشاخے میں پھنسا پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کے خون کی لالی قطرہ قطرہ ندی کے چہ بچوں میں سونا گھول رہی تھی۔

فضا میں ایک عجب سی دل کو مسوس دینے والی اداسی بس گئی تھی۔ تبھی مگر مچھ نے آسمان کی طرف منہ اٹھایا۔ آنکھیں بند کرلیں اور دعا مانگنے لگا۔

"اے بحر و بر کے مالک! اے خشکی کو تری اور تری کو خشکی میں بدلنے والے۔۔۔ زمانہ بیت گیا یہ ندی سوکھتی جارہی ہے اور ہم کہ جنھیں ایک ہی ندی کے باسی کہلانا تھا، الگ الگ ٹاپوؤں میں بٹ گئے ہیں۔ اے قطرے سے دریا بہانے والے اور ندیوں کو سمندر سے ملانے والے ہمارے رب! ہماری اس سوکھی ندی میں کسی صورت باڑھ کا سامان پیدا کر، تا کہ ہم جو ان چھوٹے چھوٹے ٹاپوؤں میں تقسیم ہوگئے ہیں پھر اسی ندی میں گھل مل جائیں اور اس کے وسیع دامن میں جذب ہو کر اسی کا ایک حصہ بن جائیں!

سیلاب! صرف ایک تند و تیز سیلاب!!"

مگر مچھ دعا ختم کر کے تھوڑی دیر تک آنکھیں موندے مینڈکوں کے 'آمین' کہنے کا منتظر رہا۔ مگر جب کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی کہیں سے 'آمین' کی صدا نہیں آئی تب اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اردگرد کے ٹاپو خالی پڑے تھے۔ تمام مینڈک ندی کے کم کم، گدلے اور بدبودار پانی میں ڈبکیاں لگا چکے تھے۔

............●●● ....

● ......اقبال حسن آزاد

جادوگر

وہ ہوا میں معلق تھا۔

اوپر آسمان تھا اور نیچے زمین......

لیکن وہ نہ تو آسمان پر تھا نہ زمین پر......

وہ تو بس ہوا میں معلق تھا۔

ہوا یوں کہ ایک مصروف شاہراہ کے کنارے ایک جادوگر اپنا تماشا دکھا رہا تھا۔ اس کے سر پر ایک لمبا سا ہیٹ تھا، آنکھوں پر خوبصورت فریم کا چشمہ، ہلکی سفید مونچھیں اور منہ میں سگار۔ سگار کو سلگایا نہیں گیا تھا۔ شاید وہ صرف ایک نمائشی حربہ تھا۔ اس نے ملگجے رنگ کا ایک لانبا سا اُوور کوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور اسی رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ پیروں میں گرد آلود لیکن مضبوط جوتے تھے۔ گویا اس کی زندگی اسفار سے عبارت تھی۔ اس کے کاندھے پر ایک بڑی سی زنبیل تھی جس میں دنیا بھر کے تجربات و مشاہدات بند تھے۔ اس نے زنبیل ایک جانب رکھی اوور کوٹ کی جیب سے ایک ڈگڈگی نکال کر اسے بجانا شروع کیا۔ ڈگڈگی کی آواز سن کر راہ گیر اس کی جانب متوجہ ہونے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گرد تماش بینوں کی بھیڑ لگ گئی۔ اس بھیڑ میں بچے بھی تھے، بوڑھے بھی اور جوان بھی۔ لیکن کوئی عورت نہ تھی۔ جب بہت سارے لوگ جمع ہو گئے تب اُس نے اپنے منہ میں دبے سگار کو نکال کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور پھر اس کی زبان سے سحر زدہ کرنے والے الفاظ نکلنے لگے۔ اُس کی زنبیل میں دنیا بھر کے قصے تھے جنہیں وہ

مزے لے لے کر سنا رہا تھا۔ مجمع اس کی باتوں کو بہت غور سے سن رہا تھا۔ اس کی باتوں پر زور زور سے تالیاں بجنے لگیں۔ وقفے وقفے سے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور اس دوران گہری نظروں سے تماش بینوں کو دیکھتا۔ اس کی خاموشی پر بھی تالیاں بجتیں اور جب تالیوں کی گڑ گڑاہٹ ختم ہو جاتی تو وہ پھر سے بولنا شروع کر دیتا۔ جب اُس کے قصے سنانے کا سلسہ ختم ہوا تو اُس نے ایک دس گیارہ برس کے بچے کو اشارے سے اپنی جانب بُلایا۔ پہلے تو وہ ہچکچایا، پھر اُس نے مُڑ کر اپنے والد کی طرف دیکھا۔ والد نے اسے آنکھ کے اشارے سے اجازت دے دی۔ تب وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا جادوگر کے پاس پہنچا۔ جادوگر نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ پھر اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کوئی منتر پڑھنا شروع کیا۔ بچے کی آنکھیں مُندنے لگیں۔ منتر پڑھ چکنے کے بعد اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

’اُڑ جاؤ‘‘ اور بچے کسی پرندے کی طرح آسمان کی جانب اُڑ چلا۔ تالیوں کے شور سے آس پاس کے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے بھی شور مچاتے ہوئے آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرنے لگے۔ جب وہ بچہ کچھ اونچائی پر پہنچ گیا تب جادوگر زور سے چلایا۔

’’رُک جاؤ۔‘‘ بچہ وہیں رک گیا۔

تماش بینوں نے ایک بار پھر تالیوں سے خراجِ تحسین پیش کیا۔ جادوگر نے اپنے چاروں طرف نظریں گھمائیں اور مجمع سے پوچھا۔

’’کیا کوئی اس بچے کو زمین پر واپس بُلا سکتا ہے؟‘‘

لوگ ایک دوسرے کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ پھر ایک شخص نے اس بچے کی طرف انگلی اُٹھا کر کہا۔

’’نیچے آؤ سن۔‘‘ لیکن اس کے حکم کا بچے پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بدستور ہوا میں معلق رہا۔ جادوگر نے ایک بار پھر مجمع پر یوں نظریں دوڑائیں۔ گویا وہ سبھوں کو چیلنج دے رہا ہو۔ پھر سبھوں نے مل کر ایک ساتھ آواز لگانا شروع کیا۔

’’نیچے آؤ، نیچے آؤ۔‘‘ لیکن بچہ بدستور اپنی جگہ پر معلق رہا۔

تب اس نے بچے کی جانب اپنی انگلی اُٹھا کر کہا۔

''نیچے آؤ۔'' بچہ آہستگی کے ساتھ زمین پر اُتر آیا۔لوگوں نے ایک بار پھر زبردست تالیاں بجائیں۔

اس کے بعد جادوگر نے اور کئی لوگوں کے ساتھ یہ جادو دکھایا۔ان میں بچے بھی تھے، بوڑھے بھی اور جوان بھی۔

اب شام ہو چلی تھی۔ جادوگر نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کیا۔تبھی ایک شخص تیز تیز قدموں سے چلتا ہوااس کے پاس آیااور ملتجیانہ انداز میں یوں گویا ہوا۔

''سر! پلیز، مجھے بھی اُڑا دیجیے۔'' جادوگر نے اس کی جانب چونک کر دیکھا کیونکہ یہ پہلا شخص تھا جو خود ہی اُڑنا چاہ رہا تھا۔جادوگر خاموش تھا۔اُس شخص نے اس کی خاموشی کا نہ جانے کیا مطلب نکالا کہ وہ اس کی خوشامد پر اُتر آیا اور اس کی قصیدہ خوانی کرنے لگا۔جادوگر کے چہرے پر ایک پُراسرار مسکراہٹ دوڑ گئی۔پھر اس نے اس شخص کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک جانب کیا اور با آواز بلند مجمعے سے مخاطب ہوا۔

''کیا میں اسے بھی اُڑا دوں؟''

''ہاں، ہاں، ضرور، کیوں نہیں!'' ہر طرف سے یہی آواز آنے لگی۔تب وہ اس شخص کے مقابل آ کھڑا ہوا۔اب دونوں آمنے سامنے تھے۔اس کے بعد جادوگر نے وہی منتر پڑھنا شروع کیا۔اس شخص پر تنویمی کیفیت پیدا ہونے لگی اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔اُس کے بعد جادوگر نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ہوا میں اُٹھا کر کہا۔

''اُڑ جاؤ۔'' اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص ہوا میں اُڑ چلا۔جب وہ کافی اونچائی پر پہنچ گیا تو جادوگر نے اس کی جانب انگلی کے اشارے سے کہا۔

''رُک جاؤ۔'' اور وہ وہیں پر رُک گیا۔مجمعے پر ایک بار پھر جوش طاری ہو گیا اور پوری فضا تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اُٹھی۔ہوا میں معلق شخص نے نیچے زمین پر نظر ڈالی۔ہر آدمی

اسے بونا دکھائی دینے لگا اور اسے اپنی ذات بلند، بہت بلند لگنے لگی۔اس کی آنکھوں میں غرور کا نشہ تیر گیا اور ہونٹ تفاخرانہ انداز میں پھیل گئے۔

جادوگر نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کیا۔لوگوں میں اب بے چینی پھیلنے لگی۔وہ کہنے لگے۔

''ارے، پہلے اسے زمین پر تو واپس بلاؤ۔'' جادوگر نے ایک نظر ہوا میں معلق شخص پر ڈالی۔اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔پھر اس نے مجمعے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اِس شخص کو اونچائی پر پہنچنے کا بہت شوق تھا۔اب اسے وہیں رہنے دیں۔زمین سے اس کا رشتہ کٹ چکا ہے۔اب یہ زندگی بھر ہوا میں معلق رہے گا۔''

............●●● ....

● ......رتن سنگھ پہلگامی

اُجڑتے لمحوں کی کھیتیاں

میں بس اڈے پر پہنچا تو دیکھا ایک جان پہچان والی عورت، جس کو ہم بہت سارے ناموں سے پُکارتے تھے، بس اڈے کے ایک پسینجر شیڈ میں بیٹھی تھی۔ وہ دُور مغرب کی جانب میں ڈوب رہے لہولُہان، لال سورج کے گولے کو لاشعوری طور جھولتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ شاید اُس کو اِس لہولہان لال سورج کے گولے میں سے اپنی بیتی زندگی کا ٹکڑا ابھی دِکھ رہا تھا۔ میں بھی اُس کو دیکھتے ہوئے بیتی زندگی کے بارے سوچنے لگا۔۔۔

بس اڈے میں کوئی گاڑی کھڑی نہیں تھی۔ دسمبر کی ٹھٹھرتی ہوئی شام کی ملگجی روشنی میں، میرے ساتھ لوگوں کی ایک بھیڑ بھی گاڑی کے انتظار میں تھی۔ بے چینی کے عالم میں سبھی دُھندلی سی اُمید لئے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ شاید یہ وہ لوگ تھے جن کی گھر تک کی مسافت دس کلومیٹر سے کم نہ تھی۔ نہیں تو یہ بھی اور لوگوں کی طرح پیدل ہی چلے گئے ہوتے۔ جوں جوں وقت بیتتا جا رہا تھا عورت اور بھی پریشان ہو رہی تھی۔ سوچ میں ڈوبی، بار بار سیل فون سے وقت دیکھ لیتی۔ دو چار قدم چل کر ٹانگوں کی اکڑن دور کر لیتی اور پھر اُسی شیڈ میں آکر بیٹھ جاتی۔ اُکھڑی سوچ کی لڑی کو پھر جوڑ لیتی۔

جب گھر سے نکلی تھی تو اُس کو اِس بات کا گُمان بھی نہیں تھا کہ اِس قدر دیر ہو جائے گی۔ روزمرہ ضروریات کی اشیاء کے ساتھ ساتھ اُسنے ایک کیک بھی خرید لیا تھا۔ آج اُس کے پوتے کی سالگرہ تھی۔ بیٹے کی نشانی! نہیں، بیٹوں کی نشانی!! ہاں وہ ایسا ہی سوچتی تھی۔ دو بیٹے اور اُن کا باپ جل رہی بستی کا ایندھن ہو گئے تھے۔

'چلے کلان' کی خون جما دینے والی رات تھی۔ سب لوگ کھڑکیاں دروازے بند کر کے بیٹھے تھے۔ اپنی چھوٹی سی خوبصورت دُنیا میں محو تھے۔ دروازے پہ دستک ہوئی۔ کھولا۔ کچھ مسلح، بے چہرے سے آدمی اندر داخل ہوئے۔ عورت کے خاوند کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ سوچا راستہ دکھا کر واپس آجائیں گے۔ لیکن نہیں آئے۔ مشکل سے آدھا گھنٹہ ہی گذرا ہوگا کہ دو گولیوں کے چلنے کی زوردار آواز ایسی آئی کہ وہ اندھیرے کے سمندر کو چیرتی ہوئی بہت دور تک، دیر تک گونجتی رہی۔ پرندے بھی گھونسلوں میں لرز اُٹھے۔ پُکار پُکار کر رہ گئے۔ عورت کے گھر کی دیواریں اُس رات اِس قدر ہلیں کہ گھر، گھر ہی نا رہا۔ گھر کی چھت ہی اُڑ گئی۔ سردی کی ٹھٹھرتی رات ایسی دراز ہوئی کہ دہائیوں تک ختم نا ہوئی۔ عورت کی سمجھ میں یہ بھی نا آیا کہ آخر کن لوگوں نے کس جُرم میں اُسکے خاوند کو اُسی کے خون کے چھپڑ میں مٹی کا ڈھیر بنا دیا۔ خدا خُدا کر کے خاوند کی جگہ اُستانی ہوگئی۔ زر پاس ہونے سے پیٹ کی آگ بجھتی رہی اور سانسوں کی ڈوری چلتی رہی۔ رشتے ناطے، محبتیں اور نزدیکیاں قائم رہیں۔ لیکن بڑے بیٹے کے کانوں میں رات کے سناٹے میں چلے دو فائیر پگلے سیسے کی مانند چبھتے رہے۔ بے قرار بیٹا ایک رات سوئی ہوئی، تھکی ماندی ماں اور معصوم بھائی کو چھوڑ کر کالی کلوٹی رات میں درندوں کی سرکوبی کیلئے نکل پڑا۔ تن کے دو ڈھائی کپڑے اور پاؤں میں پھٹے پُرانے جوتے ہی پہنے ہوئے تھے۔ دو ٹانگوں سے چلتے ہوئے اُسنے کوئی سرحد بھی پار کی یا نہیں، کوئی نہیں جانتا، وہ ایسا کھو گیا کہ کہیں پہ نام و نشان بھی نہیں ملا۔ ماں نے اپنے بس کی دھرتی کا چپا چپا چھان مارا پر بے سود۔ کسی نے کہا بارڈر پر مارا گیا۔ کسی نے کہا کہ اُسنے اپنی آگ میں اوروں کی آگ بھی شامل کر لی اور پھر بارود بن کر ایسا پھٹا کہ اوروں کے ساتھ خود بھی ریزہ ریزہ بن کر بکھر گیا۔ ماں کے سینے میں ایک اور زخم اُگ آیا۔ اب اُسنے ایک ہاتھ اپنے زخم پہ اور دوسرا ہاتھ دوسرے بیٹے کے سر پہ رکھ دیا۔ اُسکی سانسوں کی ڈوری پہ پہرے بیٹھا دیئے۔ صبح درس و تدریس کیلئے اسکول جاتی تو ساتھ لے جاتی۔ رات کو سینے سے لگا کر سو جاتی۔ جب پڑھ لِکھ کر پروان چڑھا تو ماں نے جھٹ سے شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔ سوچا دو آنکھیں، دو ہاتھ اور دو پاؤں اور بڑھ جائیں گے۔ سبھی آگے پیچھے دوڑتے

پھریں گے اور بجھنے نادیں گے اب اس آخری چراغ کو۔

پھر ایک دِن ایک طوفان ایسا آیا کہ کسی کی کوئی پیش نا چلی۔ دو جنگجو اندر گھس آئے۔ اُنکے پیچھے شِکاری بھی آ گئے۔ بیٹا بھی جنگجوں کا ساتھی جان کر آنکھوں کے سامنے ہی ڈھیر کر دیا گیا۔ بوئی ہوئی زندگی پھر اُجڑ گئی۔ بس اِس گھر کی راکھ کو ٹٹولتی ساس اور بہو رہ گئی۔ قدرت بھی اپنی کاری گری کو رُسوا نہیں ہونے دیتی۔ راکھ سے بھی زندگی کی کوئی چنگاری ایسی نکل آتی ہے۔ جو پھر سے گھر کے چراغ کو روشن کر دیتی ہے۔ ٹھیک آٹھ مہینے، بیٹے کے انتقال کے بعد بہو نے بیٹے کو جنم دیا۔ زندگی نے پھر انگڑائی لی۔۔۔۔۔

کہیں سے گولی چلنے کی آواز آئی۔۔۔ بس اڈے میں موجود لوگوں میں افراتفری مچ گئی۔ سوچ میں ڈوبی عورت بھی بِدکی، سودا سلف کے تھیلے سمیٹتے ہوئے وہ بھی بھیڑ میں جا مِلی۔ اِسی اثنا میں ایک مِنی بس اڈے میں داخل ہوئی۔ مِنی بس ابھی رُکی بھی نہیں تھی کہ لوگ بے تابی سے دوڑ دوڑ کر گاڑی میں سوار ہونے لگے۔ جیسے یہ مِنی بس ہی اِنکی زندگی کا آخری سہارا رہ گئی تھی۔ اور وہاں کوئی جنگ چھڑنے والی تھی۔ جب تک جانے والی سبھی سواریاں گاڑی میں سوار نا ہوئیں عورت بھی چڑھنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ جب سب لوگ سوار ہو گئے تو عورت بھی اپنے سامان کے سمیت گاڑی میں سوار ہو گئی۔

ڈرائیور کسی نادیدہ خطرے کو بھانپ گیا تھا۔ اور اڈے سے جلدی نکل جانا چاہتا تھا۔ جب گاڑی بھر گئی تو اُسنے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ دو تین سپاہی بھی ہتھیاروں سمیت، تیز تیز قدموں سے اپنے بھاری بھرکم بوٹوں سے دھرتی کو روندتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔

"گاڑی روکو!"

ایک سپاہی نے زور سے آواز دی۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ گاڑی میں سوار سبھی لوگ سہم گئے۔ وہ سانس روک کر اگلے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ دوسرے سپاہی نے بھی اُسی لہجے میں کہا:

"سبھی سواریاں باہر آ جاؤ! گاڑی خالی کرو!!"

لوگ ایک دوسرے کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے پوچھ رہے تھے:

"کیوں اُتریں؟ ہمنے کون سی خطا کی ہے؟؟"

کہیں کہیں ایسا حکم تب دیا جاتا تھا جب کسی شک کی بنیاد پر سواریوں کی جامہ تلاشی لینی ہوتی تھی۔ لیکن اِس وقت۔۔۔۔؟ ایک سے انیک سوال سر اُٹھا رہے تھے۔

"کیا تم بہرے ہو؟ سُنتے نہیں ہو؟؟"

حوالدار آپے سے باہر ہو گیا۔ تبھی ایک سفید داڑھی والے شخص نے جُرات دکھائی اور پوچھا:

صاحب! ہم گاڑی سے کیوں اُتریں؟ ہمارا کیا قصور ہے؟؟"

اب کی بار حوالدار نے کچھ نرمی سے جواب دیا

"یہ آخری گاڑی ہے" ایک نوجوان نے کہنا شروع کیا۔"روزوں کے دن ہیں۔۔۔وقت پر گھر پہنچنا ہے۔۔۔ہم پیدل کب پہنچیں گے؟۔۔۔ہمارا گاؤں یہاں سے دس کلومیٹر دُور ہے۔۔۔"

"یہ تو آپ لوگوں کی طرف سے سراسر ناانصافی ہے۔۔۔ظُلم ہے!۔۔۔اِس ٹھنڈ میں!!۔۔۔اپنی گاڑی کیوں نہیں لے جاتے؟ سِول گاڑی کو۔۔۔۔" ایک اور نوجوان تاؤ میں آگیا۔

سپاہیوں کا غُصہ اب ساتویں آسماں پر پہنچ گیا۔ وہ گالیوں پر اُتر آئے:

"سالے زیادہ شور کیا تو گولیوں سے بھون ڈالوں گا!۔۔۔نخرے بند کرو اور چپ چاپ گاڑی سے اُتر جاؤ۔۔۔۔ ہمیں مجبور مت کرو کہ ہم۔۔۔۔۔" سب خاموش ہو گئے۔ اُترنے کیلئے اپنا اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی عورت سب کچھ دیکھ رہی تھی اُس کے اندر گرم رقیق فولاد کی سی رو بہنے لگی۔ آنکھوں سے شعلے اخراج ہونے لگے۔ اب وہ بے خوف ہو گئی تھی۔ مردوں کے شانہ بہ شانہ سینہ سپر تھی۔ سپاہیوں کی زیادتی اور بگڑ رہی صورتِ حال اُسکے برداشت سے باہر ہو گئی۔ اُسنے اپنے دانتوں کے جبڑوں کو ایسے کس لیا جیسے کسی سخت چیز کو

دانتوں تلے دبایا ہو۔

ایک بزرگ گاڑی سے اُترنے لگا۔ عورت نے پچھلی سیٹ سے آواز دی" چاچا اُترو مت! بیٹھے رہو۔۔۔نہیں اُتریں گے ہم!!۔۔۔ہم نے کوئی جُرم کیا ہے؟ کِس جُرم کی سزا ہے یہ ؟؟۔۔۔ہم پالتو جانور نہیں ہیں۔ جب چاہیں ہمکو دُکھ دیں۔۔۔گولی مارنی ہے تو مار دیں ۔۔۔ہم ڈرنے والے نہیں ہیں!

''لونڈی تو ہوش میں ہے؟ کیا بکواس بک رہی ہے؟؟" غصیل سپاہی بے حیائی سے بولا۔

''سپاہی! مُنہ سنبھال کر بات کر۔۔۔اگر حقیقت میں تو دیش کا سچا سپاہی ہوتا تو اپنے ہی دیش کی بیٹی سے تمیز سے بات کرتا۔۔۔اِن بزرگوں کی بے عزتی نا کرتا۔۔۔اور۔۔۔''

اب عورت سپاہیوں کی کوئی بھی بات نہیں سُن رہی تھی۔ سواریوں کے اندر بھی اب ہمت بڑھ گئی تھی۔ گاڑی میں شور وغُل برپا ہو گیا۔ سبھی اپنے اپنے دِل کی بھڑاس نکالنے لگے۔ اندر کا لاوا پھوٹنے لگا۔ بہت زیادہ بولنے سے عورت کا گلا سوکھ گیا۔ چُپ ہو گئی۔ لیکن اندر ہی اندر سوچنے لگی:

''جن سپاہیوں کو اُنکی حفاظت اور مدد کرنی چاہیئے تھی وہی سپاہی دُشمنوں کا سا سلوک رواں رکھ رہے ہیں۔ اپنے سُکھ کیلئے پوری گاڑی کی سواریوں کو دُکھ دے رہے ہیں۔۔۔اِنکی آنکھوں میں کائی جم گئی ہے۔ اپنے بزرگ شہریوں کا احترام کرنے کی بجائے اِنکو سزا دینے پر تُلے ہیں۔۔۔یہ آزادی ہے؟ انسانی حقوق یہی ہیں؟؟۔۔۔ایسے نظام سے نجات حاصل کرنا کوئی جُرم نہیں ہے۔۔۔اِس ظُلم وسِتم کو کوئی برداشت کرسکتا ہے؟۔۔۔''

سپاہی اور حوالدار بس میں پیدا ہوئی صورتِ حال کو دیکھ کر شوریدہ حال ہو گئے۔ حوالدار اپنے سے بڑے آفیسر کو اِس صورت حال سے آگاہ کرنے کیلئے چلا گیا۔ ابھی وہ کچھ قدم ہی چلا تھا کہ آگے سے 'کرنل صاحب' بنا گاڑی کے ہی تیزی سے آ رہے تھے۔ شاید اُسنے گاڑی کے اندر کا شور کہیں نزدیک سے ہی سُنا تھا۔ وہ آناً فاناً گاڑی میں داخل ہو گیا۔ اُسنے بہت ہی اِنکساری سے گاڑی خالی کرنے کی گُزارش کی اور کارن بھی بتا دیا۔

اِسی اثنا میں بہت سارے سپاہی ایک زخمی سپاہی کو اُٹھا کر گاڑی کی طرف آ رہے تھے۔ زخمی سپاہی کے سر میں گولی لگی تھی۔ گولی اپنی ہی سروس رایفل سے لگی تھی۔ سڑک پر کھڑا سپاہی کِسی ذہنی پریشانی کے گذرتے کچھ کر بیٹھا تھا یا کوئی اور وجہ تھی؟۔ابھی یہ صیغہ راز تھا۔سپاہی بے ہوش تھا۔لہو بنڈیج سے بھی باہر رِس رہا تھا۔سب کی کوشش یہی تھی کہ بنا دیری کے یہ کسی نزدیک کے سول ہسپتال پہنچا دیا جائے۔

عورت اب بھی پچھلی سیٹ پر ہی بیٹھی تھی لیکن اب کی بار اُسکی آنکھیں پُرنم تھیں۔ بہت ہی عاجزی کے ساتھ وہ گاڑی میں بیٹھی سواریوں سے کہنے لگی:

''اب دیر مت کرو!۔۔۔اُٹھو!!۔۔۔گاڑی خالی کر دو۔۔۔کسی گھر کا چراغ نا بُجھ جائے۔۔۔کوئی ماں اندھی نا ہو جائے۔۔۔کِسی کا سُہاگ نا لُٹ جائے۔۔۔کوئی بہن بھائی کیلئے نا تڑپے۔۔۔اُٹھو! ہم پیدل ہی چلیں گے۔۔۔''

دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی خالی ہو گئی۔۔۔بُزرگ لوگوں نے زخمی سپاہی کو منی بس میں لِٹانے کا جُگاڑ کر دیا اور پھر باقی سپاہی بھی گاڑی میں سوار ہو گئے۔گاڑی تیزی سے آنکھوں سے اوجل ہو گئی۔نزدیک کی ایک مسجد سے اذان کی آواز آئی۔روزہ کھولنے کا وقت ہو چکا تھا۔عورت نے پوتے کی پہلی سالگرہ کیلئے خریدے ہوئے کیک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کئے اور سبھی لوگوں میں بانٹ دیئے۔شاید وہ آنسوں پونچھتے ہوئے بھی گُنگُنائی تھی۔ ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو''، کِسی اور نے یہ سُنا تھا یا نہیں؟ عورت اس سے بے خبر تھی۔

............●●●............

●......راجہ یوسف

کھلے دروازے کا کرب

''سنو، میری بات گرہ باندھ کر رکھ لو۔ وہ آئیں گی اور ضرور آئیں گی۔ اس سال نہیں تو اگلے سال بڈھیا ضرور مرجائے گی۔ وہ مرنے سے پہلے بیٹیوں کو بلائے گی، لیکن تم لوگ مستعدی کے ساتھ کھڑی رہنا۔ انہیں ایک قدم بھی آگے نہیں آنے دینا۔ چاہے ان کا گریبان پکڑ کر یا بالوں سے کھینچ کر ان کو گھسیٹ کر باہر لے جانا پڑے۔ وہ مری ہوئی ماں کا منہ نہ دیکھ پائیں، نہ اسے چھو پائیں اور تم لوگ وہی کروگی جس کا میں اشارہ کروں گی، تم لوگوں کو میں نے کبھی بہوئیں نہیں سمجھا ہے۔ بیٹیوں کی طرح رکھا ہے تم دونوں کو۔ اس لیے وہی کرنا جو میں کہوں گی۔''

بھائی صاحب خود ہلکے پیٹ کا آدمی تھا۔ اس نے خود ہی سارے رشتہ داروں میں بات پھیلائی تھی، خود ہی اپنی بیوی اور بہو بیٹوں کو اپنی بہنوں کے خلاف اکسایا تھا۔ گھر میں ایک طرح سے محاذ کھول رکھا۔ اب پورا گھر اس کی بہنوں کے خلاف ہو چکا تھا۔ بقولِ اس کے، وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اس کی بہنیں ہی اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیں گی۔

بھائی صاحب بد دماغ تو پہلے سے ہی تھا۔ کس کی جرات تھی کہ اس کے سامنے آئے یا اس سے آنکھ ملا کر بات کرے۔ گھر میں سارے لوگ اس کے حکم کے غلام تھے کوئی سر اٹھا کر بات نہیں کرسکتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے باپ میں بھی اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ بیٹے کی نا کر سکے۔ ماں کی تو بات ہی نہیں تھی، گھر میں ماں باپ کے علاوہ اس کی بیوی، دو بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی بھی تھا، لیکن سبھی لوگ اس کے سامنے دبے دبے سے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی بیوی کی بھی اس کے سامنے کوئی وقعت نہیں تھی۔ وہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا تھا۔ باپ بھی مہینے کی

تنخواہ بیٹے کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔ وہ بالکل بھی مجاز نہیں تھا کہ کبھی اپنی مرضی سے کوئی چیز خرید کر لائے یا کبھی شوق سے اپنی بیوی یا بیٹیوں کے لئے ہی کوئی تحفہ خریدے۔ جانے یہ سب کیوں ہوا اور کیسے ہوا تھا؟ پہلے پہل تو گھر کے سارے اخراجات باپ ہی دیکھتا تھا۔ گھر میں کس کو کیا چاہئے یا کھانے میں کیا بنے؟ یہ سب باپ کی مرضی سے ہی ہوتا تھا۔ دراصل جب بھائی صاحب کی نوکری لگ گئی اور وہ تنخواہ سے زیادہ بالائی آمدنی گھر لانے لگا تو باپ نے خود ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ بیٹے کے سامنے خود کو بونا ظاہر کرنے لگا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے اختیارات کم کر دیئے اور بھائی صاحب کو با اختیار بنا دیا۔ بھائی صاحب نے پورے گھر میں اپنی مرضی کے قانون لاگو کر دیئے۔ کس کی کتنی اہمیت ہوگی یہ بھی وہ طے کرنے لگا اور کس کی کتنی وقعت رہے گی، اس کی مرضی۔ بہنوں کی شادی بھی اس نے جہیز سے بچنے کے لئے غریب گھرانوں میں کر دی۔ وہ مزدور لوگ تھے۔ دن بھر جو مزدوری کر کے کماتے تھے وہی شام کو کھاتے تھے۔ مشکل سے ہی گزارہ ہوتا تھا۔ بھائی صاحب کا ماننا تھا کہ بہنوں بیٹیوں کی شادی غریب گھروں میں کر دو تو داماد ساری عمر محتاج رہتے ہیں۔ کبھی سسرال والوں پر رعب نہیں جھاڑ سکتے۔ چھوٹے بھائی کی شادی بھی اس نے اپنی مرضی سے کر دی اور جائیداد میں کانٹ چھانٹ کر کے تھوڑا سا حصہ نکال کر اس کو دیا اور خود سے الگ کر دیا۔ یہ حرکت ماں کو بہت بری لگی تھی لیکن وہ کوئی احتجاج نہیں کر سکی۔ ویسے بھی بھائی صاحب کبھی کبھار ہی ماں کو منہ لگاتا تھا، کبھی تو مہینوں بات نہیں کرتا تھا۔ ایک بار پورے چار سال تک ماں سے کوئی بات نہ کی۔ اصل میں اسے ماں اچھی نہیں لگتی تھی کیونکہ بقول اس کے ماں کو چھوٹا بیٹا اور دونوں بیٹیاں زیادہ پیاری تھیں۔ باپ نے بیٹے کی کسی حرکت پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بہنوں کی شادی اور چھوٹے بھائی کو گھر سے بے دخل کرنے کے بعد آہستہ آہستہ اس میں بھی کئی بدلاؤ آنے لگے۔ وہ اب ماں باپ سے کھچا کھچا سا رہنے لگا اور اپنے بیوی بچوں کے زیادہ قریب ہو گیا۔ اب اس کی ہر ہاں میں اس کی بیوی کی ہاں بھی شامل رہنے لگی تھی۔ اب بھائی صاحب سے زیادہ اس کی بیوی گھر میں حکم چلانے لگی تھی۔ ماں باپ بوڑھے ہو رہے تھے۔ گھر میں اب ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی، ان کی کوئی عزت بھی نہیں کرتا تھا۔

بس پوتے کچھ کچھ خیال رکھ لیتے تھے۔ان کی دوائی انہیں مل جاتی تھی۔اس کے باوجود باپ اتنا بیمار ہوا کہ اسے اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔باپ جتنے دن اسپتال میں رہا وہ دروازے کو تکتا رہا۔ حالانکہ اسپتال میں خدمت کے لئے اس کی بیٹیاں اس کے پاس کھڑی تھیں لیکن اس کا چہیتا بیٹا ایک بار بھی اسپتال نہیں آیا۔کیونکہ وہ بیوی کے ساتھ گھر کی چیزیں سنبھال کر رکھنے میں لگا تھا۔وہ جان چکا تھا کہ باپ اسپتال سے زندہ نہیں لوٹے گا۔اس کی میت گھر آجائے گی تو چیزیں ساری تتر بتر ہو جائیں گی۔ ماں یہ سب خاموشی سے دیکھتی اور خون کے آنسوں روتی۔اس نے کئی بار اسپتال جانے کی ضد کی تھی لیکن اسے یہ کہہ کر چپ کرایا گیا کہ اگر تجھے بھی کچھ ہوا تو پھر دو دو لاشیں ایک ساتھ کون سنبھالے گا؟ آخر دو چار دن بیٹے کی راہ تکتے تکتے باپ نے آنکھیں موندلیں۔گھر میں میت سے زیادہ مہمانوں کے استقبال کی فکر تھی۔ بڑا سا شامیانہ مہنگے قالینوں سے مزین اور گاؤ تکیوں سے سجا سجایا تھا۔وازہ وان اور زعفرانی قہوے کی خوشبو ماحول کو معطر بنا رہی تھی۔اس نے فوری طور پر باپ کی فوٹو اخبارات اور سوشل میڈیا پر شیئر کرادی تھیں جس کی وجہ سے تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔مہمانوں کی آمد نے چوتھے تک بھائی صاحب کی کمر دہری کردی لیکن جاتے جاتے مہمانوں کے دلوں میں اس کے لئے بہت زیادہ قدر اور احترام تھا۔وہ سبھی ایسے لائق بیٹے کی تمنا کرتے ہوئے واپس جارہے تھے۔تعریف جب ہونہار بیٹے کی ہوتی ہے تب بیٹیوں کی بات کون کرتا ہے؟ ان کی آنکھوں سے بہتے آنسو کون پونچھتا ہے۔ بیٹیاں تو ہوتی ہی ہیں اسی لئے کہ وہ باپ کی میت پر سینہ کوبی کریں اور دل کھول کر رولیں۔ہائے یہ کوئی ان سے پوچھے جن کی بیٹیاں نہیں ہوتیں۔

ہفتے دس دن میں مہمانوں کا آنا جانا بند ہو گیا۔ بیٹیاں رو دھو کر اپنے اپنے گھروں کو واپس چلی گئیں۔باپ کی پنشن ماں کے نام منتقل ہوگئی۔ بھائی صاحب نے اپنے بیٹے کو دادی کے ساتھ لگا کر رکھ دیا کہ وہ دادی کو بینک لے جایا کرے اور وہاں سے پنشن لے کر آئے۔ پوتا بینک سے ہی دادی کا پنشن لے لیتا تھا۔دادی خاموشی سے اس کے ساتھ جاتی اور خاموشی سے خالی ہاتھ واپس آجاتی اور پھر کسی سے بنا کچھ کہے اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ ویسے بھی شوہر کے مرنے

کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی ڈری سہمی رہنے لگی تھی۔ شوہر کے زمانے میں وہ صرف بیٹے سے ڈرتی تھی لیکن اب وہ بہو سے بھی خوفزدہ رہنے لگی تھی۔

آخر بھائی صاحب خود بھی ریٹائر ہو کر آ گیا لیکن ریٹائر ہونے تک اس نے خوب پیسہ بنایا تھا۔ ویسے باپ کا چھوڑا ترکہ بھی بہت تھا۔ اور اپنی کمائی سے اس نے اس میں دگنا اضافہ بھی کر لیا۔ اپنے بیٹوں کی شادی کرنے تک ان کے لئے پیسے کے ساتھ ساتھ اچھی خاصی پراپرٹی بھی بنا کر رکھ لی تھی۔ اپنے رشتے داروں میں وہ اب صاحبِ حیثیت آدمی تھا لیکن کسی کو کچھ دینا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ ویسے بھی بھائی صاحب کو غریب لوگ ہی اچھے نہیں لگتے تھے چاہے وہ کتنے بھی قریبی کیوں نہ ہوں۔ اس کا کہنا تھا کہ غریب رشتہ دار ہمیشہ مانگنے ہی رہتے ہیں۔ اس کی بہنیں جب بھی میکے آتیں خاموش ہی رہتیں اور بھانجے بھانجیاں بھی نانی کے گھر میں دبے دبے رہتے۔ بہنویوں کی تو جرأت ہی نہیں تھی کہ وہ سسرال میں حق سے بات کرسکیں۔ باپ کے مرنے کے بعد بیٹیوں کو ماں کی زیادہ فکر رہنے لگی تھی۔ اس لئے خیر و عافیت پوچھنے کے لئے وہ ہر دو تین دن کے بعد ماں سے ملنے آ جایا کرتی تھیں۔ جو بھائی صاحب کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ جب اس کا اظہار اس نے اپنی بیوی اور بہوؤں کے سامنے کیا تو وہ شیرنیاں ہو گئیں۔ بہنیں ماں سے ملنے آئیں تو بھابی نے پہلے دبے دبے الفاظ میں نصیحت دی۔ پھر ایک دن کھل کر کہہ بھی دیا۔

" تم لوگ یہاں بار بار کیوں آتی ہو؟ کیا ہم پر بھروسہ نہیں یا یہ سمجھتی ہو کہ تمہارے بعد ہم تمہاری ماں کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں؟" دونوں بہنیں بھونچکا ہو کر رہ گئیں لیکن وہ پھر بھی ماں کے پاس آتی رہیں اگرچہ یہاں ان کے ساتھ کوئی بھی فرد عزت سے بات نہیں کرتا تھا۔ نہ کوئی انہیں چائے یا کھانے کے لئے پوچھتا تھا۔ وہ بس ماں کے پاس بیٹھتیں۔ وہ ان کے آنسو پونچھتی یا وہ ماں کے آنسو پونچھتیں اور چلی جاتیں۔ بڑی بہن کی دو جوان بیٹیاں اور ایک چھوٹا بیٹا تھا جبکہ چھوٹی بہن کے تین بیٹے تھے۔ بچوں نے بھی اب ننھیال آنا بند کر دیا تھا کیونکہ وہ جب بھی یہاں آئے بے عزت ہو کر روتے روتے گھر واپس گئے۔ مامی کسی چیز کو چھونے نہیں دیتی۔ کوئی بچہ اگر غلطی سے ٹی وی کا ریموٹ بھی اٹھا لیتا تو مامی ہاتھ مروڑ کر واپس لے لیتیں اور

حقارت سے کہتیں۔

''کیا کرتے ہو۔ اتنا قیمتی ایل سی ڈی ہے۔ خراب ہو گیا تو پھر تمہارا باپ کہاں سے لا کر دے گا؟ بے چارے کے کھانے کے لالے پڑے ہیں۔'' جب سے نانیہال میں دو بہوئیں آئیں تب سے تو ان کی بیٹیوں پر نظر بھی رکھی جانے لگی کہ کہیں کوئی چیز چرا ہی نہ لیں۔ بہوؤں کو بھی خبردار کیا گیا کہ ان کو اپنے کمروں میں آنے مت دینا۔ ان کا ہاتھ خراب ہے۔

ان ہی حالات میں بڑی بہن سروا کا شوہر کچھ بیمار رہنے لگا۔ وہ کام پر بھی نہیں جا پاتا تھا۔ تنگ دستی بڑھنے لگی تو ایک دن ماں کی خیریت پوچھنے کے بعد وہ بھائی کے پاس گئی اور کہنے لگی۔

''بھائی صاحب میرا شوہر بہت بیمار ہے۔ نہ اس کی دوائی کے لئے پیسے ہیں اور نہ گھر میں کھانے کا سامان ہے۔ اگر کچھ پیسے دے دیتے ۔۔۔۔''

''دیکھو سروا۔ دو دن تین دن کے بعد تم ماں سے ملنے کے بہانے یہاں آجاتی ہو۔ ہم چائے پلاتے ہیں اور کبھی کھانا بھی کھلاتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ تم ہماری غریب رشتہ دار ہو۔ ورنہ ہم کو کیا پڑی؟' بھائی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بھابی بول اٹھی جیسے وہ جواب دینے کے لئے پہلے سے تیار بیٹھی تھی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم'' بھائی صاحب نے بیوی کو تیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''تم چپ ہی رہو جی۔ میں نے مانا تمہاری ہی رشتہ دار ہے۔ ہماری تو کچھ نہیں لگتی۔ ہم اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر اس کو کیوں دیں۔ خیرات ہی لینی ہے تو کسی اور در سے مانگ لے۔ ہمیں معاف کرو۔''

''بھابی ۔۔۔'' سروا نے تیز لہجے سے کہا......

''میں یہاں بھیک مانگنے نہیں آئی ہوں۔ اور یہ کیا لگا رکھا ہے تم نے۔ رشتہ دار ۔۔۔ رشتہ دار ۔۔۔ یہ میرا بھائی ہے۔''

'' بھائی ہے تو کیا گھر، جائیداد پوٹلی باندھ کر تجھے دے دے۔ یا زمین زراعت تیرے نام کر دے۔''

''کیوں نہ دے۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے۔ میرے باپ کی زمین ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔ ہاں پہلے میرا گھر۔ پھر تمہارا۔ یہاں جو کچھ ہے تیرے باپ کا نہیں ہے۔ بلکہ میرے باپ کا ہے۔''

''سروا۔۔۔'' بھائی صاحب کا چہرہ غصے سے لال ہوگیا۔ وہ زور سے چیخا اور ہاتھ بھی بلند کرلیا۔

''حد ہوگئی بھائی صاحب۔۔۔ بس اب حد ہوگئی۔۔۔'' یہ کہہ کر سروا میکے سے باہر آگئی۔ اور کئی دن تک روتی رہی۔

اب تو واقعی حد ہوگئی تھی۔ گھر میں کہرام مچا تھا۔ جیسے آسمان سر پر ٹوٹ پڑا ہو۔ بھائی صاحب کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کی بے زبان بہنیں اس حد تک گر سکتی ہیں۔ شوہر کی بیماری کا بہانہ بنا کر بھائی سے پیسے مانگیں گی۔ انکار کرنے پر باپ کی جائداد میں اپنا حصہ مانگنے لگیں گی۔

''آج سے میرا اور میری بہنوں کا رشتہ ختم۔ نہ وہ میری کچھ لگتی ہیں اور نہ میں ان کا کچھ لگتا ہوں۔ نہ وہ میرے گھر میں قدم رکھیں گیں اور نہ کبھی میں ان کے گھر جاؤں گا۔ ہمارا ان سے کوئی سروکار نہیں رہے گا۔'' غصے میں جانے بھائی صاحب کیا کیا اول فول بک رہا تھا۔ اس کی بیوی نے موقع غنیمت جان کر آگ میں گھی ڈالنے کا کام کر دیا۔ اپنی بہوؤں کو تاکید کر کے رکھ دی۔

''جس دن بڈھیا مر جائے گی۔ اس کی مکار بیٹیاں رونے دھونے کے لئے آجائیں گی تو انہیں گھر کے اندر آنے نہیں دینا۔ بلکہ چلا چلا کر لوگوں کے سامنے ان کو ذلیل کرنا۔ سب کو بتا دینا یہ وہ بہنیں ہیں جنہوں نے بھائی سے حصہ مانگا۔ آج یہ کس منہ سے ماں کی میت پر رونے آگئی ہیں۔''

بات پڑوسیوں سے ہوکر دور کے رشتہ داروں تک پہنچ گئی تو سب تھو تھو کرنے لگے۔

''بہنیں ایسی بھی ہوتی ہیں کیا۔۔۔ توبہ توبہ۔'' دونوں بہنوں نے سنا تو ہکا بکا ہو کر رہ گئیں۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ ہوگئیں تھیں۔

''کیا اب ہم ماں سے مل نہیں پائیں گیں۔ ماں سے بات نہیں کر سکیں گیں اور اگر وہ سچ میں مرگئی۔ تو وو و۔۔۔تو کیا ہم ماں کا منہ بھی نہیں دیکھ پائیں گیں۔ وہ ڈری سہمی بھائی صاحب کے گھر پہنچ گئیں۔اس کے پیر پکڑ لئے۔ بھابی کے سامنے خالی دامن پھیلایا۔ان کے بیٹوں اور بہوؤں کی منت سماجت کی۔ آنسوؤں سے ان کے پاؤں دھو دیئے۔ آخر بڑی مشکل سے بھائی صاحب کا دل نرم پڑ گیا۔کورے کاغذ پر دونوں کے انگوٹھے لگوا لئے ۔تب جا کر ماں کے کمرے میں جانے کی اجازت ملی۔ وہ آنکھیں صاف کرتی ماں کے کمرے کے دروازے پر ٹھہر گئیں تا کہ ماں کو لگے کہ اس کی بیٹیاں خوش ہیں، وہ رو نہیں رہی ہیں۔لیکن انہیں کیا معلوم کہ ماں کی آنکھیں جو کھلے دروازے کو گھور رہی تھیں۔ وہ ان کی راہ تکتے تکتے کب کی بے نور ہو چکی تھیں۔اور کھلے دروازے کا کرب اس کی آنکھوں میں ساکت ہو چکا تھا۔

........●●●.......

● ......رافعہ ولی

تپسیا

او سکھبیرے اُٹھ یہاں سے سورج صحن کے بیچوں بیچ آ گیا اندر چل کر سو لے۔ تو چل۔ آ رہا ہوں۔ سکھبیر کو گرمی کا احساس تو ہوا ہی نہیں تھا۔ پھر دیوندر کور کیوں جھلس رہی تھی۔ وہ اُٹھ کر اندر کمرے میں چارپائی پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔

دیوندر کور دوپہر ڈھلنے کے بعد ہی کھانا کھاتی تھی۔ البتہ سکھبیر دھوپ زیادہ اور کھانا کم ہی کھاتا تھا۔ شاید دنیا کا ہر ذی حس مرد دھوپ کا استعمال کچھ زیادہ ہی کرتا ہے۔ سکھبیر سہ پہر نیند سے بیدار ہوا، چائے کے ساتھ دو پاپے (رسک) لیے اور کھیت کی طرف چل دیا۔ پگڈنڈیوں پر چلتے وہ کسی اور دنیا میں پہنچ چکا تھا جہاں چاندنی راتوں کا فسوں تھا۔ وہ کھیت میں اپنی ماں کے ساتھ بچپن سے ہی رات گئے کام میں لگا رہتا۔ یہاں اپنے ہاتھ سے بوئے ہوئے بیجوں کو فصل کی شکل میں دیکھ کر سرشار ہوتا۔ ٹھوکر لگنے سے سکھبیر کا خیال ٹوٹ چکا تھا۔ وہ چونک گیا اور اپنی جگہ پہنچ کر (نمن) کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ناراض نہ ہو تیرے لئے دیکھ نیا جوڑا لایا ہوں۔ سردی بڑھ گئی ہے چل میں پہناتا تجھے تپسیا میں تو تھک جاتی ہے وہ بجوکا کے سامنے سر خم کئے بولتا رہا اور پھر بجوکا کے ہانڈی والے سر پر موٹی شال لپیٹ لی۔ بانس کی ڈانڈیوں پر اونی سویٹر بھی لپیٹ لیا اور دائیں بائیں بانس کی ڈانڈیوں پر تہہ دار کپڑا ڈال کر رسی سے باندھ دیا اور بجوکا سے باتیں کرتا رہا۔ دیوندر کور تبھی کھیت میں آ کر اس کو کوستی رہی ساتھ ہی ساتھ اپنے آپ کو بھی کہ دیکھ دیوندرے کھیت بھی اسی کے ہیں اور تیرا خصم بھی۔

پرانے وقتوں سے سنتے آئے تھے کہ عورت ہی عورت کو دِق لگاتی ہے لیکن جیتندر تائی

سے مل کر اس کا احساس بھی ہوا۔ میں اپنے ملک کی راجدھانی کے باڈر پر اپنے شوہر کے ساتھ
پچھلے تین مہینوں سے آندولن پر تھی، پانچ سال کی تاناشاہی کا ہم سب کسان منہ بولتا ثبوت تھے۔
یہاں جدھر نظر دوڑائیں سرسوں کے سر نظر آئیں گے۔ ان سروں میں کئی تو موسمی مار سے
دلبرداشتہ ہو کے نکل لئے، کئی اب بھی ڈٹے ہیں۔ جتندر کور کا سر عجیب ہے کبھی سرسوں کا گمان ہوتا
کبھی بنجر بے آباد کھیت کا اگر ان کے پاس صرف بنجر زمین ہے تو وہ یہاں کیوں ہے۔ ضعیف سا
وجود بھیڑ کا کونہ لگ گیا تو وائے گرو کی شرن میں جتندر کور کو ان کا بیٹا یہاں چھوڑ کر گیا تھا ہمارے
خیمے میں وہ سب سے عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ میں نے کئی بار کہا تائی گھر واپس لوٹ جائیں آپ
کے بدلے ہم سب ہے نا یہاں۔ لوٹ جاتی بیٹا پوتا پوتی بھی یاد آتے ہیں پر بہو کا کہنا ہے کہ
اگر سکھبیر ادھر بیٹھ گیا تو سرکار گرفتار کرتی ہے پھر سکھبیر تو میرے یہاں ایک ہی مرد بچہ ہے نا۔ تائی
سکھبیر کے بدلے ہم سب یہاں ہے نا۔ پر وہ نہ مانی بیٹا میں کہیں نہیں جا رہی ہوں یہاں روٹی
بھی مل رہی، عزت سے پڑی رہوں گی۔ جتندر تائی کو نہ جانے کون سے سکھ اس کانٹوں بھری جگہ
بھوگنے تھے۔ سو وہ نہ مانیں ان کا بیٹا سکھبیر کئی بار کپڑے اور ضرورت کی چیزیں لایا۔ پر انہوں
نے لینے سے صاف انکار کر دیا بس سکھبیرے تو اب لوٹ جا یہاں سرکار تجھے دیش دروہی بتا کے
تجھے مار دے گی۔ سکھبیر ماں کی شکل دیکھ رہا تھا۔ ان کے وجود میں ایک ٹھہراؤ تھا وہ ماں سے لپٹ
گیا۔ ماں مجھے معاف کر دے اگلی صبح آندولن پر سرکار برس پڑی اور یہ ثابت کیا کہ وہ پرانی ہے
ہی نہیں اور جن کی بدھی ہی نہ ہو وہ آندولن جی وی ہوتے۔ اس لیے ان کا صفایا ہو تو اچھا ہے۔ یہ
نہ تو سرکار کو سمجھ سکتے اور نہ اس کے اونچے آدرشوں کو اور نہ ہی مانو جاتی کے ہت میں کئے گئے
فیصلوں کو۔ اس کو ایسے منش سے سنسار کو مکتی دینی ہوگی۔ میں بڑی پریشان۔ میں نے قانون کی
تمام ڈگریاں لی ہوئی ہے۔ میرے باپ دادا کسان پھر بھی نہیں جانوں کہ میرے کھیت کونسی بدھی
مانگے اور جنہوں نے نہ کبھی کھیت کھلیان دیکھے اور نہ ان کھیتوں میں محبت کو لہلہاتے ہوئے۔
انہوں نے یہ ثابت کیا کہ ہم ہی بدھی مان ہیں۔ پھر ہم سب بھیڑ بکریوں کی طرح دوڑائے گئے
ہانکے گئے۔ اس آپا دھاپی میں جتندر تائی کا ہاتھ مجھ سے چھوٹ گیا اور وہ جنم جنم کے سکھ بھوگنے کسی

اور آندولن میں پہنچ گئی۔ میں نڈھال تائی کے لئے روتی رہی خیمے میں ہر شخص کسی نہ کسی کو رو رہا تھا۔ اگلی صبح سکھبیر ماں کی خیریت لینے آ گیا مگر ماں کی تپسیا لمبی ہو چکی تھی۔ اب سکھبیر کے اندر کی آتما بھی ڈھلنے کے لئے بے تاب تھی۔ لیکن میں نے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ تیری ماں کی آخری اچھا یہی تھی کہ تو گھر اور کھیت سنبھال۔ سکھبیر واپس تو آ گیا پر دن بھر دھوپ میں لیٹ کر اپنے جسم کو تپسیا کے لئے تیار کرتا۔ اس نے کھیت میں ماں کے کپڑوں سے بجوکا بنایا تھا جہاں صبح اور سہہ پہر کو نمن کرنے جاتا۔ دیوندر کور اس پر چلاتی چیختی پر وہ کسی اور ہی جہاں کا معلوم ہوتا۔ اس دن بھی وہ صبح کھیت میں بجوکا کے سامنے نمن کے لئے جیسے ہی جھکا تھا محسوس ہوا کہ بجوکا کا اونی دوپٹہ اس سے لپٹ چکا ہے۔ سرسراتی باہیں اس کو آغوش میں لینا چاہتی ہے وہ بجوکا کے قریب ہوتا گیا۔ میری پیاری ماں سکھبیر بجوکا سے لپٹ گیا۔ اس سے محسوس ہوا ماں اس سے کہہ رہی ہے بیٹا آزردہ نہ ہو بدھی مان تپسیا نہیں کرتے۔ دور سے دیوندر کور چلاتی ہوئی اور بھاگتی ہوئی آ رہی تھی سکھبیرے بجوکا چھوڑ گھر چل سرکار ڈھونڈ رہی ہے تیری ماں دن پھیرا گئی ہمارے پنڈ کا نام شہید جتندر کور ہو گیا اور تو سرکار کا نوکر۔

..........●●● ....

ریڈیائی ڈرامہ

☆...... اشرف عادل

ڈھلتے سائے

کردار

نمبر	نام	کردار	عمر
۱۔	پروفیسر کرمانی	(سابق یونیورسٹی پروفیسر)	60سال
۲۔	انجینئر شہناز	(سابق ایکزیکٹیو انجینئر)	60سال
۳۔	نجیب	(پروفیسر کرمانی کا بیٹا)	35سال
۴۔	شازیہ	(نجیب کی بیوی)	30سال
۵۔	ہادیہ	(نجیب اور شازیہ کی بیٹی)	6-8سال
۶۔	خاور	(شہناز کا بیٹا)	35سال
۷۔	چپراسی	(پروفیسر کرمانی کا چپراسی)	40-50سال
۸۔	ایک آدمی	ایک طالب علم کا باپ	60سال

............●●●............

(1)

ایک آدمی: ارے بھیا! پروفیسر سید رفیع احمد کرمانی کا کمرہ یہی ہے کیا؟

چپراسی: ہاں بھئی۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟ کمرہ یہی ہے۔نام کی تختی دروازے پر لگی ہے۔ پروفیسر صاحب اس یونیورسٹی میں Botany پڑھاتے ہیں اس وقت اپنے کمرے میں موجود ہیں اور میں کمرے کے باہر اس اسٹول پر بیٹھا ان کا چپراسی ہوں اور کچھ پوچھنا ہے صاحب جی۔

ایک آدمی: شکریہ۔

چپراسی: شکریہ کس لیے؟

ایک آدمی: اتنی معلومات فراہم کرنے کے لیے؟

چپراسی: آدمی بڑے سمجھدار لگتے ہیں آپ

ایک آدمی: شکریہ۔

چپراسی: اب میرے لیے کیا حکم ہے؟

ایک آدمی: کیا میں اندر جا سکتا ہوں؟

چپراسی: پہلے تو صاحب سے پوچھنا پڑے گا۔ ایسے ویسے نہیں ہیں ہمارے صاحب! سینئر (Senior) پروفیسر ہیں اس یونیورسٹی کے۔

ایک آدمی: مجھے اس بات سے انکار نہیں ہے آپ کے صاحب بہت بڑے آدمی ہیں اور سینئر بھی۔ انہوں نے ہی مجھے بلایا ہے۔

چپراسی: ایک منٹ۔ میں ان سے پوچھ کے آتا ہوں۔ آپ کا نام؟

ایک آدمی: اخلاق حسین۔

(دروازہ کھلانے کی آواز)

چپراسی: سر؟

پروفیسر کرمانی: ہاں۔کیابات ہے؟

چپراسی: کوئی آپ سے ملنے آیا ہے سر؟

پروفیسر کرمانی: کون ہے؟

چپراسی: اخلاق حسین ہاں یہی نام بتایا انہوں نے

پروفیسر کرمانی: ہاں بھیج دو۔ایک منٹ؟

چپراسی: ہاں !Sir ؟

پروفیسر کرمانی: یہ پھول اس گلدان میں کس نے رکھے ہیں؟

چپراسی: میں نے رکھوائے ہیں سر۔ یہ گلدان برسوں سے آپ کے ٹیبل پر ویران پڑا تھا۔

پروفیسر کرمانی: یہ پھول باہر کہیں ایسی جگہ چھوڑ آؤ جہاں کسی کا گزر نہ ہو تاکہ کوئی انہیں مسل نہ دیں۔

چپراسی: سر،یہ پھول تازہ ہیں۔

پروفیسر کرمانی: Shurt up۔تم سے جو کہا جائے وہی کیا کرو۔

چپراسی: ہاں سر،ٹھیک ہے۔

پروفیسر کرمانی: اور ہاں! میرے کمرے میں آئندہ پھول کبھی مت رکھنا۔ بھول سے بھی نہیں۔

چپراسی: بے ادبی معاف سر۔کیا میں پوچھ سکتا ہوں کیوں؟

پروفیسر کرمانی: یہ گلدان جو میرے اس ٹیبل پر رکھا ہوا ہے کئی سال سے ویران پڑا ہے۔سالوں پہلے جو پروفیسر اس کمرے میں بیٹھتے تھے وہ اِس گلدان میں روز نئے پھول سجاتے تھے یہاں تک کہ ننھی مُنی کلیاں بھی۔

چپراسی: لیکن سر اس گلدان کا کیا قصور ہے؟ کیا آپ کو پھول پسند نہیں ہیں؟

پروفیسر کرمانی: اسی لیے تو پھولوں کو اس گلدان میں نہیں سجاتا ہوں کیوں مجھے پھول بہت پسند ہے میں Botany پڑھاتا ہوں اور پھولوں کا قتل ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ تو پھولوں کا قتل عام ہے۔ روز پھولوں کو شاخوں سے توڑنا۔ قتل عام نہیں ہے تو اور کیا ہے __ وحید؟

چپراسی: ہاں سر۔

پروفیسر کرمانی: کیا تمہیں بچے پسند ہیں؟

چپراسی: بچے کسے پسند نہیں۔ سب لوگ بچوں سے پیار کرتے ہیں اور میں بھی کرتا ہوں۔ لیکن سر بچوں اور پھولوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

پروفیسر کرمانی: کیا تم بچوں کے سر میرے گلدان میں سجا سکتے ہو۔

چپراسی: نہیں سر۔ اللہ وہ دن کسی کو نصیب نہ کرے۔

پروفیسر کرمانی: میرے لیے پھول بھی اُتنے ہی اہم ہیں جتنے کہ بچے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں تمہارے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔ بلاؤ اب اُس آدمی کو جو باہر انتظار کر رہا ہے۔

چپراسی: جی سر (دروازہ کھُلنے کی آواز)

ایک آدمی: Sir, May I come in

پروفیسر کرمانی: Please ۔ آیئے اخلاق صاحب یہاں اس کرسی پر تشریف رکھیے۔ میرے روبرو۔ ہاں۔ یہ ہوئی نا بات۔

ایک آدمی: سر، میں ہی آپ کے اسکالر دانش اخلاق کا والد ہوں۔

پروفیسر کرمانی: جانتا ہوں۔

ایک آدمی: سر آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟

پروفیسر کرمانی: اخلاق صاحب۔ بات دراصل یہ ہے کہ آپ کا بیٹا بڑا ہونہار طالب علم ہے اور محنتی بھی۔ وہ میری سرپرستی میں Ph.D کر رہا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کی Thesis دور تک اور دیر تک آنے والے طالب علموں کی آبیاری کرے۔ ان کے علم کی پیاس بجھائے۔

ایک آدمی: اب میرے لیے کیا حکم ہے سر۔

پروفیسر کرمانی: آپ کے آبائی گاؤں میں آپ کی پانچ کنال زمین ہے۔

ایک آدمی: ہاں پروفیسر صاحب، ہے۔

پروفیسر کرمانی: آپ اس زمین کو فروخت کرنا چاہتے ہیں؟

ایک آدمی: ہاں۔

پروفیسر کرمانی: میں چاہتا ہوں کہ آپ وہ زمین نہ بیچیں اور آپ کے فرزند بھی یہی چاہتے ہیں۔

ایک آدمی: لیکن کیوں؟ اچھی خاصی رقم مل رہی ہے۔

پروفیسر کرمانی: اس زمین میں آپ کے بیٹے نے کئی نئے اقسام کے پودے اُگائے ہیں۔ جو کشمیر کی سرزمین پر آج تک اُگائے نہیں گئے۔ دراصل وہ فقط پودے نہیں ہیں بلکہ حیات بخش درخت ہیں۔ آپ کا بیٹا ریسرچ کر رہا ہے۔ اگر وہ کامیاب رہا تو پورے ملک میں اس کی شہرت میں چار چاند لگ جائیں گے۔

ایک آدمی: پروفیسر صاحب۔ میں آپ کا شکریہ کن الفاظ میں کروں۔ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں دانش کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اب میں اپنی زمین نہیں بیچوں گا۔ نہیں بیچوں گا۔

پروفیسر کرمانی: اگر تمام زمیندار آپ کی طرح بدل جائیں گے تو ہماری زمینوں سے سونا اُگلنے لگے گا۔

--- Flash Back End ---

(2)

پروفیسر کرمانی: (آواز میں بھاری پن)۔ہاہاہا۔کتنا اثر تھا میری باتوں میں۔میری زبان سے جو بھی بات نکلتی تھی۔مخاطب کے دل کو چھلنی کردیتی تھی۔میری باتوں کو لوگ تعویز کی طرح گلے میں ڈال دیتے تھے۔کتنا سخت قسم کا آدمی تھا میں ہاہاہا۔پھوں کو بچوں کی طرح سمجھتا تھا ان سے دیوانگی کی حدتک پیار کرتا تھا۔لیکن آج۔ ہاہاہا۔میرے جذبات وخیالات کو پسند نہیں کیا جاتا ہے جب سے ریٹائر ہو گیا تب سے اپنے ہی گھر میں قید ہو کے رہ گیا ہوں ۔میرا لڑکا جو مجھ سے بہت پیار کرتا تھا میری بہو جو میری عزت کیا کرتی تھی۔آج ۔ ہاہاہا میں بے توجہی کا شکار ہو رہا ہوں۔میرے بچے اب میری باتوں کو پسند نہیں کرتے۔بات بات پر مجھ سے لڑتے ہیں جھگڑتے ہیں۔میری حیثیت میرے گھر میں ایک نوکر کی سی ہے۔

(دروازے پر دستک)

نجیب: پاپا۔ پاپا۔؟

پروفیسر کرمانی: ہاں بیٹا نجیب۔کیا بات ہے؟

نجیب: جلدی سے نیچے آیئے۔

پروفیسر کرمانی: کیا بات ہے؟

نجیب: ساڑھے سات بج رہے۔ہدیہ کو سکول کون لے کر جائے گا۔ آیئے۔جلدی۔آیئے۔

شازیہ: پاپا۔آپ کو جب تک بلایا نہ جائے تب تک آپ سیڑھیاں اتر نہیں سکتے۔

پروفیسر کرمانی: بیٹی۔تھوڑا سا لیٹ ہو گیا۔میں بس اُترنے ہی والا تھا۔

شازیہ: پاپا۔آپ تو پروفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔کوئی ان پڑھ نہیں آپ' آپ کو اپنے فرض کا احساس ہونا چاہیے۔

پروفیسر کرمانی: بیٹی۔ ہدیہ میری پوتی ہے۔میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ میں اپنے فرائض سے آشنا ہوں۔ ہدیہ کو روز سکول لے جانا اور پھر واپس لے آنا۔ یہ بزرگوں کا ہی کام ہوتا ہے۔ بزرگ نہیں کریں گے تو یہ کام کون کرے گا شازیہ بیٹی۔

نجیب: پاپا۔اب بس بھی کیجئے۔ ورنہ بس نکل جائے گی۔

پروفیسر کرمانی: ہدیہ کہاں ہے؟

ہدیہ: ہدیہ یہاں ہے۔میں باتھ روم گئی تھی دادو۔ ہدیہ نئی Uniform میں کیسی لگ رہی ہے دادو۔

پروفیسر کرمانی: چاند سے اتری ہوئی پری۔اب چلئے۔میں آپ کو بس میں چھوڑ آؤں گا۔

شازیہ: پاپا۔یہ بیگ بھی لیتے جائیے۔سبزی لانا بھول مت جائیے گا۔

پروفیسر کرمانی: (Overlap) ہاں۔میڈم جی۔نوکر حاضر ہے۔سبزی لانا بھول کیسے جاؤں گا۔ایک دو بار بھولا تھا لیکن آپ نے ایسا یاد دلایا کہ جگر پر زخم نمودار ہو گیا جو آج بھی رِس رہا ہے۔

نجیب: آپ کیا سوچ رہے ہیں پاپا۔جائیے۔ہدیہ کو سکول میں چھوڑ آیئے۔

ہدیہ: چلئے دادو۔

پروفیسر کرمانی: ہاں چلئے میری چھوٹی سی شہزادی

(3)

(شور۔بازار کی گہما گہمی۔گاڑیوں کا ہارن)

شہناز: پروفیسر۔پروفیسر کرمانی؟ (پکارتے ہوئے)

پروفیسر کرمانی: ارے تم۔انجینئر شہناز۔السلام علیکم

شہناز: وعلیکم السلام

پروفیسر کرمانی: کہو بھئی کیسے ہو۔ بہت دنوں کے بعد نظر آئے۔ خیریت تو ہے؟

شہناز: ہاہاہا۔ ایک بس خیریت ہی نہیں ہے۔ باقی سب کچھ ہے میرے پاس۔

پروفیسر کرمانی: کیوں بھئی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟

شہناز: ارے بھئی پروفیسر کرمانی۔ طبیعت کا کیا ہے۔ بنتی ہے اور بگڑتی ہے۔ لیکن بات کچھ اور ہے؟

پروفیسر کرمانی: شہناز چلو۔ کہیں پہ بیٹھتے ہیں۔

شہناز: کسی ریستوران میں بیٹھتے ہیں؟

پروفیسر کرمانی: نہیں۔ اس وقت نہیں۔ چلو اُدھر اُس پارک میں بیٹھتے ہیں۔

شہناز: ہاں چلو۔

پروفیسر کرمانی: کیا بات ہے؟ تم اتنے اداس کیوں ہو؟

شہناز: بس وہی لاچاری۔ وہی غم۔ وہی بے بسی

پروفیسر کرمانی: پارک میں تو ہم داخل ہو گئے۔ چلئے اس درخت کے نیچے بیٹھتے ہیں۔

شہناز: ارے۔ یہ کیا ہے۔ یہ بیگ۔ اس میں کیا ہے؟

پروفیسر کرمانی: سبزیاں؟

شہناز: ہاہاہا۔ سبزیاں۔ ہاہاہا۔ اس کا مطلب ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد تمہیں بھی اپنے گھر میں نوکری مل گئی ہے۔

پروفیسر کرمانی: نہ نہ۔ نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مہ۔ مہ میرے بچے مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں میرا مطلب میرا بیٹا' میری بہو اور میری پوتی۔ میری پوتی تو مجھ پر جان چھڑکتی ہے ابھی اسی کو سکول بس میں چھوڑ آیا ہوں۔

شہناز: ہاہاہا۔ تمہاری باتوں میں 75 فی صد جھوٹ ہے۔

پروفیسر کرمانی: کیا مطلب؟

شہناز: فقط تمہاری پوتی تم سے پیار کرتی ہے۔ ہاہاہا

پروفیسر کرمانی: ہاہاہا۔ آخر پکڑلی تم نے میری چوری۔ دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔

شہناز: تمہیں یاد ہے ایک دن میں تمہاری یونیورسٹی آیا تھا۔ تمہارے Chamber میں دیر تک ہم باتیں کرتے رہیں۔ تمہیں اپنی اولاد پر فخر ہوا کرتا تھا ہاہاہا۔

Flash Back Starts ---

(ایسا میوزک جسے لگے کہ فلیش بیک آرہا ہے)

(4)

پروفیسر کرمانی: ہاہاہا۔

شہناز: ہاہاہا۔

پروفیسر کرمانی: وہ لڑکا یاد ہے تمہیں، جو کلاس میں سب کے پیچھے بیٹھا کرتا تھا۔

شہناز: کون؟ مجھے یاد نہیں آرہا ہے۔

پروفیسر کرمانی: وہ بلڈوزر۔ جسے سب لڑکے بلڈوزر کہتے تھے۔ ہاہاہا۔

شہناز: ہاہاہا۔ ہاں یاد آیا وہ موٹا اور کالا کالا سا۔ بلڈوزر ہاہاہا۔

پروفیسر کرمانی: پچھلے دنوں میں نے اُس کو یونیورسٹی میں دیکھا بیٹے کے ایڈمشن کے سلسلے میں آیا تھا۔ میں اُسے اپنے ساتھ یہاں لے آیا۔ چائے پلائی اور اس کے بیٹے کی تھوڑی بہت رہنمائی بھی کروائی۔ وہ کامرس میں ایڈمشن لینا چاہتا تھا۔

شہناز: یادیں تازہ ہوگئیں۔ چلو اچھا ہوا۔

پروفیسر کرمانی: شہناز تم پچھلے سال ہی Retire ہو گئے میں اس سال کے آخر پر Retire ہو رہا ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ تم مجھ سے پہلے سبکدوش کیسے ہوئے؟

شہناز: دراصل میرے Date of Birth میں دو سال کا فرق ہے۔ میرے والدین کی لاعلمی کی وجہ سے مجھے دو سال پہلے ہی ریٹائر ہونا پڑا۔

پروفیسر کرمانی: کیسا محسوس ہو رہا ہے تمہیں ریٹائر ہونے کے بعد۔ تم تو اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ Executive Engineer بہت بڑی پوسٹ ہوتی ہے۔

شہناز: Retirement کے بعد انسان کی زندگی میں طوفان آتا ہے۔ لیکن یہ طوفان میری زندگی میں کچھ اس طرح سے آیا کہ میری انا اور غیرت کا وجود ہی مٹ گیا۔

پروفیسر کرمانی: میں کچھ سمجھا نہیں۔

شہناز: میرے بچے میری سبکدوشی سے پہلے مجھ سے بہت پیار کرتے تھے لیکن سبکدوشی کے بعد آہستہ آہستہ اُن کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے اور میری غیرت کی دنیا میں آگ لگ گئی تم جانتے ہو۔ میں نے کتنا پیسہ کمایا۔ legal اور illegal ذرائعوں سے بھی۔ محل جیسا مکان تعمیر کروایا۔ آرام و آسائش کی ہر چیز گھر میں میسر رکھی۔ بیوی کے انتقال کے بعد بچوں کو ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ کیا نہیں کیا ان کے لیے۔ لیکن آج کل میں اپنے ہی گھر میں ایک نوکر کی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں۔

پروفیسر کرمانی: so sad۔ کیا ہو گیا ہے آج کل کی نوجوان نسل کو۔

شہناز: مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے گھر میں قید ہو کے رہ گیا ہوں۔ گھر کے تمام فیصلے میرے بیٹوں کی بیویاں کرتی ہیں اور ان کے کام مجھے کرنے پڑتے ہیں۔

پروفیسر کرمانی: مثلاً

شہناز: مثلاً۔بچوں کوسکول کے لیے تیار کرنا۔سکول بس میں بچوں کو چھوڑنا۔سکول سے انہیں واپس لے آنا۔ہوم ورک دیکھنا یہ سب میرے سپرد کیا جاچکا ہے اور میں زبان تک کھول نہیں سکتا۔سب کو اپنی اپنی فکر لگی رہتی ہے۔میری فکر کسی کو بھی نہیں۔ نوکروں پر آج کل بھروسہ نہیں رہا اس لیے یہ سب کام میرے حصے میں آئے ہیں۔

پروفیسر کرمانی: لیکن تمہارے گھر میں اتنے نوکر ہیں؟ تمہارے ذاتی کام نوکر نہیں کر سکتے۔

شہناز: کچھ کام ایسے بھی ہوتے ہیں جو نوکر نہیں کر سکتے۔

پروفیسر کرمانی: مثلاً

شہناز: محبت۔صحت کا خیال۔ سونے کا وقت۔ جاگنے کا وقت۔دوائی لینے کا وقت۔ان سب چیزوں کا خیال نوکر نہیں رکھ سکتے۔میں ایک دن میں ایک لاکھ روپیہ خرچ کرسکتا ہوں لیکن محبت اور اپنائیت کا ایک لمحہ خرید نہیں سکتا۔

پروفیسر کرمانی: (سانس اندر کی طرف کھینچتے ہوئے) یار۔ سچ مچ تمہاری حالت پر ترس آرہا ہے۔باہر کی چمک دھمک اور اندر کی کڑواہٹ میں کتنا فرق ہے۔ باہر کی چمک دھمک سبھی دیکھ سکتے ہیں لیکن اندر کی کڑواہٹ انسان کو اکیلے ہی ہضم کرنا پڑتی ہے۔چلو۔کھٹی باتیں بہت ہوگئیں۔اب میٹھے کی طرف آتے ہیں

شہناز: میرے اندر فقط کڑواہٹ ہیں وہ میں نے تمہارے ساتھ بانٹ دی اور تمہیں بھی اداس کردیا۔سنا ہے۔تمہیں رجسٹرار بننے کی آفر آئی تھی۔

پروفیسر کرمانی: ہاں بھئی شہناز تم نے صحیح سنا ہے لیکن میں نے اس پوسٹ کو ٹھکرا دیا ہے۔

شہناز: ٹھکرادیا ہے؟ عجیب آدمی ہو تم۔

پروفیسر کرمانی: ہاں عجیب آدمی ہوں میں۔اگر میں نے رجسٹرار کی پوسٹ قبول کی ہوتا تو پھر میں یونیورسٹی میں اور تین سال گذار سکتا تھا۔

شہناز: ارے پھر تم نے یہ کیوں کر کیا؟

پروفیسر کرمانی: بچوں کے لیے۔

شہناز: کیوں کیا ہوا تمہارے بچوں کو۔ اچھے بھلے تو ہیں اچھی نوکری کرتے ہیں۔

پروفیسر کرمانی: ارے بھئی تم بھی کمال کرتے ہو۔ میں گھر کے بچوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اپنے طالب علموں کی بات کر رہا ہوں۔ اگر میں رجسٹرار بن جاتا تو میرے طالب علموں کا کیریئر تباہ ہو جاتا۔ Syllabus ابھی دو مہینوں میں Complete ہونا ہے اور میری سروس ابھی تین مہینے ہیں۔ انہیں کون پڑھاتا اور میری سرپرستی میں جو Ph.D کر رہے ہیں ان کا کیا ہوتا۔ انہیں بھی تین مہینوں میں کام پورا کرنا ہے۔

شہناز: پروفیسر بڑے ظالم ہو تم۔ بڑے ظالم۔ کون سوچتا ہے آج کل تمہاری طرح۔ ریٹائر ہو جاؤ گے پھر پتہ چلے گا جب تمہارے بچے تم سے نظریں پھیر لیں گے تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔

پروفیسر کرمانی: شہناز مجھے اپنے بیٹے اور اپنی بہو پر پورا اعتماد ہے۔

شہناز: خدا کرے کہ تمہارے اعتماد اور یقین کا شیش محل حالات کی بارش سنگ سے محفوظ رہے

--- Flash Back End ---

<u>Scene No.3 resumes again in the Park</u>

شہناز: کیوں آ گئے ہوش ٹھکانے۔ میں نہیں کہتا تھا کہ زمانے کی ہوا خراب ہے اپنے بدن کو ڈھانپ لو ورنہ عمر بھر کھانستے رہو گے۔

پروفیسر کرمانی: سچ مچ محبت کا مطع ابر آلود ہے ہر طرف نفرت اور خود غرضی کی بارشیں ہو رہی ہیں۔ ہم تو سلامت ہیں لیکن اس شہر میں ایک بیٹے نے اپنے باپ کا خون بھی کیا ہے۔

شہناز: اب ہمیں محتاط رہنا پڑے گا۔ ہر لمحہ ہر قدم پر۔

پروفیسر کرمانی: ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ ہم کیا کر سکتے ہیں؟

شہناز: ہم کیا نہیں کر سکتے ہیں۔ ہم اس شہر کے Senior Citizens ہیں ہم سے زمانہ ہے ہم زمانے سے نہیں۔ ہمارے بچے اپنے آپ کو چالاک سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم بھی اُن کے باپ ہیں۔ میں تمہیں جینا سکھاؤں گا چلو میرے ساتھ۔

پروفیسر کرمانی: کہاں؟

شہناز: میں تمہیں آج وہاں لے چلوں گا جہاں سکون ہی سکون ہے جو کام ہمارے بچوں کا ہے جوان کا فرض ہے۔ وہ ہم خود ادا کریں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ اپنے فرض سے بے اعتنائی برتیں گے اس سے پہلے کہ سورج غروب ہو جائیں ہم اپنی روشنی کا انتظام خود کریں گے۔

----☆----

(Change Over)

(موسیقی)

(5)

Flash Back Starts

(گھر کے افراد آپس میں باتیں کرتے ہوئے)

نجیب: ارے بھئی شازیہ جلدی کرو۔ ورنہ بس چھوٹ جائے گی۔

شازیہ: جلدی ہی کر رہی ہوں۔ لنچ اٹھانے تو دیجئے

پروفیسر کرمانی: ارے بھئی کیا بات ہے۔ اتنی بھاگم بھاگ سویرے سویرے۔ یہ سب کیا ہے؟

نجیب: پاپا۔ ہمیں آج آفس والوں کے ساتھ Picnic پر جانا ہے۔

پروفیسر کرمانی: میاں بیوی جب ایک ہی آفس میں کام کرتے ہیں تو اس کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

نجیب: شازیہ۔ چلو چلتے ہیں۔

شازیہ: ابھی کیسے جا سکتے ہیں۔ ہدیہ تیار ہو رہی ہے۔

نجیب: O! my God۔ سمجھو کہ بس چھوٹ گئی۔

شازیہ: کیسے چھوٹے گی ابھی 75 منٹ باقی ہے۔ ہدیہ کو بس میں چھوڑ کر ہی جانا ہوگا۔

نجیب: محترمہ نظر نہیں آ رہی ہے؟

ہدیہ: چلئے! ابو میں تیار ہو کر آ گئی۔

پروفیسر کرمانی: نجیب تم لوگ جاؤ۔ میں ہدیہ کو بس میں چھوڑ آؤں گا اور اس کے بعد یونیورسٹی جاؤں گا۔

شازیہ: پاپا۔ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ ہدیہ کو بس میں چھوڑ آئیں گے یہ بات ہمارے لیے باعثِ شرم ہے۔ آپ تکلیف کیوں کریں گے جب تک ہم لوگ زندہ ہیں تب تک .....

پروفیسر کرمانی: ارے بیٹی۔ تمہیں اللہ سلامت رکھیں۔ مجھے تم لوگوں پر فخر ہیں لیکن کیا ہدیہ میری پوتی نہیں۔ میرا بھی اُس کے تئیں کچھ حق بنتا ہے۔

شازیہ: پاپا۔ ہم سب آپ کے ہیں اور آپ ہمارے، لیکن یہ کام ہم آپ کو کرنے نہیں دیں گے۔

پروفیسر کرمانی: ہاہاہا۔ تم لوگ نہیں مانو گے۔ ہاہاہا۔

Flash Back End -

(6)

پروفیسر کرمانی: (بھاری اور گھمبیر آواز میں) ہاہاہا۔ ہاہاہا۔ ہاہاہا۔ کتنا پیار اور خلوص تھا میرے بچوں کے دلوں میں۔ اگر ہدیہ کو سکول بس تک میں چھوڑنے جاتا۔ تو اس سے ان کے ارواح چھلنی ہو جاتے تھے لیکن آج ہاہاہا۔ آج میں گھر کے تمام چھوٹے بڑے کام کرتا ہوں۔ ہدیہ کو سکول بس میں چھوڑ آتا ہوں۔ اس کا ہوم ورک چک کرتا ہوں۔ اس کو یونیفارم پریس کرتا ہوں۔ کبھی کبھی اُس کے جوتے پالش بھی کرتا ہوں۔ لیکن میری بہو اور بیٹے کے کان پر جُو تک نہیں رینگتی۔ پہلے مجھ سے اتنی محبت کیوں کرتے تھے مجھے اتنی عزت کیوں دیتے تھے۔ شاید میرے رُتبے کی وجہ سے۔ رتبہ چِھن گیا۔ بچوں کے دلوں سے محبت اور خلوص بھی جاتا رہا۔ ہاہاہا۔

(اسی میں دروازہ کھلنے کی آواز آتی ہے)

ہدیہ: دادو۔ دادو۔ السلام علیکم

پروفیسر کرمانی: وعلیکم السلام بیٹا۔ بیٹھو میرے نزدیک۔ ہاں۔ یہ ہوئی نا بات!

ہدیہ: آپ ہمارے ساتھ نیچے کچن میں کیوں نہیں بیٹھتے؟

پروفیسر کرمانی: ارے بھئی۔ کس نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ کچن میں نہیں بیٹھتا ہوں۔ کھانا تو آپ کے ساتھ ہی کھاتا ہوں وہ بھی کچن میں۔

ہدیہ: لیکن Sitting روم میں آپ کبھی نہیں بیٹھتے ہمارے ساتھ۔

پروفیسر کرمانی: ارے بیٹا۔ وہاں بیٹھ کر کیا کروں گا۔ مجھے اپنا کام ہوتا ہے نا؟

ہدیہ: لیکن آپ تو یونیورسٹی سے ریٹائر ہو گئے۔

پروفیسر کرمانی: ہاں۔ میں سچ مچ ریٹائر ہوگیا۔ یونیورسٹی سے بھی اور زندگی سے بھی۔

ہدیہ: دادو۔ آپ کو پتہ ہے۔ میں Doctor بنوں گی۔ ڈاکٹر ہاں! پھر میں لوگوں کا علاج کروں گی اور بہت سارا پیسہ کماؤں گی۔

پروفیسر کرمانی: نہیں بیٹا۔ آپ کو ڈاکٹر نہیں بننا ہے۔ یہ کس نے کہہ دیا کہ آپ کو ڈاکٹر بننا ہے اور پھر بہت سارا پیسہ کمانا ہے؟

ہدیہ: ممی نے۔

پروفیسر کرمانی: دیکھو بیٹا۔ یہ غلط بات ہے؟

ہدیہ: پھر آپ ہی بتائیں مجھے کیا بننا چاہیے۔

پروفیسر کرمانی: Scientist۔ اور پھر تم نئے نئے تجربے کروگی اور ملک وقوم کی خدمت کروگی۔

(دروازہ کھولنے کی آواز)

شازیہ: پاپا۔ آپ ہماری بیٹی کو یہ کون سی تعلیم دے رہے ہیں۔ ملک وقوم کی خدمت کرنے کے لیے فقط ہماری بچی ہی رہ گئی ہے؟۔ اور ہاں اپنے والدین کے خلاف بچے کو بھڑکانا اچھی بات نہیں۔

پروفیسر کرمانی: شازیہ! کان لگا کر دروازے کی آڑ میں کسی کو گفتگو سننا بھی اچھی بات نہیں۔

(Change Over)

(موسیقی)

(7)

(گاڑی چلنے کی آواز)

شہناز: پروفیسر چلو آج کہیں Long Drive پر چلتے ہیں۔

پروفیسر کرمانی: آج نہیں۔کل چلیں گے۔

شہناز: کیوں آج کیا ہے۔

پروفیسر کرمانی: آج بہو بیگم اور بیٹا جی گھر پر نہیں ہیں۔وہ دعوت پر گئے ہیں کل تک لوٹیں گے۔

شہناز: اس کا مطلب ہے کہ آپ گھر کی چوکیداری کررہے ہیں۔

پروفیسر کرمانی: مجبوری ہے کیا کریں گے۔

شہناز: ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچ رہے ہیں۔میں معمول کے مطابق اس دکان کے آگے گاڑی پارک کروں گا۔

پروفیسر کرمانی: ٹھیک ہے۔پھر ہم سکون کی جگہ پائیں گے۔کچھ پل وہاں گزار کے لوٹیں گے۔

(گاڑی پارک کرنے کی آواز۔اور کھڑکیاں بند کرنے کی آواز)

(اذان گونج رہی ہے) اللہ اکبر..... اللہ اکبر.....''

شہناز: اس مسجد کے پچھواڑے میں وہ ویران جگہ ہے۔مسجد سے 25-30 Yards کی دوری پر یہ جگہ واقع ہے۔

پروفیسر کرمانی: کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔

شہناز: چلو چلتے ہیں۔اس ویران جگہ پر ہمیں کون دیکھے گا۔

(Change Over)

(موسیقی)

(8)

شازیہ: نجیب۔ نجیب

نجیب: او۔ہو۔کیا بات ہے دیکھ نہیں رہی ہو۔میں پیپر پڑھ رہا ہوں۔

شازیہ: پیپر بعد میں پڑھا جاسکتا ہے۔ پہلے میری بات غور سے سنو۔

نجیب: ہاں بتاؤ؟

شازیہ: میں پاپا کے اندر ایک بڑی تبدیلی محسوس کررہی ہوں۔

نجیب: تبدیلی؟

شازیہ: مجھے لگتا ہے کہ اُن کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔

نجیب: کیا بات ہے؟ صاف صاف بتاؤ۔؟

شازیہ: وہ شہناز انکل کے ساتھ روز کہیں جاتے ہیں یہی کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب اتوار اور چھٹیوں کے دن بھی جانا نہیں بھول جاتے۔

نجیب: جاتے کہاں ہوں گے۔

شازیہ: میں نے اُن دونوں کی باتیں ان کے کمرے کے باہر چھپ چھپ کے سنی ہیں، وہ کہہ رہے تھے کہ وہ جگہ 4th برج کی مسجد کے عقب میں ہے اور کہہ رہے تھے کہ جگہ ویران ہے اور وہ کچھ Material وہاں پہنچانے کی بات بھی کررہے تھے۔

نجیب: مسئلہ سنگین ہے۔ میں شہناز انکل کے بیٹے خاور سے بات کرکے دیکھوں گا۔

(Change Over)

(موسیقی)

(9)

خاور: ارے بھئی نجیب۔ آج تم میرے آفس میں کیسے آگئے۔ ستارہ زمین پر کیسے آگیا۔

نجیب: خاور۔ دراصل بات کافی سنجیدہ ہے۔ ہمارے والد اور تمہارے والد آپس میں گہرے دوست ہیں۔ کیا آپ نے اپنے والد میں کوئی تبدیلی محسوس کر رہے ہیں۔

خاور: ہاں نجیب۔ کچھ دنوں سے وہ آپ کے والد کے ساتھ فون پر عجیب قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے ایک دوبار ان کی گفتگو چپکے چپکے سُنی۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ کوئی غیر قانونی کام کرتے ہیں۔

نجیب: ہاں مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ 4th Bridge کی مسجد کے عقب میں کوئی ویران جگہ ہے۔ انہوں نے کوئی Material بھی پہنچایا ہے وہاں۔

خاور: ایسا کون سا Material ہو سکتا ہے جو وہ گھر میں نہیں رکھ سکتے۔

نجیب: مجھے تو لگتا ہے کہ کوئی Smugling کا مال ہے جس کا وہ وہاں پر ذخیرہ کر رہے ہیں۔

خاور: مگر وہ ایسا کیوں کریں گے؟

نجیب: ارے تم تو عجیب قسم کے سوال پوچھ رہے ہو۔ Retirement کے بعد انسان میں کافی بدلاؤ آتا ہے۔ بے کار ہو گئے سوچا ہو گا کہ کچھ نہ کچھ کریں گے تاکہ گھر میں بیٹھنا نہ پڑے۔

خاور: ہاں۔ یہی بات ہے۔ گھر کا کام کرنا انہیں بالکل بھی گوارا نہیں ہوتا۔ نجیب اب ایسا کرتے ہیں کہ کل ان کا پیچھا کریں گے۔ انہیں رنگے ہاتھوں پکڑتے ہیں۔

نجیب: ہاں یہ تجویز اچھی ہے۔ پھر میں کل ڈیڑھ بجے تمہارا انتظار مسجد کے پاس کروں گا۔

(Change Over)

(موسیقی)

(10)

اللہ اکبر ۔ اللہ اکبر (خوب صورت آواز میں اذان)

خاور: ہم اس چنار کی آڑ میں چھپے ہوئے ہیں۔ وہ ہمیں نہیں دیکھ سکیں گے۔

نجیب: وہ دیکھو! وہ۔ دونوں گاڑی سے اتر رہے ہیں۔ دکان کے آگے گاڑی پارک کردی۔

خاور: ہاں نجیب۔ چھپ جاؤ پوری طرح سے تمہارا ایک کاندھا دور سے دِکھ رہا ہے۔ کاندھے کو اندر رکھو۔

نجیب: ارے وہ دیکھو۔ مسجد کے پیچھے کی طرف جارہے ہیں۔ پہلے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تب اس احاطے کے اندر چلے گئے۔

خاور: چلو۔ چلتے ہیں۔ اب ان کا پیچھا کرتے ہیں۔

نجیب: ہاں سڑک تو ہم نے کراس کردی۔

خاور: اب اس احاطے کے اندر گھُستے ہیں۔

نجیب: ارے یہ تو قبرستان ہے۔ اتنا وسیع قبرستان۔

خاور: یہی تو وہ مال چھپاتے ہوں گے۔

نجیب: آج انہیں رنگے ہاتھوں پکڑتے ہیں۔ قبرستان میں ان کا کیا کام ہے؟

خاور: یہ لوگ نظر نہیں آرہے ہیں آخر گئے کہاں ہوں گے۔

نجیب: ہاں۔ اب بات میری سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگی ہے۔ خاور۔ یہ لوگ کسی قبر کے اندر گھُسے ہوں گے۔ قبر کا ڈکن Automatic طریقے سے کھلتا ہوگا اور پھر بند ہوتا ہوگا۔ دونوں سونے یا ڈرگس کی Delivery دیتے ہوں گے۔ فلموں میں ایسا ہی دکھاتے ہیں اور فلمیں سماج کی عکاس ہوتی ہیں۔

خاور: نجیب۔ وہ دیکھو۔ اُدھر اُس کونے میں۔ دونوں ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ فاتحہ پڑھنے کی Acting کررہے ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں منہ میں رام رام بغل میں چھری۔ چلو دیکھتے ہیں۔

(چلنے کی آواز)

نجیب: ہاہاہا۔ پاپا۔

خاور: ڈیڈی۔

پروفیسر کرمانی: ارے نجیب تم لوگ۔

شہناز: خاور۔ تم یہاں کیا کررہے ہو۔

خاور: یہ سوال تو ہم پوچھنے آئیں ہیں آپ لوگوں سے؟

نجیب: آپ لوگ ہرروز اِس ویران قبرستان میں کیا کرنے آتے ہیں۔

پروفیسر کرمانی: کہ کہ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں بس یوں ہی۔

شہناز: بس بیٹا۔ یوں ہی چلے آتے ہیں۔ ٹہلنے کی غرض سے۔

نجیب: آپ لوگ یہاں ٹہلنے آتے ہیں اور وہ بھی اس ویران جگہ پر۔

شہناز: دیکھو! بیٹا۔ بات دراصل یہ ہے.....''

خاور: ارے۔ ان قبروں کے سنگِ مزار پر یہ کیا لکھا ہے؟

نجیب: میں پڑھتا ہوں۔ پروفیسر سید رفیع احمد کرمانی۔ پیدائش مارچ ۱۹۵۲ وفات ــــــ وفات کے آگے لکیر۔

خاور: اور اس دوسرے کتبے پہ لکھا ہے۔ انجینئر شہناز حسین۔ پیدائش دسمبر ۱۹۵۱ وفات ــــــ وفات کے آگے لکیر۔

نجیب: یہ سب کیا تماشا ہے۔ آپ لوگ زندہ ہیں اور آپ کی قبریں یہاں موجود ہیں۔

خاور: نجیب۔ مجھے لگتا ہے کہ ان قبروں کے اندر سونا یا ہیرے جواہرات چھپے ہیں جن کا غیر قانونی کاروبار یہ لوگ کرتے۔ Material ان ہی قبروں میں ہوگا۔

پروفیسر کرمانی: واہ! بیٹے واہ۔ بہت خوب۔ سننا چاہتے ہو ان قبروں میں کیا دفن ہیں۔

خاور: ہاں۔ ہاں بتائیے؟

پروفیسر کرمانی: ان قبروں میں ہمارا مستقبل، ہمارے ارمان، تم لوگوں کی بے وفائی اور بے مہری چھپی ہوئی ہیں اور جسے تم Material کہتے ہو اس سے ہم نے ان قبروں کی تعمیر کی ہے۔ Material سے مراد اینٹ، پتھر، سیمنٹ وغیرہ نہ کہ سونا چاندی اور جواہرات۔

شہناز: دراصل ہمیں معلوم ہے کہ تم لوگ ہمارے جانے کے بعد کبھی ہماری قبروں پر آکر دو پھول چڑھانے کے لیے نہیں آؤ گے اور نہ کبھی یہاں ہمیں فاتحہ پڑھنے کے لیے آؤ گے۔

پروفیسر کرمانی: اس لیے یہ کام ہم خود سر انجام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ہم روز یہاں آتے ہیں۔ اپنی قبروں کا انتظام ہم نے خود کر دیا ہے۔ تم لوگوں سے یہ بھی توقع نہیں کہ تم ہمارے لیے دو گز زمین کا انتظام کر سکو۔

شہناز: ہم وہ دراز سائے ہیں جنہیں غروب آفتاب کے بعد غائب ہونا ہے۔ لیکن ہم زندگی کے آسمان پر شفق چھوڑ کے جائیں گے۔

............●●● ....

تبصرۂ کتب

(1)

کتاب: کھوکھلی گگر (افسانے)

افسانہ نگار: احمد رشید (علیگ)

مبصر: ڈاکٹر ریاض توحیدی

چند برس قبل احمد رشید کا افسانوی مجموعہ ''بائیں پہلو کی پسلی'' پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اُس مجموعے کے معیاری افسانے پڑھ کر دل باغ باغ ہوا تھا اور ایک تنقیدی مضمون لکھ کر حق قرأت بھی ادا کیا تھا۔ احمد رشید فنِ افسانہ پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ افسانے میں اشاروں کنایوں میں بات کرنے کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں میں گہرے مشاہدے کے زیر اثر علم وفکر کا وسیع جہان بھی موجود ہوتا ہے جس کا اندازہ ان کے پہلے اور دوسرے افسانوی مجموعے ''وہ اور پرندہ'' اور ''بائیں پہلو کی پسلی کے علاوہ پیش نظر کتاب ''کھولی گگر'' کے درجہ ذیل افسانوں سے لگایا سکتا ہے:

''ابتدا کی طرف واپسی'' ''بھورے سید کا بھوت'' ''دوسال بعد'' ''ویٹنگ روم'' ''بجوٹ'' ''مداری'' ''بن باس کے بعد'' ''وہ اور پرندہ'' ''کھولی گگر'' ''حصار'' ''پیشن گوئی'' ''صدیوں پر پھیلی کہانی'' ''بائیں پہلو کی پسلی'' وغیرہ۔

کتاب کی ابتدا میں محمد غالب نشتر کا ایک اہم مضمون ''نئی علامت نگاری اور احمد رشید کے افسانے'' شامل ہے۔ اس مضمون میں احمد رشید کے افسانوی سفر، اسلوب، موضوعات اور کہانیوں کا دلچسپ جائزہ پیش ہوا ہے۔ احمد رشید کی افسانہ نگاری کا احاطہ کرتے ہوئے

محمد غالب نشتر لکھتے ہیں:

''احمد رشید کے فکشن کا ایک خاص ڈکشن ہے اور موضوع کے ساتھ ٹریٹ منٹ کا اپنا ایک خاص انداز ہے جسے وہ علامات' استعارات اور تشبیہات کے ذریعے بیان کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں اور بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔ ان کی کہانی ایک ہی قرأت میں ختم کرنے کا تقاضا کرتی ہے' ورنہ کہانی کا سرا ذہن سے پھسل جاتا ہے اور قاری' کہانی میں استعمال شدہ علائم سے پوری طرح واقف نہیں ہوسکتا۔ یہی ان کے افسانوں کا فنی اختصاص ہے۔''

(کھو کھلی گگر: ص،۳۴)

اس مجموعے کے کئی افسانے دلچسپ موضوعات اور لطف انگیز مطالعہ کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ افسانہ ''ابتدا کی طرف واپسی'' کا بنیادی موضوع روحانی سکون کی تلاش ہے جس کو متصوفانہ افکار کے ساتھ ختم کیا گیا ہے۔ افسانے کی کہانی میں ایک طرح سے فینٹسی کا تجربہ برتا گیا ہے جو کہانی کی دلچسپی میں اضافہ کررہا ہے۔ افسانے میں مرکزی کردار کی روحانی بے چینی کو بڑی ہنر مندی سے ٹریٹ کیا گیا ہے اور آخر پر اسلامی تصوف کے حقیقی وسیلے اور مقصد کو یوں ظاہر کیا گیا ہے:

''جنگل میں رہنے کے بجائے مخلوق خدا کے درمیان میں رہ۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھے نیک بخت بنائے۔ ان شاء اللہ۔ تم ایسا درخت ہوگے جس کے سایہ میں مخلوق خدا آرام پائے گی اور فیض پائے گی۔ تم مجاہدہ برابر کرتے رہنا' اس سے غافل نہ ہونا۔'' باریش بزرگ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس نے گھر واپسی کے لئے قصد سفر باندھا۔ نئی صبح کا سورج اندھیرے کی چادر پھاڑ کر طلوع ہو رہا تھا ہے اور سارا منظر انوارِ الٰہی

میں ڈوب رہا ہے۔''

پیش نظر کتاب کا ایک افسانہ ''بھورے سید کا بھوت'' ہارر فکشن (Horror Fiction) کے زمرے میں آتا ہے' کیونکہ افسانے میں ایک خوف انگیز سماجی تو ہم پرستی کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ مرکزی کردار کی نفسیات پر بچپن میں بھورے سید کے بھوت کا خوف اثر انداز ہوتا ہے اوراس کی نفسیات پر تاعمر تو ہم پرستی کا یہ خوف چھایا رہتا ہے لیکن افسانے کے کلائمکس میں تو ہم پرستی پر طنز آمیز نشتر چلانے سے کہانی دلچسپ موڑ لیتی ہے اوراس کے منفی اثرات سے بچنے کی راہ بھی ہموار کرتی ہے۔ رات کے سناٹے میں جب مرکزی کردار قبرستان کے راستے سے گھر لوٹتا ہے تو وہ معمولی آہٹ سن کر خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ چلتے چلتے اس کی نظر ایک کالے سائے پر پڑتی ہے اور سایہ کے سکڑتے ہی اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ ایسے بھیانک منظر سے حافظہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور وہ بڑی مشکل سے معوذتین کا ورد شروع کر دیتا ہے تا کہ خوف سے نجات پا سکے۔ اس کے بعد افسانہ نگار نے کلائمکس میں نہ صرف کردار کے خوف بلکہ بین المتن تو ہم پرست افراد کی مریضانہ سوچ کو ڈرامائی انداز سے یوں بے نقاب کیا ہے:

> ''بشیر صاحب! اتنی رات گئے کہاں سے آرہے ہیں۔'' فضا میں ایک آواز گونجی، خوف کی وجہ سے میری گِھگی بند گئی۔
>
> چاروں طرف نظر دوڑائی' جواب دینے کے بجائے میرے اوپر سکتہ طاری ہو گیا۔
>
> وہ سایہ دو قدم آگے بڑھا.... میرے شانہ کو زور سے حرکت دی۔ ''کہاں کھو گئے، میں آپ ہی سے پوچھ رہا ہوں۔''
>
> ''ہوں'' میں نے چونک کر دیکھا ''ارے سعید صاحب، آپ ہیں۔''
>
> ''ہاں' پیشاب کرنے آیا تھا.... آپ کو دیکھ کر رُک گیا۔''
>
> ایک ہی لمحہ وہ خوفناک منظر میری نگاہوں سے غائب ہو گیا۔۔۔''

امتیاز جنس فکشن کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔اس موضوع میں عام طور پر مرد کی حاکمیت اور عورت کی محکومیت کو ڈسکورس بنایا جاتا ہے۔حقوق نسواں کے تناظر میں دیکھیں تو نسائی تحریکوں کا اثر کسی نہ کسی صورت میں شعر وادب پر بھی پڑتا رہا اور نسائی مسائل وموضوعات کا مکالمہ تانیثی تھیوری کی صورت اختیار کر گیا۔زیر نظر مجموعے میں افسانہ ''بائیں پہلو کی پسلی'' کی کہانی بھی تانیثی ڈسکورس پر تخلیق ہوئی ہے۔افسانے کی کہانی نسائی مسائل وموضوعات کا ایک ایسا تخلیقی منظر نامہ ہے جس میں عورت کی تخلیق سے لے کر موجودہ عہد تک کے زمانے کا احاطہ کیا گیا ہے۔افسانے کا پلاٹ ایک عورت کی ذہنی کیفیات اور نفسیاتی الجھنوں پر تشکیل ہوا ہے۔کہانی میں چونکہ ایک عورت ہی مرکزی کردار کے حیثیت سے موجود ہے' اس لئے کہانی کی ابتدا مرکزی کردار کی احساس کمتری سے شروع ہو کر مختلف ادوار کے معاشرتی' عائلی اور مذہبی معاملات اور مسائل کا احاطہ کرتی ہوئی اختتام کو پہنچتی ہے۔ایک طرح سے یہ افسانہ تانیثی موضوعات کا ایسا فنکارانہ اظہار ہے جس میں فلیش بیک تکنیک کے توسط سے قدیم دور سے لے کر جدید دور کے بنیادی نسائی مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور تواریخی انداز سے کئی ادوار کے منفی اور مثبت اپروچ کی دلچسپ افسانوی عکاسی کی گئی ہے۔افسانے کا بنیادی موضوع عورت کا وہ نفسی تناؤ (Psychic Tention) ہے جو تواریخی طور پر ہر دور کی عورت کی نفسیاتی جبریت (Psychological Determinism) کا افسانوی احاطہ کر رہا ہے۔ افسانے میں عورت کے اس نفسی تناؤ کی شروعات شجر ممنوعہ جو کہ ایک مذہبی قصہ ہے' سے کی گئی ہے اور مرکزی کردار کی زبان سے تناؤ کے اس ابتدائی مرحلے کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

''مجھ کم عقل کی مت ماری گئی۔لالچ اور خواہش میں آ گئی....ایک عجیب تذبذب کا عالم تھا..... ہاں یا نا کی کشمکش تھی.....
صبر اور خواہش کی اس جنگ میں صبر ہار گیا۔شجر ممنوعہ کے پھل کھانے کا انجام یہ ہوا کہ ستر کھل گئے۔الزام میرے سر گیا''۔

افسانے میں عورت کی داستان کو منطقی انداز سے بیان کیا گیا ہے اور اسلام کی مثبت تعلیم کے ساتھ ساتھ دور جدید کے حقوق نسواں کی تحریکوں کے پس منظر میں موجودہ دور کی تعلیم یافتہ عورت کی استحصال احساس سوچ اور فکری الجھاؤ کے دائرے میں مکمل کیا گیا ہے۔اس افسانے کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ افسانے کا بیانیہ مابعد جدید افسانے کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ اس میں صرف ایک کردار کا واقعہ بیان نہیں ہوا ہے بلکہ آزادانہ طور پر ایک جنس کی تواریخی روداد بھی پیش ہوئی ہے۔اب افسانے کے پلاٹ کی بات کریں تو کئی جگہ پر کہانی میں صحافتی اسلوب کے زیر اثر سنسنی خیز ماحول بنانے کی کوشش نظر آتی ہے جو کچھ حد تک کہانی کے تسلسل کو متاثر کر رہا ہے۔ مثلاً:

''ڈاکٹری زندگی کو موت کے منہ سے چھیننے کا پیشہ ہے لیکن ڈاکٹر موت کا دوسرا نام ہے۔''

''عرب بہاریہ'' جلی خبر.....لبنان میں انقلاب.....شام میں انقلاب کی دھمک.......''

مجموعی طور پر یہ افسانہ تانیثی فکشن کی عمدہ مثال قرار دیا جا سکتا ہے' کیونکہ اس کی کہانی میں تانیثی مسائل وموضوعات کی بہترین افسانوی عکاسی کی گئی ہے۔

اس طرح سے شامل کتاب افسانے کسی نہ کسی سماجی' عائلی اور سیاسی مسئلے کو موضوع گفتگو بناتے نظر آتے ہیں۔افسانہ ''بجوٹ'' سماج کے ایک اہم مسئلے یعنی بانجھ پن کو موضوع بحث بنا رہا ہے۔دراصل عورت پر بچہ نہ جننے کی وجہ سے بانجھ ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے جو کہ باکردار ہوتی ہے لیکن اصل میں مرد ہی جنسی کمزوری کا شکار ہوتا ہے اور میڈیکل چیک اپ کرنے کے باوجود وہ عورت کو ہی قصوروار ٹھہراتا ہے اور اسے طلاق دیتا ہے۔چند برسوں کے بعد ڈاکٹر کی زبان سے ایک نئی کہانی سامنے آتی ہے جس کو کلائمکس میں دلچسپ انداز سے اجاگر کیا گیا ہے۔ڈاکٹر جاوید جب عارف کو ساتھ لائے ہوئے بچے سے متعلق پوچھتا ہے کہ بچہ آپ کا ہے تو عارف اثبات میں جواب دیتا ہے اور الٹا

سوال کرتا ہے کہ آپ نے کہا تھا کہ میں باپ نہیں بن سکتا۔اس کے بعد جب ڈاکٹر اسے پہلی بیوی کے بارے میں جاننا چاہتا ہے تو عارف کی زبان سے طلاق کا سن کر ڈاکٹر کا جواب عارف کے ضمیر پر کوڑے مارنے سے کم نہیں ہوتا ہے:

''آپ نے برا کیا'' ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیوں؟'' عارف نے بے زاری کا اظہار کیا۔

''کیوں کہ تمہاری پہلی بیوی ایک صابر محتاط اور خود محفوظ عورت تھی۔''

میز پر رکھی ہوئی الحیاتین سیرپ کی بوتل پر بچے کا ہاتھ لگنے سے نیچے گر گئی۔اچانک چھناک کی آواز ہوئی۔ڈسپنسری کی خاموشی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی....بچہ سہم گیا'' پاپا چلئے'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔''

مجموعے کے دیگر افسانوں میں افسانہ ''وہ اور پرندہ'' ایک ماہرانہ علامتی تخلیق ہے۔اس میں تخلیق کائنات سے لیکر تخلیق آدم، حیات و کائنات کے مسائل، وقت اور تہذیب وغیرہ موضوعات کو اساطیری اور مذہبی فکر، اسلوب اور کرداروں کے توسط سے شاندار کہانی کا روپ دیا گیا ہے۔بہرحال، کتاب کے سبھی افسانے احمد رشید کی ماہرانہ صلاحیت اور عمدہ اسلوب کی قابل ستائش عکاسی کرتے ہیں۔البتہ جو تخلیقی رچاؤ مجموعہ ''بائیں پہلو کی پسلی'' کے افسانوں میں نظر آتا ہے وہ اس مجموعے کی چند ہی کہانیوں میں دکھائی دیتا ہے۔اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کے کئی افسانوں میں تصوف اور اخلاقی فکر ونظر کا مقصد غالب رہا ہے جس کی وجہ سے فن کے اوپر ناصحانہ انداز غلبہ پا گیا ہے اور افسانے کا پلاٹ فنی چابکدستی کے برعکس پیام کی ترسیل تک ہی محدود رہا ہے۔

............●●●............

(2)

نام کتاب: کلونیلزم/پوسٹ کلونیلزم (انگریزی)
مصنف: آنیالُومبا (پروفیسر، کیلی فورنیا یونیورسٹی)
مبصر ڈاکٹر: اشرف لون

پوسٹ کلونیلزم (مابعد استعماریت مابعد نوآبادیت) کا خیال ہمارے ذہنوں میں آتے ہی کلونیلزم (استعماریت یا نوآبادیت) کا تصور بھی ساتھ ہیں آتا ہے۔ کیوں کہ مابعد نوآبادیت، نوآبادیت کے بعد والا ہی ڈسکورس اور زمانہ ہے۔اس لیے مابعد نوآبادیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے نوآبادیاتی علوم کا مطالعہ ضروری بن جاتا ہے۔ مابعد نوآبادیت کا ڈسکورس مابعد جدیدت کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ مابعد نوآبادیت کی تھیوری کو آگے بڑھانے والوں میں ایڈورڈ سعید، گیاتری سپاوک اور ہومی بابا کے نام اہم ہیں۔ آنیالومبا نے اپنی کتاب '' نوآبادیت/مابعد نوآدیت'' میں ان دانشوروں اور دوسرے بڑے مفکروں کی روشنی میں استعمار پسند یورپی قوتوں کا تجزیہ کیا ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں آنیا لومبا نے نوآبادیت اور مابعد نوآبادیت کی وضاحت کی ہے اور تاریخ میں ان کے رول اور آج کے دور میں ان علوم کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ مصنفہ نے بتایا ہے کہ کس طرح برطانوی حکومت اپنی ماقبل حکومتوں سے مختلف تھی اور کس طرح انہوں نے اپنے زیر نگین ملکوں کا استحصال کیا۔ لومبا کے مطابق نوآبادیاتی طاقتوں نے اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے مختلف حربے اپنائے اور پھر ان چیزوں نے ہی جدید یورپی سرمایہ داری کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔اور دوسرے یہ کہ

نوآبادیت کے بغیر یورپ میں سرمایہ دارانہ نظام پنپ نہ پاتا۔ مصنفہ ایک جگہ لینن کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ صنعتی انقلاب سے یورپ میں جو دولت جمع ہوئی تھی اس کو یورپی طاقتوں نے اپنے زیرِنگین علاقوں میں سرمایہ کاری کی جس سے ان کی دولت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا لیکن ان کے زیرِنگین علاقے پستی کی دلدل میں چلے گئے۔ لومبا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ کوئی ملک ایک وقت میں آزاد بھی رہ سکتا ہے لیکن اسے ہم نیا نوآبادیاتی ملک بھی کہہ سکتے ہیں اگر وہ ثقافتی اور اقتصادی طور پر اب بھی کسی دوسرے ملک (امریکہ یا برطانیہ) پر منحصر رہتا ہو۔ اس سلسلے میں لومبا کا مزید کہنا ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد جو ملک آزاد ہوئے ہیں ان میں ابھی تک عورتوں، کاشتکاروں اور مزدوروں اور دوسری 'ادنیٰ اور پچھڑی ذاتوں' کو پورے حقوق نہیں ملے ہیں جس کا انہوں نے خواب دیکھا تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں استعماریت کا سامنا ان ملکوں میں اب مقامی سطح پر بھی ہے اور اس لیے مابعد نوآبادیت کی اصطلاح کا اطلاق ہمیں کافی غور و فکر کے بعد کرنا ہوگا کیوں کہ یہ اصطلاح اپنے ساتھ کافی تضاد بھی لائی ہے :

> ''نوآبادیت کو ہم صرف بیرونی ملک یا لوگوں سے وابستہ نہیں کر سکتے اور نہ ہی صرف باہری طاقتوں کے اندرونی قوتوں کے ساتھ مل کر یہ انجام پاتی ہے بلکہ اس کا ایک مقامی رنگ بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح (آج) نوآبادیت کا اطلاق بے ربطی سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے اندر متعدد تضادات اور حد بندیاں ہیں۔'' (ص 16)

ایڈورڈ سعید کے مطابق یورپی طاقتوں نے باضابطہ اپنے فائدے اور ایک مقصد کے لیے مشرقی اقوام کے متعلق علوم کو اکٹھا کیا اور ان علوم میں انہوں نے دوسرے شعبے عمرانیات، تاریخ اور فلسفے کو ملایا۔ ان مستشرقوں نے اپنے زیرِنگیں علاقوں پر قبضہ جمانے میں یورپی طاقتوں کی مدد کی اور یہ کہ مشرق اور مغرب کے بیچ تفرقہ پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ آنیا لومبا نے اپنی کتاب میں سعید کی تھیوری سے پوری بحث کی ہے اور

مثالوں سے واضح بھی کیا ہے۔ایڈورڈ سعید کے مطابق مستشرقوں کا مشرق کو سمجھنے کا طریقہ متعصّبانہ تھا اور ان کا مطالعہ حقیقی نہیں بلکہ

''ایک سیاسی نقطہ نظر ہے معروف قوم (یورپ، مغرب) اور اجنبی (مشرقی)۔جب کوئی مشرقی اور مغربی پیمانوں پر کسی چیز کی تحقیق اور عوامی پالیسی میں اس کو اپناتا ہے تو اس کو نتیجہ یقینی دوریوں کو بڑھاتا ہے۔اس طرح مشرقی زیادہ مشرقی اور مغربی زیادہ مغربی بن جاتا ہے اور یہ مختلف ثقافتوں، سماجوں اور خیالات کے آپسی میل جول پر روک لگا دیتا ہے۔''

(ص،۴۳ تا ۴۴)

مصنف کے مطابق نوآبادیت نے یورپیوں اور غیر یورپیوں کے بیچ تعلقات کو مزید توسیع دی جس سے ان دونوں کو ایک دوسرے کو جاننے کا زیادہ موقع ملا حالانکہ استعماری قوتوں نے غیر یورپیوں کو ایک مخصوص عینک سے دیکھا اور مستشرقیوں کے غیر یورپیوں کو ادنیٰ درجے کا قرار دینے سے نوآبادیاتی نظام کو ان مشرقی قوموں میں قائم رکھنے کا جواز مہیا کیا اور ساتھ ہی ادبی علوم نے مقامی لوگوں میں مغربی اقدار کو بڑھاوا دینے اور یورپی ثقافت کو برتر قرار دینے نے یہاں یورپی استعماریت کو دوام عطا ہوا۔ اس سلسلے میں مصنفہ نے کچھ ادبی دستاویزات کا جائزہ بھی لیا ہے اور دکھایا ہے کہ کس طرح مستشرقیوں نے یہ کام انجام دیا۔ اس سلسلے میں انہوں ایڈورڈ سعید، گوری وشوناتھن، آلتھیوزر اور دوسرے مفکرین کی آراء بھی پیش کی ہیں۔ آلتھیوزر کے مطابق تعلیمی نظام غالب نظریوں کو حاوی ہونے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔

مصنفہ ڈکلان کبارڈ کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ ترجمہ کا بنیادی مقصد ''فتح کرنا'' تھا اور اس سلسلے میں مزید لکھتی ہیں:

''یہ استعماری قوتوں کا ایک اہم قدم ہے غیر یورپیوں کی درجہ بندی کرنے، محفوظ کرنے، اور پیش کرنے کی کوشش ہے۔۔۔تاکہ پھر انہیں

آسانی سے سامراجی مفاد کے لیے استعمال کیا جائے۔'' (ص ۸۸)

کتاب کے دوسرے باب میں مصنفہ نے یورپی نسل پرستی اور نسلی تصادم کے بارے میں بڑی جاندار بحث کی ہے اور ساتھ ہی اس کی مختصر تاریخ بھی بیان کی ہے کہ نسل پرستی کی بنیادی وجوہات کیا ہیں اور اس کا آغاز کہاں سے ہوا۔ اس سلسلے میں انہوں نے عیسائیوں کے مذہبی افکار کا مطالعہ پیش کیا ہے جو بعد میں نسل پرستی کی بنیاد بن گیا:

''(مگر) جیسا کہ انجیل کے مطابق انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ان کے والدین ایک ہی ہیں، دیوؤں اور وحشیوں کا تعین کرنا مشکل تھا۔ ایک ردعمل اس کا یہ تھا کہ ان صفات کو ان کے ساتھ وابستہ کیا جائے جن پر خدا قہر اترا تھا اور اس طرح انجیل کے سیاہ فامی صفت نوح کے نالائق بیٹے حام کی نسل (افریقی اور ایشیائی) سے وابستہ کر کے اور شیطانی طاقتوں کے ساتھ وابستہ کیا۔'' (ص، ۹۹)

اس طرح نسلی منافرت سے وابستہ خصوصیات جیسے سستی، جارحیت، لالچ، تشدد، درندگی کو وغیرہ فرانسیسیوں، اسپینیوں، پرتگالیوں، برطانوی طاقتوں نے ایشیائی اور افریقی قوموں سے وابستگی کی ہیں۔ مصنفہ نے اپنے دعوے کے ثبوت میں سفری دستاویزات کو پیش کیا ہے جن میں Principal Navigations اور Hakluytus Posthumus قابل ذکر ہیں۔ مصنفہ نے فرانز فینن کے حوالے سے یورپ کی نسل پرستی پر روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح یورپی اقوام، مشرقی اقوام کے عوام کو نصف انسان کا درجہ دیتے ہیں اور دوسرے یہ کہ یہ نو آبادکاری ہی ہے جس نے نو آبادیاتی تشخص کو پورا بگاڑ دیا اور دنیا یا یورپ کے سامنے اس کی بالکل ایک نئی اور غیر حقیقی تعبیر پیش کی جس میں یورپی اقوام کے اپنے مفادات چھپے   نو آبادیت نے جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے زمینی حقائق، سماجی اور انسانی رشتوں اور تشخص کو بدل کے رکھ دیا ہے۔ مصنفہ نے کتاب کے تیسرے باب میں ان ہی جیسے سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ مصنفہ کے

مطابق نوآبادیت نے ذہنی سطح پر بھی اپنی نوآبادیوں کو متاثر کیا اور ان میں احساس کمتری پیدا کیا۔ ان کا ماننا ہے کہ قومیت کا نظریہ نوآبادیت کا مقابلہ کرنے میں بہت کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔ اس دوران میں انہوں نے مختلف مفکرین اور دانشوروں کے خیالات کی روشنی میں قومیت (Nationalism) کی تشریح کی ہے۔ فرانز فینن کے حوالے سے لومبا نے لکھا ہے کہ وہ نیگرو تحریک اور اس سے وابستہ ادب کے نکتہ چین تھے کہ یہ تشدد آمیز، بلند آہنگ اور چمکیلا ہے جس سے قابض قوتوں کو اور شہہ ملتی تھی، کیوں کہ اس کی زبان اسی مقبوضہ سماج سے لی جاتی تھی حالانکہ یہ لکھنے والے مقامی اور نوآباد سماج کے کٹر مخالف تھے۔ اس کے برعکس وہ قومی ادب کی تخلیق پر زیادہ زور دیتا ہے، ایسے مزاحمتی ادب پر جس کو عوام آسانی سے سمجھے اور جس میں قومی شعور ہو اور جو قومی آزادی کے لیے وقف ہو۔

اس کے بعد لومبا قوموں کی تحریک آزادی میں عورتوں کے رول کی اہمیت کو اجاگر کرتی نہیں اور تانیثیت کو قومیت اور مابعد نوآبادیات کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مصنفہ کا ماننا ہے کہ قومی تحریکوں میں عورتوں کے رول کو جس طرح سراہنا چاہیے تھا، اُس طرح سراہا نہیں گیا۔ لیکن وہیں وہ یہ بھی مانتی ہیں کہ مابعد نوبادیاتی ملکوں میں عورتوں کو روز بروز زیادہ حقوق مل رہے ہیں، شائد اس وجہ سے کہ انہوں نے قومی تحریک میں اہم رول ادا کیا تھا۔

مصنفہ کے مطابق 11 ستمبر 2011 کے حادثے کے بعد اور دہشت گردی مخالف جنگ اور عراق اور افغانستان پر امریکی حملوں کے بعد آج مابعد نوآبادیاتی نظریات اور علوم پر پہلے سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے کیوں کی آج دنیا کے سامنے سب سے بڑا خطرہ امریکی سامراجیت کا ہے۔ ایسے میں مابعد نوآبادیت اور استعماریت مخالف علوم کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ امریکی سامراج کا اثر آج ہر ملک کی ثقافت، تہذیب، قومی تشخص پر بڑھتا جارہا ہے۔ اس تناظر میں مصنفہ نے مائکل ہارڈت اور آنٹونیو نیگری کے نظریہ کو بنیاد بنا کر لکھا ہے کہ پرانی سامراجی طاقتوں میں آپس میں دوسرے ممالک پر قبضے کرنے

کے لیے مخاصمت رہتی تھی لیکن آج امریکہ کو کسی کی مخالفت یا مخاصمت کی فکر نہیں اور آج کی امریکی سلطنت، رومی سلطنت سے ملتی جلتی ہے جس نے براہ راست نہیں بلکہ بلا واسطہ طور پر پوری دنیا پر اپنا کنٹرول کر رکھا ہے۔ یہاں مصنفہ اقوامِ متحدہ کے امریکی جارحیت میں رول پر بحث نہیں کی ہے جو ہمیشہ دوسرے غریب ملکوں پر امریکی حملوں کو روکنے میں ناکام رہی ہے اور دنیا میں آج اس انجمن کی وقعت امریکہ کا ساتھی ہونے سے کچھ زیادہ نہیں۔

آنیا لومبا کی اس کتاب کی اہمیت اس وجہ سے بہت زیادہ ہے کہ انہوں نے دنیا کے تقریباً تمام مابعد جدید اور مابعد نوآبادیاتی مفکروں کے نظریات کی روشنی میں اپنی آراء قائم کی ہیں اور پھر نتائج اخذ کیے ہیں۔ مصنفہ کی متعدد آراء سے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن اس سے کتاب کی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ کتاب کی زبان سادہ و سہل ہے جس سے مصنفہ کا خیال آئینے کی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ نوآبادیت اور مابعد نوآبادیت کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

............●●●............

(3)

نام کتاب: کلوننگ۔۔۔ایک تعارف

مصنف: پروفیسر ڈاکٹر عبدالروف شکوری

مبصر: محمد ثاقب

کلوننگ (CLONING) سے مراد بنیادی طور پر تو ایک ایسا عمل ہے جس میں کسی بھی جاندار کی تولید یا بالفاظ دیگر نو پیداوار (Reproduction) کرنے کے لیے غیر جنسی (asexual) تولید کا سہارا لیا جاتا ہے۔ غیر جنسی تولید یا نو پیداوار ایسی تولید کو کہا جاتا ہے۔ کہ جس میں جنسی نو پیداوار (sexual reproduction) کی مانند، دو والدین (یا نر اور مادہ) کے تولیدی خلیات کا ملاپ واقع نہیں ہوتا بلکہ والدین میں سے صرف کسی ایک (والد یا والدہ، بصورت دو جنسی جاندار) کے خلیات (یا وارثی مادے سے) نیا جاندار پیدا ہو جاتا ہے۔

کلوننگ ایک نیا سائنسی تصور ہے اس ٹکنالوجی کے بہت سے استعمالات سامنے آرہے ہیں۔ پاکستان کے معروف سائنس دان پروفیسر ڈاکٹر عبدالرووف شکوری نے سائنس کے اس اہم موضوع پر اردو میں کتاب بعنوان ''کلوننگ۔۔ایک تعارف'' تیار کی ہے۔ اس کتاب میں کلوننگ کی تعریف اور اس کے پس منظر سے لے کر جدید ترین تحقیقات تک ہر موضوع اور تفصیل کو بہت خوبصورتی سے سمیٹا اور اجاگر کیا ہے۔ کلوننگ کے موضوع پر اردو میں غالباً شایع ہونے والی یہ پہلی کتاب ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے کلوننگ کا تعارف نہایت ہی جامع اور مدلل انداز

میں پیش کیا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ مکمل مماثل (Identical) حیاتیاتی وارثت کے حامل خلیوں یا جانداروں کے گروہ کو کلون کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لفظ کلون یونانی لفظ Klon سے مشتق ہے جس کے لفظی معنی ''ٹہنی'' کے ہیں۔ اس کا مفہوم اجاتی تولید یا Vegetative reproduction بھی لیا جاتا ہے۔ این۔ بی اے سی (National Bioethics Advisory Commission) نے کلون کو نہ صرف سالمات خلیوں اور بافتوں بلکہ تمام جاندار کا ایک دوسرے کے مماثل بنانا قرار دیا ہے۔ امریکن Heritage ڈکشنری نے اس کی تعریف چار حصوں میں مکمل کی ہے۔ (a) کلون ایک مشترکہ جد سے پیدا ہونے والے جینیاتی ہم شکل خلیوں کا گروپ ہے۔ جیسے کہ بیکٹیریا کی کالونی جو ایک خلیے سے دوہری تشقیق کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے (b) واحد جد سے اجاتی تولیدی کے نتیجے میں پیدا ہونے والا عضویہ جیسے budding کی وجہ سے Polyp کا پیدا ہونا (c) DNA ترتیب کا ہم شکل (Replica) جین جو جینی انجینر نگ کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ (d) اور یہ جنین فعلی وظاہری اعتبار سے یکساں نظر آتے ہیں۔ AMA (American Medical Association) کے مطابق کلوننگ کا مطلب جسم کے خلیے کے مرکزے کی منتقلی کے ذریعہ جینی طور پر مماثل جاندار کا پیدا کرنا ہے۔ بعض سائنس دانوں نے اس میں اس قدر اضافہ کیا ہے کہ ''نہ صرف جاندار بلکہ جاندار کی صرف بافت یا کسی عضو کا پیدا کرنا بھی کلوننگ ہے''۔

کلوننگ کی مختلف اقسام میں سالمیاتی کلوننگ، خلوی کلوننگ، جنین کی کلوننگ Embryoni cloning، جسمانی خلیے سے مرکزے کی منتقلی (Nuclear Somatic Cell Transfer) وغیرہ قابل ذکر ہے۔ کلوننگ کے ان اقسام کے تحت خلیوں، سالمات، جنینز وغیرہ کی کلوننگ کی جاتی ہے۔ اب تک سائنس دانوں نے اس حوالے سے کئی کامیاب تجربے کئے ہیں۔

متذکرہ کتاب کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نباتی کلوننگ (اجاتی تولید) کا طریقہ

دنیا میں زمانہ قدیم سے موجود ہے۔ لیکن جانوروں میں پہلا تجربہ 1952 میں برگسس اور کینگ نے مینڈکوں پر کیا اور ٹیڈپول کے خلیے سے مینڈک بنائے۔ اگر چہ اس کے بعد سائنس دانوں نے مینڈکوں، خنزیر، خرگوشوں، چوہوں وغیرہ پر کلوننگ کے بہت سارے کامیاب تجربے بھی کیے لیکن ۱۹۹۶ میں سائنس دانوں کو اس وقت بڑی کامیابی حاصل ہوئی جب سائنس دانوں کے ایک گروہ نے روزلن انسٹیوٹ کے سربراہ ای۔آن وِلمٹ (Ian Wilmut) نامی سکاٹش سائنس دان کی سربراہی میں بھیڑ کو کلون کرنے کے لیے یہ تکنیک کامیابی سے استعمال کی۔ اس طرح پہلی دفعہ کسی میمل کو کلون کیا گیا۔ 8 دسمبر 1998ء کو جاپان میں ایک ہی گائے کے خلیوں سے جملہ آٹھ گائے بنائے گئے۔ اسی طرح ۱۹۹۹ میں سکاٹ لینڈ میں ہی سائنس دانوں نے بھیڑ کے پستانوں کے خلیوں میں مرکزہ نکال کر اسی سے اس کی ہم شکل بھیڑ پیدا کی، جس کا نام ڈولی رکھا گیا۔ امریکی سائنس دانوں نے بھی ڈان وولف کی سربراہی میں بندروں کے جنین کے خلیوں میں سے مرکزہ نکال کر بندریا کے بیضوں میں منتقل کیا اور اس کے نتیجے میں دو ہم شکل (کلون) بندر پیدا ہوئے۔ 14 دسمبر 1998 کو کوریا میں Bo) (SeungKim اور (Yeon-Be-Lee) نے ایک عورت کے بیضہ سے مرکزہ نکال کر دوسری 30 سالہ خاتون کے جسم کے خلیے میں اس بیضے کی کامیاب منتقلی انجام دی۔ یہ انسانی کلون کی تاریخ کا پہلا کامیاب تجربہ تھا۔ علاوہ ازیں ۲۰۰۲ کو بہ ذریعہ آپریشن انسانی کلون 'ایو' (EVE) نامی لڑکی پیدا ہوئی جس کا وزن سات پاونڈ تھا جو ایک ۳۱ سالہ بے اولاد امریکی عورت کا کلون تھا۔ مزید برآں ۲۰۰۲ میں ہی دودھ دینے والے حیوانات کی آٹھ اقسام کا کلون کیا جا چکا ہے جن کی تعداد ۲ سے ۵ ہزار کے درمیان ہے۔

مصنف کا خیال ہے کہ کلوننگ کا استعمال جانوروں کے علاوہ طب، زراعت اور دیگر صنعتوں میں متعدد مقامات پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جانوروں کی کلوننگ کے کامیاب تجربات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو بھی کلون کیا جا سکے گا۔ اس تکنیک کے کئی مزید اطلاقی پہلو بھی کلوننگ کے محققین کے زیرِ غور ہیں جیسے بے اولاد افراد جو کسی بچے کو

متبنٰی بھی نہ بنانا چاہتے ہوں ،کلوننگ کی تکنیک کے ذریعہ سے ایسے بچوں کے والدین بن سکتے ہیں جو حیاتیاتی طور پران ہی سے ماخوذ ہوں۔اسی طرح تیزی سے بڑھنے والے اور فربہ جانوروں کی وسیع پیمانے پر پیدائش اور قریب المعدوم (Endangered) انواع کی آبادی میں تسلسل بھی لایا جاسکتا ہے۔کلوننگ کو بعض بیماریوں سے مبرا بچوں کو پیدا کرنے لیے بھی بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔مثلاً آنکھوں ، دماغ اور عضلات ایسے اعضاء وغیرہ کے متعدد پیدائشی امراض بعض ایسی خراب جینز کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہیں جو سائٹو پلازم میں پایے جانے والے عضویے مائیٹو کانڈریا میں موجود ہوتی ہیں۔ان امراض کا قلع قمع کرنے لیے کلوننگ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے سائنسی اصطلاحات کے لئے اُردو کے بہترین اور برمحل متبادل لفظیات کا استعمال کیا جس سے نہ صرف متن کی روانی برقرار رہتی نظر آتی ہے بلکہ اس ہیں سائنسی اصطلاحات (Terminology) کی خوبصورت پیرائے میں معنی کی ترسیل بھی ممکن بنائی ہے جو کہ ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔کچھ سائنسی اصطلاحات کے متبادل مصنف موصوف کے خود تخلیق کردہ اُردو متبادل معلوم ہوتے ہیں ۔مثلاً علم الخلیات (Cytology) ،علم الاعضاء (Histology) ،علم الا جنتہ (Embryology) نطفہ ءامشاج (Zygote) ،قناۃ المبیض (Tube fallopian) ،بیض جدار رحم (Endometitrium) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔زیر تبصرہ کتاب کے متن کے اسلوب کو مزید دلآویز اور جاذب نظر بنانے کے لئے مصنف نے سائنس کے روزمرہ الفاظ کے لیے مناسب وموزون مستعمل اُردو الفاظ کا انتخاب کیا ہے جو کہ اپنے آپ میں ایک مستحسن کوشش ہے۔جس کی کچھ مثالیں اس طرح سے ہیں ،مثلاً مرکزہ (Nucleus) ،قریب المعدوم (Endangered) ،خلیہ (Cell) ،بارآوردہ (Fertilized) ،جنینی انقطاع (Embryosplitting) ،جینیاتی ملغوب (Transgenic) ،کُل افزاء (Totipotent) ،باآور بیضہ (Ovum

(Un-Fertilized)، غیر بار آوردہ شدہ (Tissues)، بافت (Fertized)، منوی خلیۓ (Cell Sperm)، تولیدی خلیات (Cells Sperm) بالغ فقاریہ (Adult Vertebrates)، جسمانی خلیہ (Cell Somatic)، اجاتی تولید (Reproduction Vegetative)، حالت استقرار (PhaseInter)، سالمہ (Molecule)۔ اوراس کے علاوہ اس کتاب میں نہایت ہی سلیس اور رواں زبان استعمال کی گئی ہے جو اردو قارئین کے لیے دلچسپی کا موجب ہے۔ اگرچہ مصنف اردو زبان کا کوئی باقاعدہ سند یافتہ نہیں تاہم وفور شوق کے جذبے کے تحت یہ خوبصورت کارنامہ انجام دیا اور مصنف موصوف سائنس وٹکنالوجی کے شعبے سے وابستہ ہے اور ان کا شمار پاکستان کے معروف سائنس دانوں میں کیا جاتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں مصنف موصوف نے جہاں کلوننگ کی تعریف، پس منظر اور جدید تحقیق میں اس کے استعمالات پر نہایت ہی جامع انداز میں حقائق کو استدلال کے ساتھ منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے وہیں اُنھوں نے کلوننگ کے فوائد اور مضر اثرات کی نشاندہی بھی کی ہے ساتھ ہی کلوننگ کے اخلاقی اور غیر اخلاقی پہلوؤں کی طرف واضح اشارے بھی کئے ہیں۔

من جملہ زیر تبصرہ کتاب کلوننگ کی تاریخ اور اس کے استعمالات کو سمجھنے میں بہت حد تک صحیح رہنمائی کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔ علاوہ بریں کلوننگ جیسے اہم اور تازہ دم در پیش مسئلے کو سمجھنے میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر یہ کتاب ایک مستند تاریخی دستاویز کی حامل ہے جس کے لیے مصنف پاکستان کے مشہور سائنس دان پروفیسر ڈاکٹر عبدالروف شکوری کی یہ کاوش قابل ستائش ہے اور اردو زبان کے فروغ و بقا کے لیے ایک سود مند کوشش ہے۔

...........●●● ....

Sheeraza
Urdu

ISSN: 22779833

Gosha - e - Noor Shah

Volume: 61 Number: 4-6

Printed at Government Press, Srinagar

Jammu and Kashmir
Academy of Art, Culture and Languages